مولانا مودودیؒ کے انٹرویو

مرتب :- ابو طارق ایم ۔ اے

مرکزی مکتبہ اسلامی ، دہلی

مولانا مودودیؒ

کے

انٹرویو

مُرتّب

ابوطارق ایم۔ اے

مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۶

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ۔ ۱۱۰۶

نام کتاب: مولانا مودودیؒ کے انٹرویو
مرتب: ابوطارق ایم۔اے
صفحات: ۳۳۵
ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳ چتلی قبر، دہلی ۶
اشاعت:
طبع اوّل: اکتوبر ۱۹۹۴ء ۱۰۰۰

قیمت: ۵۲ روپے

ISBN 81-7292-092-X

مطبوعہ
دعوت آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۶

ترتیب

انتساب

اُن شاہین صفت نوجوانوں کے نام جو مفکرِ اسلام اور قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و بصیرت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور جن کا وجود یقیں محکم، عمل پیہم، بے باکی اور امانت و دیانت کی صفات کی بدولت ملّتِ اسلامیہ کے روشن مستقبل کا ضامن بن چکا ہے۔

(مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

جس صدی سے ہمارا اور آپ کا تعلق ہے اس میں اسلام کے فکری اور نظریاتی محاذ پر جن ہستیوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اُن میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہما اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔ شاعرِ مشرق نے اپنی شعلہ نوائی سے ہندی مسلمانوں کے دلوں میں آتشِ عشق فروزاں کی، انھیں خودشناسی کا سبق دے کر خوابِ غفلت سے جگایا اور انھیں ایک عظیم نصب العین کا شعور دے کر آمادۂ عمل کیا۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور اُن کی بہت سی آرزوئیں پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری دَور میں حیدرآباد دکن کے اُفق سے اُمید کی ایک کرن پھوٹی جو بڑھتے بڑھتے سیلِ نُور میں تبدیل ہو گئی ـــــ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ذات تھی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ برِصغیر ہند و پاک میں کبھی تاج (جبلپور)، مسلم (دہلی)، الجمعیۃ (دہلی) اور ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے مدیر باتمکین کی حیثیت سے معروف تھے لیکن آج وہ ان مرحلوں سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ وہ مشرق و مغرب میں ایک عظیم مدبّر، دُوراندیش اور بیدار مغز سیاست دان، بلند پایہ صاحبِ اسلوب ادیب، عدیم المثال خطیب، مفکرِ اسلام اور قائدِ تحریکِ اسلامی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

مولانا مودودیؒ کے فکر کی نکہتیں جن کا ظہور اُن کی تحریر و تقریر کے گلہائے رنگارنگ میں ہوتا ہے، دنیا بھر کے طالبانِ حق کے مشامِ جاں کو معطّر کر رہی ہیں۔ مشرق و مغرب کی اسلامی تحریکیں ان کے تدبّر اور بصیرت کی روشنی میں مسلسل آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ سینۂ ارض پر زندگی کے اس ہنگامہ خیز میدان میں حق و باطل کی جو جاں گسل

کش مکش جاری ہے اس میں عساکرِ حق و صداقت کا عَلَم مولانا مودودیؒ ایسے مردِ جری کے امین و قوی ہاتھوں میں لہرا رہا ہے۔ ان کے نظریات کی سبک رفتار رَو، شفاف، خنک اور شیریں پانی کی ندی کی طرح ترکستان کے مرغزاروں، افریقہ کے صحراؤں، عرب کے ریگ زاروں، بحرِ ہند کے جزیروں، ہندوپاک کے میدانوں اور یورپ کے صنعت زاروں کو سیراب و شاداب کرتی چلی جاتی ہے۔

مولانا مودودی کی تراوشِ فکر نے زندگی کے تمام شعبوں، سیاست، معاشرت، معاش اور تعلیم وغیرہ کو انقلاب آشنا کیا، ان کے قلم کی سیاہی نے بصیرت کے ایسے چراغ روشن کیے ہیں جن کی روشنی میں ادب، تاریخ، فلسفہ، منطق، سائنس وغیرہ علوم و فنون کا کارواں نئی راہوں پر گامزن اور نئی منزلوں سے آشنا ہو رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے دنیا کے سُرخ و سفید اور مشرقی و مغربی سامراجوں کی سازشوں کا مقابلہ کرنے ـــ روس اور امریکہ کی استحصالی قوتوں سے نبرد آزما ہونے ـــ تہذیبِ جدید کی تباہ کاریوں کا سدِّباب کرنے ـــ اور دینِ اسلام کو ادیانِ عالم پر غالب کرنے کے لیے عالمِ اسلامی کی تعمیری اور مثبت قوتوں کو منظّم کر کے انھیں دانشِ قرآنی اور حکمتِ نبویؐ کے ہتھیاروں سے مسلح کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتوں، سیاسی تحریکوں، فکری گروہوں، اصلاحی اور سماجی تنظیموں کے لیے اس عصر آفریں اور عہد ساز شخصیت کی سوچ کے دھاروں کا رُخ معلوم کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تصانیف ملک میں اور ملک سے باہر، اُردو زبان اور دوسری تمام بڑی بڑی زبانوں میں معجزانہ سُرعت کے ساتھ پھیل رہی اور اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اس عالم میں اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے کہ مولانا کی مفصل اور مبسوط تصانیف کے علاوہ ان کے ملفوظات، مذاکرات، مکالمات اور افادات وغیرہ کو بھی افادۂ عام کے لیے زیورِ ترتیب و طباعت سے آراستہ کیا جائے جو مختلف اخباروں، رسالوں، ریڈیو یا ٹیلی ویژن کمپنیوں نے

وقتاً فوقتاً متنوع موضوعات پر مولانا کے سحر طراز قلم اور سحر آفریں زباں سے محفوظ، شائع اور نشر کیے۔ لیکن منتشر ہونے کی وجہ سے ان سے مکمل فائدہ اُٹھانا دشوار تھا۔ اسی مقصد کے تحت راقم الحروف نے تلاش بسیار اور محنتِ شاقہ کے بعد مولانا موصوف کے تقریباً سڑسٹھ (۶۷) انٹرویو جمع اور مرتب کیے جو "مولانا مودودیؒ کے انٹرویو" کے نام سے آپ کے پیشِ نظر ہیں۔

مجموعی طور پر ان تحریروں کے ذریعے مولانا موصوف کی فکری ہمہ گیری، شخصی ارتقار، ذاتی کردار، ہمعصر سیاسی حالات، اہم تاریخی واقعات، ملّی رجحانات، متضاد و متصادم عالمی نظریات اور عالمِ اسلام کے مخصوص احوال و مسائل پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ ان تحریروں میں سے بعض ایسی بھی ہیں۔ جو بجنسہٖ مولانا کے قلم یا/زبان سے نکلی اور شائع ہوئی ہیں۔ ان کی مدد سے ان کے اسلوبِ بیان کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔ مولانا کے انٹرویوز کا مطالعہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ ایسی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت کے فکری ارتقار کا جائزہ لیے بغیر عالمِ اسلام کے موجودہ رجحانات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ کام کرتے ہوئے میں نے یہ خیال رکھا ہے کہ انٹرویوز تاریخ اور سَن کی ترتیب سے دیے جائیں اور ہر انٹرویو سے پہلے اس کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔ اس سلسلے میں عہدِ حاضر کے ایک بلند پایہ ماہرِ تعلیم، محقق اور نقادِ ادب جناب ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ایم اے، پی ایچ ڈی کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں جو حُسن ہے وہ اُن ہی کے فیضانِ نظر کا کرشمہ ہے۔ اور جو خامی ہے وہ میری لغزشِ قلم یا کوتاہیِ علم و فہم کے سبب سے ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب میری حوصلہ افزائی، سرپرستی اور رہنمائی نہ فرماتے تو یہ کام انجام دینا میرے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا۔

میں اُن اخبارات و رسائل کا تہہِ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے میری اس کوشش کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور مجھے اپنے ہاں چھپنے والے انٹرویوز کی شمولیت

کی بخوشی اجازت دے دی۔ میں ان کا بھی شکرگزار ہوں جن تک میری درخواست کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکی۔کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ اگر انھیں اس کا علم ہوتا تو وہ بھی کمال وسعتِ ظرفی سے مطلوبہ اجازت عطا فرما دیتے ۔ علاوہ ازیں ان تمام بزرگوں اور دوستوں خصوصاً جناب اختر راہی ایم اے، جناب پروفیسر چوہدری محمد ابراہیم ایم اے، جناب ڈاکٹر شاہین غوری، جناب ابوالوفا حجازی، جناب جاوید اقبال صاحب (آزاد امپورٹس، راولپنڈی) وغیرہم کی عنایات کا بھی تہہِ دل سے معترف ہوں جنھوں نے انٹرویوز جمع کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔

آخر میں، مَیں قارئینِ کتاب سے گزارش کروں گا کہ وہ براہِ کرم ترتیب و تدوین کی خامی سے مطلع فرمائیں اور مشمولہ انٹرویوز کے علاوہ کسی اور انٹرویو کا علم رکھنے پر اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اِس کا نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے بہرحال بہتر صورت میں ہو۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۳ء

ابوطارق جالندھری
ایم، اے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میری محسن کتاب

تقسیم برصغیر ہند و پاک سے پیشتر رسالہ " الندوہ " نے ایک سلسلۂ مضامین " میری محسن کتابیں " کے عنوان سے شروع کیا تھا۔ اس عنوان کے تحت مشاہیر برصغیر نے اپنے رشحاتِ فکر پیش کیے۔ ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کی تحریر بھی شامل ہے۔ مئی ۱۹۴۶ء میں مولانا محمد عمران ندوی نے ان تحریروں کو " مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں " (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ) کے نام سے شائع کیا تو اس میں مولانا موصوف کی تحریر کو بھی شامل کر لیا جو رسالہ بند ہو جانے کے باعث چھپ نہ سکا تھا۔ اس کا عنوان " میری محسن کتاب " تھا۔ کیوں کہ مولانا نے اپنی مختصر سی تحریر میں صرف ایک کتاب کو اپنی محسن کتاب قرار دیا جب کہ دیگر لکھنے والوں نے عام طور پر متعدد کتابوں کو اپنی محسن کتابوں کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

جاہلیت کے زمانے میں مَیں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اُتار چکا ہوں۔ مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے

مفکّرین اب مجھے بچّے نظر آتے ہیں ۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کو سُلجھانے میں اُلجھے رہے ۔ اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے، اُن کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے ۔ میری اصلی محسن بس یہی کتاب ہے ۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے ۔ حیوان سے انسان بنا دیا ۔ تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی ۔ ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر پردہ نہیں ہے ۔ انگریزی میں اس کُنجی کو شاہ کلید (MASTER KEY) کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھُل جائے سو میرے لیے یہ قرآن " شاہ کلید " ہے ۔ مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں کھُل جاتا ہے ۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اُس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے ۔

مذہبی ریاست

یہ ایک مباحثہ ہے جو مئی ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا تھا۔ بعد میں یہ ہفت روزہ 'ایشیا' لاہور مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۰ء اور دیگر رسائل میں شائع ہوا۔ اس مباحثے میں سائل کی حیثیت سے جناب وجیہہ الدین بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ۔

س : اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غالباً یہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصوّر ہے؟

م : ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا لفظ بولے تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مُراد ہوگا۔ میں جب کہتا ہوں کہ اس ملک کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدّن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے اُن اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں۔

طبقاتی تعصبات سے پاک معاشرہ

س : آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست کا سیاسی اقتدار ماہرین دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں

ہوگا۔اس طبقے کا کام یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قانون وضع کرے اور شرعی احکام کی بنا پر ہر سیاسی گتھی کو سلجھائے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس طبقے کے پُشت پناہ کون لوگ ہوں گے؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہمارا سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لائے۔ ماہرینِ دینیات اس طبقاتی کش مکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں یا اپنے آپ کو سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے سے وابستہ کردیں۔اِس صورت میں قرآنی اُصولوں کی جو بھی تفسیر پیش کی جائے گی وہ اُن کے سیاسی رُجحان کی آئینہ دار ہوگی۔مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسّروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائے گا۔ اقتصادی کش مکش ایک لامتناہی فقیہانہ بحث کی صورت اختیار کرلے گی اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جوں کے توں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

م : جس طبقاتی کش مکش کی طرف آپ اشارہ فرمارہے ہیں وہ دراصل پیدا ہی اِس لیے ہوتی ہے کہ مدّتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اِس رُوح سے اور انصاف کے ان اُصولوں سے محروم ہوگیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیے تھے۔جس مادہ پرستی نے دُنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور اُن کے درمیان اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا وہی بد قسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو پھاڑنے اور باہم ٹکراتے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کش مکش کے ہولناک نتائج بھگت چکے ہیں اور اس سے

لگے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہیں ہیں، اب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو ان اجتماعی فلسفوں کے حوالے کر دیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ۔ طبقاتی جنگ برپا کر دیں۔ اور ہمیں اُس وقت تک امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیا میٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اُصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خود غرضیوں کی نشوونما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظامِ حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے ان لوگوں کو اُبھاریں جو اسلام کی رُوح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی پشت پناہی ساری قوم کو بحیثیت مجموعی کرنی چاہیے نہ کہ کسی ایسے طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں ان کے انتخاب میں صرف اس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ بھروسے کے قابل سیرت رکھتے ہوں اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

اِسلامی ریاست کی تشکیل کون لوگ کر سکتے ہیں؟

س: میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں صرف ایمان داری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار

کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کے لیے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گتھیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالے کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کے لیے فقیہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجزیے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں دینیات کے ماہروں کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

م: آپ جب "دینیات" کا لفظ بولتے ہیں تو شاید "دینیات" کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو بجا طور پر اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ان "ماہرینِ دینیات" کے حوالے کر دیا جو دینیات سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن، اپنی سیاست اور اپنی معاشرت کے مسائل ان ماہرینِ دنیویات کے حوالے کیے جو مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مَس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے؟ آپ کہتے ہیں یہ لوگ ماہرینِ دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قوتیں پہنچ چکی ہیں۔ یعنی گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشاکش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہو گا کہ ہم اپنی قوم میں ان لوگوں کو تلاش کریں جو دین و دنیا دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ جن کی

نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات کے مسائل پر یکساں ہو اور وہ سر جوڑ کر ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری قومی زندگی کو ساری دُنیا کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بنا دے۔

کیا فروعی اختلافات اسلامی ریاست کے قیام میں رُکاوٹ ہیں؟

س : شریعت کے مفسّرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتاً مذہبی اختلافات ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقبل کے سیاسی اور سماجی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

م : اِن اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے۔ اور انھیں بھی ہم اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق مختلف خطرے نہ پائے جاتے ہوں، لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رُکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اس نقطۂ نظر کے مطابق چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو اور قلیل التعداد گروہوں کے نقطۂ نظر کی زیادہ سے زیادہ اتنی رعایت کی جائے جس کی اُصول میں گنجائش ہو اور اقلیت کی حیثیت سے ان کے حقوق کا منصفانہ تحفظ کر دیا جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہمارے ملک کی ریاست اسلام کے ان وسیع ترین اُصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو ان وسیع ترین اُصولوں میں بھی اکثریت

کے ساتھ متفق نہ ہوں، اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ ورنہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لیے اتفاق کرلیں کہ اسلام پر ہم متفق نہ ہو سکے۔

اِسلامی ریاست میں اقلیتوں کا مسئلہ

س : مسلمانوں کے اندرونی اختلاف کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔ آپ کس طرح ان کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کرلیں اور اس کے وفادار رہیں؟

م : اِس گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقے پر ایک ملک کا نظام انھیں اُصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اس کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا جائے اور یہ کہ اس کے حقوقِ شہریت اور اس کے پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن از روئے انصاف وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔ اِس ملک کی اکثریت ایمان داری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اِسلام کے اُصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے، اس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ملک کا نظام اِس رائے کے مُطابق بنے۔ اقلیت اس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے مگر یہ کہنے کا اسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اُصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔

رہا وفاداری کا سوال تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے بلکہ وہ انصاف، شرافت اور فیّاضی پر مبنی ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جائے۔ آپ اقلیت کو محض اس ریاکاری سے مطمئن نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب

تک کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی ۔ اقلیت تو یہی دیکھے گی کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں ؟ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر ؟ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے یا بے زار بن کر ۔

اسلامی ریاست کا قیام اکثریت کی خواہش ہے

س : میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج ، اخلاق ، عادات وخصائل اور اعتقادات و توہّمات کا پرتو ہوتا ہے ۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی ۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیّل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس اندازِ فکر اور فلسفۂ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا ۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ باشندگانِ ملک میں صحیح اسلامی جذبہ پیدا کریں اور انھیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں ۔ جب یہ اقدار مضبُوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے ، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کرلے گا ۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے ، جب تک ہماری رُوحانی ، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں ۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی دُور ہے جب ہم مکمل طور پر اِسلامی تصورات کو قبول کرلیں گے ، اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں قبل از وقت ہیں ۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں

ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

م: آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پَرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر یہاں کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُرزور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے رستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو۔ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل دُرست ہے کہ اگر ہم اپنے ملک کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں باشندگانِ ملک میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، مگر میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کوشش میں حصّہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مُستثنیٰ کرنا چاہتے ہیں؟ ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلّط تھا، اِس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی مِلّت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے بلکہ درحقیقت اُس وقت ریاست کا پُورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچے لیے جا رہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالات میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست (۱۹۴۷ء) کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصّہ لے گی جو ایک معمار کا حصّہ ہوتا ہے یا وہ طرزِ عمل اختیار کرے گی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے۔ یا اب بھی وہی پچھلی صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چوں کہ ملک کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ

ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہوگئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کرکے ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اُسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔

مَیں لیڈر کیوں بنا؟

مشہور صحافی جناب علی سفیان آفاقی نے ایک انٹرویو مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے لیا جو ہفت روزہ "اقدام" لاہور، اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اُنھوں نے اسے اپنی کتاب ابوالاعلیٰ مودودیؒ میں شامل کرلیا۔ یہ کتاب مئی ۱۹۵۵ء میں چھپی تھی بعد میں غالباً نایاب ہوگئی۔ اُسی میں سے یہ انٹرویو لیا گیا ہے۔

جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر کا ماحول بہت پُرسکون، سنجیدہ اور باوقار ہے۔ چھوٹے سے خوب صورت لان کے اردگرد سرسبز روشیں ہیں اور صحن میں گلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ ذیل دار پارک اچھرہ کی ایک مختصر سی خوب صورت کوٹھی میں جماعت اسلامی پاکستان کا دفتر ہے۔ اسی میں ایک طرف نشرواشاعت کا شعبہ ہے اور اسی کوٹھی کے چند کمروں میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ رہا کرتے ہیں۔

چھوٹے سے برآمدے میں چند کُرسیاں سلیقے سے لگی ہوتی ہیں جن کے درمیان میں ایک میز پر اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ اس عمارت کے احاطے میں داخل ہونے سے پہلے ہی خود بخود کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے بورڈ لگا ہوا ہے کہ "یہاں بات کرنا منع ہے"۔ نشرواشاعت کے کمرے میں مجھے چند حضرات باتیں کرتے نظر آئے لیکن بہت آہستگی کے ساتھ۔ یہاں کی فضا کچھ مقدّس سی ہے۔

مولانا کے کمرے میں اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ الماریوں میں کتابیں آراستہ ہیں اور اُن کے بیچوں بیچ مولانا مودودی کی صاف ستھری میز ہے، جس پر لکھنے کے کاغذ اور قلم دوات سے لے کر پن لگانے کا ڈبہ تک نفاست کے ساتھ رکھا رہتا ہے۔ مولانا نے اپنے جانے پہچانے دل آویز تبسم کے ساتھ پذیرائی کی۔ میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اس کمرے کی آب و ہوا تمام پاکستان کی آب ہوا سے مختلف ہے۔ یہاں ہر موسم میں بڑی خوش گوار خنکی سی ہوتی ہے، اور ماحول علمی و ادبی سا محسوس ہوتا ہے۔ کمرے میں ٹنکچر آیوڈین قسم کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بُو مولانا کی پنڈلی کی چوٹ سے آرہی تھی۔ (کچھ دن قبل لاہور سے قصور جاتے ہوئے موٹر اُلٹ جانے کے باعث مولانا کی پنڈلی میں چوٹ آگئی تھی جو اِن دنوں قریب قریب ٹھیک ہو چلی تھی)۔

پیشہ ورانہ سیاست

میرے اِس سوال پر کہ آپ نے سیاست کیوں اختیار کی؟ مولانا مُسکرا کر بولے:
"کیا سیاست بھی کوئی پیشہ ہے جسے اختیار کیا جائے؟"

میں نے عرض کیا: "آج کل تو اِسے زیادہ تر اختیار ہی کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپ نے سیاسی زندگی کیوں اپنائی؟"

مولانا ایک تبسّم کے ساتھ بولے: "یہ تو پیشہ ورانہ سیاست ہے جسے لوگ ڈاکٹری، بیرسٹری یا اس قسم کے دوسرے پیشوں کی طرح اختیار کر لیتے ہیں۔ آج کل سیاست کی یہ قسم عام ہے۔ ابھی کچھ عرصے کی بات ہے کہ میں عرصۂ دراز کے بعد اپنے ایک عزیز کے پاس گیا۔ وہاں اُن سے میں نے دریافت کیا کہ آپ اپنے لڑکے کو کس طرف بھیج رہے ہیں؟ وہ سنجیدگی سے کہنے لگے: "ایل ایل بی تو کر ہی آیا ہے اور اُس نے پریکٹس بھی شروع کر دی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ اب اگر تم سیاست

میں بھی حصّہ لینا شروع کر دو تو تمہاری پریکٹس خاصی چل جائے گی اور نام بھی ہو جائے گا۔ اِس طرح بڑے لوگوں سے یاد اللہ بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل سیاست کو تو آج کل اُوپر چڑھنے کا زینہ اور شہرت کا ہتھکنڈا بنا لیا گیا ہے۔" مولانا نے آگے چل کر فرمایا: "میں نے سیاست اختیار نہیں کی۔ جو لوگ اپنا کوئی مقصدِ زندگی رکھتے ہیں وہ اجتماعی زندگی کے معاملات میں کچھُ اختیار کر کے دل چسپی نہیں لیا کرتے، بلکہ اُن کے مقصد کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے سے دل چسپی لیں جس کا اثر ان کے مقصد پر موافق یا مخالف پڑتا ہو۔"

مولانا نے فرمایا: "میں نے آج سے بیس بائیس برس پہلے اپنے مطالعہ اور غور و خوض کے نتیجے میں شعوری طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ شعوری طور پر اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص محض نسلی مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ جان بُوجھ کر صدقِ دل سے یہ سمجھے کہ یہی راستہ حق کا ہے اور اسی میں فلاح ہے۔ اِس طرح کے "قبولِ اسلام" کے بعد لامحالہ میری زندگی کا یہ مقصد بن گیا کہ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشش کروں اور پھر اس نشاۃ ثانیہ کے لیے جس جس پہلو میں بھی کام کرنے کی ضرورت پیش آتی گئی، میں اُس کی طرف عین اپنے مقصد کے تقاضے سے توجّہ کرتا چلا گیا —— اِس کام کے لیے ضرورت تھی کہ علمی حیثیت سے اسلام کی اصل حقیقت کو غلط فہمیوں کے انبار سے نکال کر اصل رنگ میں پیش کیا جائے اور ان تمام نظاموں پر علمی تنقید کی جائے۔ فکری اور عملی حیثیت سے دوسرے نظامِ فکر و عمل کا جو اثر ہے اُسے دُور کیا جائے۔ اس کے لیے یہ بھی ضرورت تھی کہ اسلام کو ازسرِ نو غالب کرنے میں جو جو طاقتیں مزاحم ہیں، اُن کی مزاحمت کو دُور کیا جائے۔ اس کے لیے یہ بھی ضرورت تھی کہ رائے عامّہ کو صحیح اسلامی نظام کے لیے تیار کیا جائے۔ اس طرح یہ مختلف ضرورتیں جیسے جیسے محسوس ہوتی گئیں مجھے آپ سے آپ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

بغیر اس کے کہ کسی روز بیٹھ کر میں ارادہ کرتا کہ مجھے فلاں چیز اختیار کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا: "لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں سیاست سے زیادہ اہم بھی بعض مسائل ہیں جن کی طرف اوّلین توجہ دی جانی چاہیے۔"

مولانا مجھے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے: "اس معنی میں کہ جس پہلو کو بھی ہم چھوڑ دیں گے فکر و عمل دونوں کا توازن بگڑ جائے گا۔ کیوں کہ اسلام انسان کی پوری زندگی سے بحث کرتا ہے اور عملاً اس کا قیام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہر شعبۂ زندگی کو پورے توازن کے ساتھ اس کے دائرۂ عمل میں لایا جائے، اس لیے ہم کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

میں نے پوچھا: "لیکن مولانا! زیادہ تر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ زندگی کے بعض شعبے سیاست کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں اور ان کی طرف توجہ دینا زیادہ ضروری ہے۔ مثال کے طور پر لوگوں کی اخلاقی اور مذہبی اور معاشرتی اصلاح سے اگر لوگوں کو سمجھ دار اور باعلم بنا دیا جائے تو اس کے بعد وہ مسائل کو زیادہ خوبی سے سمجھ سکتے ہیں۔ چناں چہ یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی نے پہلے سماجی اور مذہبی اصلاح کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔"

زندگی کے غلط نظریے

مولانا مسکرائے اور کہنے لگے: "مَیں اِس بحث کو فضول سمجھتا ہوں کہ زندگی کا فلاں پہلو زیادہ اہم ہے یا کم اہم ہے۔ اس قسم کی تقسیم وہی لوگ بیٹھ کر سوچا کرتے ہیں جو زندگی پر کوئی جامع نظر نہیں رکھتے۔"

میں نے عرض کیا: "لیکن اِس طرح عمل کیا جائے تو کاموں میں یک سوئی تو پیدا ہو سکتی ہے۔"

مولانا نے فرمایا: "یک سُوئی اس صورت میں مفید ہوسکتی ہے جب کہ مختلف پہلوؤں کو مختلف گروہ ایک ہی مقصد سامنے رکھ کر اپنے ہاتھ میں لیں، اور ان کے درمیان اشتراک اور تعاون کی کوئی صورت موجود ہو تاکہ توازن کے ساتھ کام کیا جاسکے۔ اس وقت یہ ممکن ہے کہ کوئی گروہ کسی ایک شعبے پر اپنی تمام قوتیں صرف کردے۔ لیکن یہاں صورت کچھ "انارکی" کی سی ہے۔ یعنی کوئی ایک مقصد موجود نہیں ہے۔ مختلف مقاصد ہیں اور مختلف نظریے، مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کرکے لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کررہے ہیں اور ناکام ہیں، کیوں کہ اس طرح سے نہ تو کبھی زندگی میں ہمواری پیدا ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔"

سیاست کا مفہوم

میں نے دریافت کیا: "آپ کی نظر میں سیاست کی تعریف کیا ہے اور اس کے متعلق آپ کس طرح سوچتے ہیں؟"

مولانا چند ثانیے سوچنے کے بعد بولے:

"سیاست سے مُراد؟ ویسے تو سمجھیے کہ حکومت اور طاقت سے ملک کا انتظام کرنے کا نام سیاست ہے، لیکن اس کا جو وسیع تر مفہوم ہے، اس کے اعتبار سے سیاست اجتماعی زندگی کا وہ شعبہ ہے جو سوسائٹی کو اقتدار کی طاقت سے اپنے راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کوئی شخص جو کسی مخصوص نظریۂ حیات پر ایمان رکھتا ہو اس سوال کو نظرانداز نہیں کرسکتا کہ جو سیاسی اقتدار سوسائٹی پر حاوی ہے آیا وہ اس کے نظریۂ زندگی کا حامی ہے یا اس کا مخالف؛ غیر جانب داری تو اِس معاملے میں ناممکن ہے اور اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ اس بنا پر ہم جو نظریۂ حیات رکھتے ہیں اس کے مطابق سیاست سے بے تعلق ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ اگر سیاسی اقتدار ہمارے نظریے کا حامی ہے تو ہم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹائیں تاکہ اُس کی مدد سے زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح وتکمیل ہوسکے اور اگر وہ ہمارے نظریۂ حیات کے مخالف ہے تو اس کو اپنی طرف مائل کرنے یا تبدیل کرا دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔"

اِسلامی قانون اور تعمیرِ نو

جون ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی کا اسلامی قانون نمبر شائع ہوا جو اپنی نوعیت کی واحد دستاویز تھی۔ جولائی، اگست ۱۹۵۸ء میں اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ اس میں "اسلامی قانون اور تعمیرِ نو" کے موضوع پر چند سوالات پر عالم اسلام کے مشاہیر اہلِ علم کے خیالات پیش کیے گئے ـــــ سوالات اور مولانا مودودی صاحب کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:-

اِسلام کا تصوّرِ قانون

سوال: اسلام کا تصوّرِ قانون کیا ہے؟

جواب: اسلام کا تصوّرِ قانون یہ ہے کہ قانون خُدا کی طرف سے انسان کے لیے ایک حکم اور رہنمائی ہے اور انسان کی پوری زندگی سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے اسلام کا تصوّرِ قانون مغربی تصوّرِ قانون کی بہ نسبت بہت زیادہ وسیع اور جامع نوعیت رکھتا ہے۔ دنیوی قوانین، قانونِ اسلام کے دائرہ کو صرف اس حد تک محدود رکھتے ہیں جہاں وہ ریاست کی قوتِ جابرہ کے ذریعے نافذ کی جا سکتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر عدالتوں اور پولیس کے ذریعے سے اس کا نفاذ ہو سکتا ہے۔ اس کے ماسوا وہ فکر و نظر کے لیے ہدایات کہیں سے لیتے ہیں، اخلاق کے اُصول

کہیں اور سے لیتے ہیں، معاشرت کے لیے ضوابط اور رسوم کہیں اور سے اخذ کرتے ہیں، انفرادی کردار کے لیے رہنمائی کہیں اور سے حاصل کرتے ہیں اور قانون کے محدود دائرے میں ہدایات کا سرچشمہ کسی اور جگہ تلاش کرتے ہیں، اس طرح ہنج رنگی زندگی بنتی ہے۔ جس میں دراصل کوئی وحدت پیدا کرنے والی طاقت ابھی تک فراہم کرنے میں خدا کی ہدایت سے بے نیاز انسان کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے برعکس اسلام میں فکر و نظر سے لے کر اصولِ اخلاق تک اور شخصی کردار سے لے کر معاشرتی قوانین تک اور خاندانی زندگی کے ضابطوں سے لے کر بین الاقوامی معاملات تک ہر چیز کے بارے میں رہنمائی ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہے اور وہ ساری رہنمائی بحیثیت مجموعی ایک قانون بنتی ہے۔ اس قانون کے کسی حصے کو حکومت اپنی عدالتوں اور اپنی انتظامی مشینری کے ذریعے نافذ کرتی ہے مگر اس کے تمام اجزاء قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور مسلمان جب تک مسلمان ہے اس کے کسی جزو کی بھی قانونی قدر سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہی چیز مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو میں یکسانی اور ہم رنگی پیدا کرتی ہے۔ اور اس کی زندگی کو بحیثیت مجموعی ایک جامع اور ہمہ گیر اسکیم پر چلاتی ہے۔ اوپر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے صرف ایک نظر فقہ اسلامی کی کسی کتاب کی فہرست مضامین پر ڈال لینا کافی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف طہارت اور نظافتِ ذات (Personal Hygiene) کا باب ہے اور دوسری طرف نماز اور زکوٰۃ اور روزہ اور حج کے ابواب ہیں، اور تیسری طرف عائلی زندگی کے قوانین ہیں۔ پھر ایک طرف کتاب البیوع جو تجارتی معاملات سے بحث کرتی ہے، دوسری طرف عدالت کا ضابطہ ہے، جو ادب القاضی کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ پھر سول اور کریمنل لا بھی تفصیل سے بیان ہوتے ہیں۔ اسی میں صلح اور جنگ بھی

بیان کیا جاتا ہے اور یہ سب اسلام میں قانون ہے ۔ موجودہ زمانہ کے قوانین کی کسی کتاب سے اسلامی فقہ کی کسی کتاب کے محض مضامین کی فہرست کا موازنہ کرکے دیکھ لیا جائے تو آدمی یہ جان سکتا ہے کہ اسلام کا تصورِ قانون موجودہ زمانہ کے تصورِ قانون کی بہ نسبت کتنا وسیع ، جامع اور ہمہ گیر ہے ۔ اس لحاظ سے دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے کہ وہاں انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے صرف ایک چیز قانون ساز فراہم کرتے ہیں اور باقی دوسرے بے شمار اجزاء بہت سے منتشر اور مختلف باہم متصادم ماخذ سے آتے ہیں اور یہاں پوری انسانی زندگی کے لیے رہنمائی صرف ایک ماخذ ہی سے آتی ہے اور زندگی کے تمام گوشوں کے لیے ایک ہی طرح سے آتی ہے ۔

قانون اور حیاتِ اجتماعی کی تعمیر

سوال : آپ کی نگاہ میں اسلامی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں قانون کا کیا حصہ ہے ؟ اسلام اس سلسلے میں قانون کا کیا رول متعین کرتا ہے ؟

جواب : لفظ قانون اس سوال میں ان محدود معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں یہ لفظ آج کل اصطلاحاً استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی سوال سے مراد یہ ہے کہ اسلامی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں شریعت کے اس حصّے کا کیا اثر ہے جو ایک اسلامی ریاست اور اس کی عدالتوں اور اس کی انتظامی مشینری کے ذریعے نافذ ہوتا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان جب تک انسان ہے اس کو صحیح طریقے پر چلانے کے لیے جس طرح تعلیم اور معاشرے کی مدد کی ضرورت ہے اسی طرح اس کو اس بات کی بھی احتیاج ہے کہ کوئی قوتِ جابرہ بھی ہو جو اس کو غلط راستے پر جانے سے روکتی ہے ۔ یعنی اسلامی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے لیے نہ محض اس کی فکر و

ذہنیت کی اصلاح کافی ہے اور نہ محض اجتماعی رسوم اس غرض کے لیے کافی ہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کو صحیح راستے پر قائم رکھنے کے لیے اور غلط راستے سے روکنے کے لیے ایک حد تک ایک مصلح قوتِ جابرہ کا ہونا ناگزیر ہے۔ اسی لیے جہاں بہت سے وہ احکام دیتی ہے جن کو ایک مومن انسان خود ہی اپنے اوپر نافذ کرسکتا ہے اور جہاں وہ بہت سے ایسے احکام دیتی ہے جن کو ایک اصلاح یافتہ معاشرہ اپنے اجتماعی نظام میں بطورِ خود نافذ کرتا رہتا ہے وہیں وہ بہت سے ایسے احکام بھی دیتی ہے جن کو نافذ کرنے کے لیے ایک اسلامی عدالت کا ہونا اور ایک اسلامی حکومت کی پولیس اور فوج اور مضبوط انتظامی مشینری کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انتظام موجود نہ ہو تو اسلامی شریعت کا یہ حصہ معطّل ہوجائے گا اور اس کے معطّل ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ میں بُرائیاں جن کو شریعت مٹانا چاہتی ہے پھیلتی چلی جائیں گی اور رفتہ رفتہ معاشرہ ان کا عادی ہوتا چلا جائے گا۔ ان بُرائیوں کے رُکنے کا انحصار ایسی حالت میں صرف افراد کے ضمیر اور صرف مسلمانوں کی رائے عام کی طاقت پر رہ جائے گا۔ لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ بُرائیوں کو روکنے والی قوتِ جابرہ کے موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتی جاتی ہیں اور وہ معاشرہ رفتہ رفتہ ان کا روادار اور بالآخر ان کا خوگر ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ اِس معاملے کا صرف ایک پہلو ہے، دوسرے پہلو سے دیکھیے تو یہ معاملہ اور زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ انسانی معاشرے میں قوانین کو نافذ کرنے والی ایک قوتِ جابرہ تو بہرحال موجود ہوتی ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسی سوسائٹی کم از کم مہذب دنیا میں موجود نہیں ہے جس میں سرے سے کوئی حکومت نہ ہو اور سرے سے کوئی قانون اور اس کو نافذ کرنے والی قوت ہی نہ ہو۔ اگر اسلامی

حکومت نہ ہوگی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی حکومت نہ ہوگی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک غیر اسلامی حکومت ہوگی، اور وہ غیر اسلامی قوانین کو قوتِ جابرہ سے نافذ کر رہی ہوگی اور اس قانون کے ذریعے سے معاشرت کی تشکیل و تعمیر پر وہ سارے اثرات ڈال رہی ہوگی جو قانون ڈالا کرتا ہے۔ اب ایک معمولی قوتِ متخیلہ رکھنے والا آدمی بھی آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی ایسی حکومت کے دائرے میں کوئی مسلم سوسائٹی رہتی ہو تو اس کی زندگی میں کتنا عظیم تضاد واقع ہوگا۔ ایک طرف وہ اپنی زندگی کے لیے جامع اور ہمہ گیر نظام رکھتی ہے جس کا ایک مخصوص مزاج ہے، جس کے کچھ مخصوص تقاضے ہیں اور جس کی کچھ مخصوص قدریں ہیں اور دوسری طرف اس کی زندگی پر ایک ایسی طاقت مسلط ہے جو اس مزاج، ان تقاضوں اور ان کے بالکل خلاف ایک دوسرے ڈھنگ پر زندگی کو زبردستی اپنے قانون کے مطابق ڈھال رہی ہے۔ اس تضاد اور اس کے نتائج کو سمجھنے کے لیے قوتِ متخیلہ کی بھی ایسی کچھ زیادہ حاجت نہیں رہتی۔ عملاً ہم دیکھ رہے ہیں اور مدت دراز سے بھگت رہے ہیں۔ اسی بنا پر اسلامی شریعت یہ چاہتی ہے کہ جس سوسائٹی نے اس کو اپنے قانونِ حیات کی حیثیت سے مانا ہو اس میں وہی اعتقادی قانون بھی اور وہی جبری قانون بھی بن کر رہے تاکہ اس کا منشا پوری طرح سے پورا ہو سکے اور مسلم سوسائٹی اس تناقض میں مبتلا نہ ہو جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

اِسلامی قانون کی تشکیلِ جدید

سوال: اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید کس طرح ہو سکتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی شکل کیا ہو سکتی ہے، اس کے لوازمات اور تقاضے کیا ہیں؟

جواب: اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید سے مُراد اگر سارے اسلامی قانون کو اُدھیڑ کر

نئے سرے سے مدوّن کرنا ہو تو اس کی کوئی حاجت نہیں۔ نہ صرف اس کی حاجت نہیں بلکہ یہ غیر معقول بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ پچھلے تیرہ سو برس میں اسلامی قانون کے اصل ماخذ یعنی کتاب وسنّت کو سمجھنے اور ان سے احکام اخذ کرنے کی مسلسل کوشش مسلمان کرتے رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں متعدد ایسے قانونی نظام کام کرتے رہے ہیں جن پر دنیا کے مختلف حصّوں میں کروڑوں مسلمانوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو منضبط کیا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس ساری عمارت کو خواہ مخواہ ڈھاکر یا توڑ کر آج نئے سرے سے تعمیر کرنے کی کوشش کی جائے اور نہ کوئی معقول آدمی جس کو اس قانونی ذخیرے سے کچھ بھی واقفیت ہو یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ ان صدیوں کے دوران میں کسی نے قرآن وسنّت کو صحیح نہیں سمجھا اور ان سے صحیح احکام حاصل نہیں کیے گئے۔ اس لیے تشکیلِ جدید کا یہ مطلب بالکل غلط ہے کہ اس قانونی نظام کی از سرِ نو اُدھیڑ بُن کی جائے۔ البتہ تشکیلِ جدید کے دو مطالب اور ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پچھلا قانونی ذخیرہ جس شکل میں پایا جاتا ہے اس کو موجودہ زمانے کی قانونی کتب کی طرز پر نئے سرے سے مرتّب کیا جائے تاکہ آج کل کے عدالتی نظام میں اس سے بآسانی فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ زمانے کے نئے مسائل اور نئی ضروریات کے مطابق سابق قوانین میں ایسے اضافے کیے جائیں جو کتاب وسنّت سے صحیح طریقے پر ماخوذ ہوں۔ اسلامی قانون کی رُوح اور اس کی شکل دونوں کے ساتھ ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتے ہوں اور اسلام کے قانونی نظام میں بجا طور پر اپنی جگہ پا سکتے ہوں۔ ان دونوں چیزوں کی فی الواقع ضرورت ہے مگر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم اپنی قانونی تعلیم کے نظام کو بھی بدلیں اور نئے ماہرینِ قانون پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت کا

بھی ایسا انتظام کریں کہ ان کا اجتہادی کام مسلمانوں میں باوقعت ہوسکے۔

شورائی اجتہاد

سوال: شورائی اجتہاد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ہم کسی موقعے پر بھی انفرادی اجتہاد کو نہیں روک سکتے اور نہ اسے روکنا چاہیے۔ ہر وہ صاحبِ علم وفہم آدمی جو کتاب وسنّت پر نظر رکھتا ہو حق رکھتا ہے کہ اجتہاد کرے اور اپنے دلائل پیش کرے۔ اگر اس کی بات وزنی ہوئی تو اہلِ علم میں مقبول ہوجائے گی ورنہ رد کردی جائے گی۔ اس طرح کے انفرادی اجتہاد سے جو رائیں دی جائیں گی اُن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک فتویٰ یا ایک انفرادی رائے کی ہوگی۔ اس کو قانون کی طاقت حاصل نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مختلف لوگ جب شرعی مسائل پر بحث کریں گے اور اپنے اپنے دلائل دیں گے تو مسائل زیادہ اچھی طرح منقح ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے ساتھ اگر شورائی اجتہاد بھی ہو اور اہلِ علم کی کوئی کونسل ایسی بنائی جائے جو باہمی بحث ومباحثے کے بعد بالاتفاق یا اکثریت سے اجتہادی فیصلے کرے تو یہ چیز بہت مفید ہوسکتی ہے۔ ایسی کونسل ایک ریاست میں بھی بنائی جاسکتی ہے اور اس کو ایک دستوری حیثیت بھی دی جاسکتی ہے تاکہ اس کے فیصلے قانونی طاقت حاصل کرلیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی ایک کونسل کی حیثیت محض ایک علمی کونسل کی ہو اور وہ علمی حیثیت سے اپنے فیصلے شائع کرے اور ان فیصلوں سے رہنمائی حاصل کرکے قانون ساز ادارے صحیح قانون بنائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمام دنیائے اسلام کی ایک مرکزی کونسل ایسی بنائی جائے کہ جو ساری دُنیا کے مسلمانوں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اجتہادات کرے۔ اس علمی کونسل کو قائم کرنے میں اگر مسلمان

کام یاب ہو جائیں تو یہ بڑی رحمت ثابت ہو گی۔ اس سے تمام مسلمانوں کو رہنمائی حاصل ہو گی اور کسی وقت چل کر یہ بھی ممکن ہو گا کہ ساری مسلمان حکومتیں مل کر ایک ایسی کونسل کو دستوری حیثیت بھی دے دیں تاکہ اس کے فیصلے تمام مسلمان حکومتوں میں قانون کی طاقت حاصل کریں۔

مولانا مودودی کے ساتھ ایک شام

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور نے ۱۶، اگست ۱۹۵۹ء کو "آزادی نمبر" شائع کیا۔ اس میں جناب عبدالقادر حسن کے قلم سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ ایک ملاقات کی یہ رُوداد شائع ہوئی۔

ساون کی اُس سانولی سلونی شام کے سرمئی سائے دُور دُور تک پھیل چکے تھے۔ دھوے بادلوں کو برسے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور اچھرہ موڑ سے مشرق کی جانب جانے والی کچی گلی کیچڑ میں لت پت پڑی تھی۔ مَیں اور میرا ساتھی سیلی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیچڑ سے بچی ہوئی جگہ پر بچتے بچاتے ۵۔اے ذیلدار پارک کی طرف چلے جا رہے تھے۔ کہیں سے رات کی رانی کے نوشگفتہ پھولوں کی خوشبو کا ایک لطیف سا جھونکا رات کی تلاش میں پیڑ سے نکلا اور ہمارے قریب سے گزر گیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ہمیں دائیں ہاتھ لگے نل نے اپنی طرف متوجہ کیا، جس کی ترچھی دھار اپنے زور میں رجز خوانی کر رہی تھی۔ پھولوں کے تختوں کے قریب ہی برآمدے کے سامنے صاف ستھرے فرش پر چند کرسیاں رکھی تھیں۔ مغرب کی طرف پُشت کیے ان کرسیوں پر جو لوگ بیٹھے تھے ان کے چہرے موسم کی اس فسوں خیزی سے بے خبر نہ جانے گیان دھیان کی کس دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس حسین ماحول کے مخملی پردوں میں کھلتے پھولوں کے تبسم اور بھیگی ہواؤں کی مہک سے یکسر ناآشنا یہ چہرے بے تحاشا اخلاقی زندگی بسر کرنے کے

باعث سپاٹ سے نظر آتے تھے۔ ان کے بیچ میں آرام کرسی پر کوئی ۵۰ برس کی عمر کے ایک وجیہہ، خوب رو اور خوب رنگ صاحب بیٹھے پان چبا رہے تھے۔ جب وہ بات کرتے تو قوام کی خوشبو فضا میں اِدھر اُدھر تیر جاتی۔ ان کی چوڑی پیشانی پر تدبّر و فراست کی چمک تھی۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز روشنی اور ہونٹوں پر دل موہ لینے والی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ یہ تھے عالمِ اسلام کے روشن خیال مفکّر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جن کی صحبت میں ہمیں اس شام کے چند لمحے گزارنے کا موقع ملا۔ بے شمار اندیشے اور لمبے چوڑے سوالات ہمارے پیاسے ذہنوں میں کروٹیں لے رہے تھے۔ اور اس فرصتِ یک دو نفس میں سوالات کا انتخاب خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ میرے ساتھی نے اپنے اندیشوں کی کتاب کا پہلا ورق اُلٹا:

"مولانا! آج کل کا نوجوان اسلامی ریاست کے تصوّر سے کانپ جاتا ہے، آنکھوں کے سامنے ڈاڑھیوں والے چہرے، ٹخنوں سے اونچی شلواریں، ہاتھوں میں دُرّے لیے ہوئے پولیس کے سپاہی، اور مٹی کے ڈھیلے سے گھوم جاتے ہیں اور آج کے ترقی یافتہ یا نام نہاد ترقی یافتہ دور میں زندگی گزارنے کا عادی نوجوان (مجھے بھی آپ اسی صف میں شامل سمجھیے) سوچتا ہے کہ اگر اس ملک میں وہ اسلامی ریاست قائم ہو گئی جس کا مطالبہ لے کر آپ لوگ اُٹھے ہیں تو اس میں ہمارا کیا بنے گا؟"

"آپ بخیریت رہیں گے۔" مولانا کے اِس مختصر سے جواب کو سُن کر وہ خاموش لوگ قہقہہ لگا کر جاگ اٹھے جو ان کے اردگرد رکھی ہوئی کرسیوں کے آغوش میں گم شُدگی کی حالت میں بیٹھے تھے۔ مولانا کا جواب سُن کر ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور انھوں نے طنزیہ نظروں سے ہمیں دیکھا "لو اور پوچھو، دیکھ لی حاضر جوابی اور خوش مذاقی۔"

"تو یہ خیریت کیسی ہوگی؟" میرے ساتھی نے اس مختصر سے جواب سے محظوظ ہو کر وضاحت چاہی۔

" بھئی ہم اُس ڈاڑھی کے ہرگز قائل نہیں جو محض چہروں پر اُگ آتی ہے اور قلبی اور ذہنی کیفیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام دراصل انسان کے اندر انقلاب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دِلوں کے انقلاب کا خواہاں ہے۔ اصلاح ڈنڈے اور دُرّے سے نہیں ہوسکتی۔ اصل کام تو زندگی کے بارے میں مجموعی نقطۂ نظر اور عملی رویّہ بدلنا ہے ڈنڈا چلانا نہیں۔ جو گروہ اسلامی ریاست کی رُوح اور اس کے مزاج سے آشنا ہوگا وہ صبر کے ساتھ کسی واضح لائن پر تعمیرِ ملّت کا کام کرے گا۔ یہ بات جو آج میں آپ سے کہہ رہا ہوں نئی نہیں ہے، اس سے پہلے بھی اسے متعدد مرتبہ لکھ اور کہہ چکا ہوں۔"

"آپ دُرست فرمارہے ہیں!" میں نے عرض کیا۔" لیکن آپ کی بات ایک محدود طبقے تک پہنچ سکی ہے۔ ایک ہم لوگوں کا حلقہ بھی ہے جسے مُلّانے ڈرا دھمکا کر اپنے سے دُور کر رکھا ہے اور ہم سہمی ہوئی سی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن اب آپ کی اس بات سے حوصلہ بندھا ہے کہ اسلامی ریاست میں جبر و تشدّد سے کام نہیں لیا جائے گا۔"

"ہرگز نہیں۔" مولانا نے تڑپ کر کہا۔" آخر میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں۔ میں ان غلط فہمیوں کو تقریر اور تحریر دونوں ہی ذرائع سے دُور کرنے کی پیہم کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن جو لوگ ان غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں وہ نہ پڑھتے ہیں نہ سُنتے ہیں اور دُور دراز کے خود ساختہ اندیشوں میں غلطاں رہتے ہیں۔ جتنے جبر سے ماڈرن حکومتیں کام لیتی ہیں ہم تو اتنے جبر کے پاسنگ سے بھی کام نہ لیں گے۔ آپ نے تُرکی کی تازہ خبر پڑھی ہوگی جس میں وہاں ماڈرن حکومت نے سپاہیوں اور فوجیوں کو مونچھیں رکھنے سے حکماً منع کیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ جبر ہے انصاف نہیں ہے۔ یہ بھی وہی تنگ نظری اور "مُلّائیت" ہے جس کا شکوہ مذہبی لوگوں سے کیا جاتا ہے۔ آخر ڈاڑھی اور مونچھوں کا آدمی کی صلاحیتِ کار سے کیا تعلق ہے؟ آپ سِکھوں کی مثال لیجیے، آخر وہ ہم سے کس میدان میں پیچھے تھے۔ کون سا سرکاری منصب ہے جس تک وہ نہ پہنچے اور حصولِ دولت کا وہ کون سا راستہ ہے

جواُن کے پاؤں سے پامال نہیں ہوا۔ کیا کبھی ڈاڑھی اُن کی راہ میں روک بنی ہے ؟
بہرحال یہ آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جس جبر سے یہ جدید تہذیب کے تنگ نظر علم بردار لوگوں کی ڈاڑھیاں اور مُونچھیں منڈواتے ہیں، اِس سے ہم ڈاڑھی رکھوانے کے معاملے میں کام لینے والے نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل کام لوگوں کے خیالات اور ذوق کی تبدیلی ہے۔ اس کے بعد طرزِ زندگی کے تمام تغیرات آپ سے آپ فطری طور پر ہوں گے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ "عام لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ کھیل (اسپورٹس) بھی شاید لہو و لعب کے ضمن میں آتے ہیں اور یہ اسلام کو پسند نہیں ہے، کیا اسلامی حکومت کھیلوں پر پابندی عائد کرے گی؟"

انھوں نے کہا "نہیں کھیلوں پر پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن یوں بھی نہیں ہوگا کہ رمضان کے مہینے میں لاہور جیسے بڑے شہر میں کرکٹ کا کھیل ہو رہا ہے، ہزار ہا مسلمان برسرِ عام کھا پی رہے ہیں اور کسی مسلمان کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم رمضان میں یہ کیا کر رہے ہیں۔ بے حسی اور مذہبی بے غیرتی کی اس سے بڑی عبرت انگیز مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ دیکھ کر بھی شرم نہ آئی کہ مہمان کھلاڑیوں نے اپنے مذہبی تہوار "گڈ فرائی ڈے" کو (جو میچ کے دَوران آیا تھا) کھیلنے سے انکار کر دیا لیکن مسلمانوں نے کرکٹ میچ کو رمضان کے مہینے میں رکھ کر زبردستی "فراخ دلی" کا ثبوت دیا۔ کھیل ہو یا کوئی اور تفریح اگر وہ اسلامی فرائض کی بجا آوری میں حائل ہوگی اور ممنوعات کے ارتکاب کا باعث بنے گی تو ظاہر ہے کہ اس کی اجازت نہیں ہوگی۔"

گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بچہ سب کو مصروف دیکھ کر دبے پاؤں لان میں داخل ہوا اور ایک پھول دبوچ کر لے اڑا۔ مولانا کے چھ بیٹوں میں سے اُن کا بڑا بیٹا جو تھوڑی دیر پہلے اس محفل میں شریک ہوا تھا، اُٹھ کر مغرب کی نماز کے لیے صفیں بچھانے لگا اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اصحاب ذرا کسمسائے۔

مولانا نے تفریح کا لفظ استعمال کیا تو وہ اصل سوال سامنے آیا جو ہماری اس مُلاقات کا مقصد تھا کہ اسلامی ریاست میں تفریح کے کیا ذرائع ہوں گے۔ کیا سینما، ریڈیو، موسیقی، تھیٹر اور اس نوع کی دوسری تفریحات بدستور رہیں گی یا اُن پر پابندی لگا دی جائے گی؟

موسیقی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "جہاں تک خوش آوازی کا تعلق ہے اُس کے امتناع یا اُس پر پابندی عائد کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن اس آواز کو سازوں اور فن کاری کے ساتھ دو آتشہ اور سہ آتشہ بنا کر پیش کرنا اپنے ساتھ بڑی خطرناک روایات رکھتا ہے۔ قدیم زمانے سے موسیقی، شراب اور جنس کا رشتہ ایک ساتھ چلا آتا ہے۔ اور ساز و سامان والی موسیقی انسان کو بدکاری اور مے نوشی پر اُکسانے کا باعث بنی ہے۔ اس لیے جو عادت بدی کا باعث بنتی ہے وہ پابندیوں سے آزاد نہیں چھوڑی جا سکتی لیکن اس خرابی کی رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے گی، یک لخت نہیں۔"

"پکّا گانا ہلکے پھلکے گانے سے ذرا مختلف ہے اور بادی النظر میں یہی لگتا ہے کہ اس سے انسان کے جنسی جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ دونوں یکساں نہیں ہیں۔" مولانا نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "کلاسیکل موسیقی واقعی انسان پر وہ اثرات نہیں ڈالتی جو عام موسیقی سے پڑتے ہیں۔ اس سے اگر کوئی دل بہلائے تو اس پر پابندی عائد کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔"

"تفریح کا ایک دوسرا ذریعہ سینما ہے۔" میرے ساتھی نے کہا۔ "کیا اسلامی حکومت بنتے ہی سینماؤں پر تالے ڈال دیے جائیں گے؟"

"میں موجودہ سینما کا سخت مخالف ہوں۔ میرا مطلب ان فلموں سے ہے جو آج کل عام طور پر دکھائی جا رہی ہیں۔ ہمارے قومی اخلاق کو جس قدر ان فلموں نے تباہ

کیا ہے کسی دوسری تفریح نے نہیں کیا۔ فلم وہ زبردست طاقت ہے جس کے ذریعے سے ہم اپنے عام آدمی کے معیارِ ذہنی اور معیارِ واقفیت کو کم ازکم انڈر گریجوئیٹس کے معیار تک بلند کرسکتے ہیں۔ ہم ان کو زراعت، صنعت وحرفت، حفظانِ صحت، شہریت، شہری دفاع وغیرہ کی اچھی تربیت دے سکتے ہیں۔ ہم دنیا اور کائنات کے متعلق ان کی معلومات بڑھا سکتے ہیں، اور اخلاقی و معاشرتی اصلاح کے کام میں بھی فلم ہماری بڑی مدد کرسکتی ہے۔ لیکن جب تک موجودہ طرز کی فلمیں دکھائی جارہی ہیں اُس وقت تک اصلاحی و تعلیمی فلموں کے لیے جگہ نکالنا آسان نہیں ہوگا۔ جوں ہی انھیں بند کرکے اصلاحی، تعلیمی اور جغرافیائی فلمیں بنانے کا کام شروع ہوگا تماشائیوں کو خود بخود ان میں دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور۔۔۔۔"

"لیکن مولانا تعلیمی فلموں سے تفریح تو نہیں ہوسکتی۔" میں نے اُن کی بات کاٹی۔

"ہوگی۔ ان کو اتنا دل چسپ بنایا جاسکتا ہے کہ لوگ انھیں دیکھنے میں مستغرق ہوسکتے ہیں۔"

"تجربہ اس کے خلاف شہادت دیتا ہے۔"

"اچھا تو کبھی کبھی کوئی تفریحی فلم بھی بنالیا کیجیے گا۔ لیکن اس میں بداخلاقی اور جرائم کی تربیت ہرگز نہ ہو۔"

یہاں سے گفتگو کا رُخ لٹریچر کی طرف مُڑ گیا۔ "افسانہ و ناول میں آپ تفریح کے کس حد تک قائل ہیں؟ اور کیا ادب میں حُسن وعشق کی داستانیں آپ کو گوارا ہوں گی؟"

"بالکل۔" مولانا نے وثوق سے کہا۔ "لیکن اس شرط سے کہ اس میں عریانی اور بداخلاقی کی تعلیم نہ ہو۔ حُسن وعشق کا ذکر تو پاکیزہ اور سبق آموز طریقے سے بھی ہوسکتا ہے۔ خدا نے کلامِ پاک میں بھی آخر حضرت یوسف علیہ السلام کا قصّہ بیان کیا ہی ہے۔"

"مولانا! آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی اسلامی ریاست کچھ یوں ہی رُوکھی پھیکی بے کیف سی ہوگی۔ بس اصلاحی، تعمیری اور علمی سی۔" ہم دونوں نے بوکھلا کر کہا۔

"نہیں، بات یوں نہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کوئی کس چیز کو اپنی تفریح سمجھتا ہے۔ تفریح تو میں بھی کرتا ہوں، لیکن میری تفریح شاید آپ سے مختلف ہے۔ جب ذہن اور ذوق بدلیں گے تو لوگ بُری تفریح سے از خود نفرت کرنے لگ جائیں گے۔ تفریح کے آخر اور راستے بھی تو ہیں، جو اچھے ہیں۔"

اسلامی ریاست میں عام شہری کی مجلسی اور ثقافتی زندگی کی وضاحت ہمارا مقصد تھی اور مولانا سے وہی سوالات دریافت کیے گئے جو روزمرّہ کی تفریحی زندگی سے متعلق تھے۔ تفریح برائے تفریح کے امکان سے مایوسی ہوئی تو بات شرعی ممنوعات کے بارے میں شروع ہوئی کہ شراب، قمار بازی اور عام عورت مرد کے تعلق کے بارے میں اسلامی ریاست کا کیا رویّہ ہوگا؟

"ان ممنوعات پر تو بہر حال پابندی عائد ہوگی۔ مثلاً شراب نہ تو درآمد ہوگی، نہ ہی اسے ملک میں تیار کیا جائے گا اور نہ اس کی خرید و فروخت ہو سکے گی۔" مولانا نے مُنہ میں سپاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر پھر بھی کوئی اپنے گھر میں بیٹھ کر چوری چھپے شراب کشید کرتا ہے اور اسے پیتا ہے اور باہر گلی میں جا کر لوگوں کو پریشان نہیں کرتا تو ہمیں اس کا تجسس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

یہاں مولانا نے ایک اہم نکتے کی وضاحت کی: "اسلام میں کسی کی سی۔ آئی۔ ڈی جائز نہیں ہے۔" انھوں نے سی۔ آئی۔ ڈی کے لیے تجسُّس کا لفظ استعمال کیا اور کہا کہ "اسلامی حکومت کا یہ کام نہیں ہے کہ لوگوں کے حالات کا تجسُّس کرے اور تلاش کر کر کے ان کے عیوب کا پتا چلائے اور کسی کے گھر یا خلوت کدے میں جھانک کر اس کے گناہ کا کھوج لگائے، خلافتِ راشدہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔"

"تو کیا سی۔ آئی۔ ڈی کا محکمہ ختم کر دیا جائے گا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"نہیں نہیں!" سپاری کی مقدار غالباً زیادہ تھی کہ مولانا کی آواز بدل گئی۔ "اس کا

کام ان مجرموں کا سُراغ لگانا ہوگا جو معاشرے میں فساد پھیلاتے ہیں۔"

شام بھیگ چلی تھی اور مولانا کی اسلامی ریاست کی سماجی اور مجلسی زندگی میں ہمارے نزدیک مروّجہ تفریحی ذرائع کا تصوّر جاں بحق تسلیم ہونے لگا تو اس پُربہار ماحول، پر اُداسی اور پژمردگی کی کیفیت چھاگئی۔ جب ہم اجازت لے کر رخصت ہونے لگے تو ان لوگوں نے ہمیں فتح مندانہ نظروں سے دیکھا جن کے چہروں پر اخلاقی زندگی کا کھچاؤ تھا۔ اس وقت وہ ہمیں بالکل معصوم نظر آرہے تھے۔ ہم نے چندساعتوں کے لیے تفریح کو اپنے ذہن سے خارج ہوتے محسوس کیا تو کلیجہ منہ کو آنے لگا اور یہ جو اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے ہی ہر طرح کی تفریح اور دل بستگی کو تیاگ بیٹھے ہیں کس قوتِ برداشت کے مالک ہیں۔ ہم نے اُٹھتے ہوئے انھیں دیکھا تو اُن کے چہروں پر فتح مندانہ چمک کی ایک کرن اُبھری۔ وہ فاتح تھے اور ہم مفتوح۔ اور ہم چوں کہ شکست خوردہ تھے اس لیے ذیلدار پارک کی کیچڑ بھری کچّی گلی میں ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھتے چپ چاپ چلے جارہے تھے۔

جدّہ ریڈیو کو اِنٹرویو

۱۹۵۶ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب نے پہلی مرتبہ عرب ممالک کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے ۔ مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران مولانا موصوف وہاں کے تاریخی آثار دیکھنے کے لیے نکلتے رہے لیکن خواہش کے باوجود اتنا وقت میسر نہ آسکا کہ وہ ان آثار کا تفصیلی مطالعہ کرسکیں ۔تین سال کے بعد ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں مارشل لار نافذ ہوا تو مولانا کو کچھ فرصت ملی ۔ انھوں نے اپنے ذہن میں سرزمینِ عرب کے سفر کا وسیع نقشہ بنایا اور طے کیا کہ نہ صرف حرمین کی زیارت کی جائے بلکہ نجد، حجاز، شرقِ اُردن، فلسطین، شام اور مصر کے بھی ان تمام آثار و تاریخی مقامات کو دیکھا جائے جن کا ذکر قرآن مجید اور سیرتِ رسولؐ کی کتابوں میں آیا ہے ۔مولانا ۳ ر نومبر ۱۹۵۹ء کو کراچی سے بذریعہ بحری جہاز سفر پر روانہ ہوئے ۔ دورانِ سفر میں مولانا نے آئندہ سفر کے سلسلے میں بعض ضروری کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ تقریباً چار ماہ تک ارضِ قرآن کا گہرا مطالعہ فرمایا! اس مدت میں بعض عرب ممالک کی ریڈیو سروس نے مولانا موصوف سے انٹرویو بھی لیے جو مولانا موصوف کے رفیقِ سفر جناب مولانا محمد عاصم صاحب الحدادؒ کی تالیف "سفرنامہ ارض القرآن" میں شامل ہیں ۔ انہی میں سے ایک

انٹرویو یہ ہے۔ جو جدّہ ریڈیو میں اُردو پروگرام کے ذمہ دار جناب عبداللہ عباس ندوی نے مولانا صاحب سے ۱۰ دسمبر ۱۹۵۹ء کی سہ پہر کو اُردو میں لیا جو اگلے دن اُردو اور اس سے اگلے دن عربی زبان میں نشر کیا گیا۔

س: جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جناب دوسری مرتبہ حجاز تشریف لائے ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ مناسب سمجھیں گے کہ اس سفر میں عمرہ کے علاوہ اپنے مقاصدِ سفر سے مطلع فرمائیں؟

ج: مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے اس مبارک سرزمین میں دوبارہ حاضر ہونے کا موقع عطا فرمایا اور دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اس خطۂ پاک کی زیارت کا بار بار موقع بخشے۔ میرے اس سفر کی غایت عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ یہ ہے کہ ان مقامات اور علاقوں کا بچشم خود مشاہدہ کروں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یا جن سے قرآن مجید کے نزول یا سیرتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کا خاص تعلق ہے۔ اس سلسلے میں مکّہ معظمہ اور طائف کے بعد اب میں بدر، مدینہ منورہ، خیبر، مدائنِ صالحؑ، تبوک اور مدین کا قصد رکھتا ہوں۔ پھر اُردن میں خاص خاص تاریخی مقامات کو دیکھتا ہوا دمشق جاؤں گا اور وہاں سے مصر اور جزیرۂ سینا کا رُخ کروں گا۔

س: جماعت اسلامی نے دین کی جو خدمت کی اور کر رہی ہے اس سے تقریباً اُردو خواں حلقہ بہت حد تک واقف ہے۔ اس لیے معلوم یہ کرنا ہے کہ جن حالات سے اس وقت آپ گزر رہے ہیں ان میں جماعت نے اپنی دینی خدمت کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے ہیں؟

ج: جماعت اسلامی اس وقت پاکستان میں موجود نہیں ہے[1]۔ اب مَیں اپنی ذاتی حیثیت

---

[1] یہ انٹرویو ۵۹ ۱۹ء کے آخر میں لیا گیا تھا جبکہ پاکستان میں مارشل لاء کے تحت سیاسی سرگرمیوں اور جماعتوں پر پابندی عائد تھی۔

میں دین کی اشاعت و تبلیغ کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔ اسی طرح جو لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے وہ سب مجھے اُمید ہے کہ اپنی انفرادی حیثیت میں دعوت الی اللہ اور اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کی سعی میں مشغول ہوں گے۔ کیوں کہ جماعت چاہے موجود نہ ہو مگر ایک مومن و مسلم ہونے کی حیثیت سے ہم پر خُدا کے دین کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتے۔

س: عرب ممالک یا دوسرے ممالک میں برِصغیر کے رہنے والے جو لوگ عارضی طور پر مقیم ہیں اُن کو آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ یعنی یہ کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے کیا کریں؟

ج: ہندوستان و پاکستان کے جو لوگ عرب ممالک میں مقیم ہیں اُن کو میرا مشورہ یہ ہے کہ: اَوّلاً وہ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائیں جو ممالک عربیہ میں قیام سے اُنھیں حاصل ہوا ہے اور عربی زبان سے اچھی واقفیت پیدا کریں۔

ثانیاً وہ اپنے اوقات کا ایک حصّہ قُرآن و سُنّت اور تاریخِ اسلام کے مطالعے کے لیے مخصوص کرلیں۔

ثالثاً وہ تہذیب مغربی کے اِس سیلاب سے بچنے کی پُوری کوشِش کریں جو ہمارے برِصغیر کی بہ نسبت عرب ممالک میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ اُمنڈا چلا آرہا ہے اور

رابعاً وہ احکامِ اسلامی کی شدّت کے ساتھ پابندی کریں اور اپنے لیے آج کے اصل عرب کو نہیں بلکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحابؓ ہی کو زندگیوں کا نمونہ سمجھیں۔

س: عرب قومیّت اس لحاظ سے کہ وہ ایک مرحلہ ہے دوسرے مرحلے میں جامعہ اسلامیہ کا تصوّر عرب قومیّت کے لیڈروں کے ذہن میں موجود ہے اور صرف سامراجیت

سے نجات پانے کے لیے ایک وقتی ذریعے کے طور پر اس تحریک کو بڑھایا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات میں جن سے عرب دو چار ہیں اتحادِ اسلامی کی تحریک ان کے لیے مُفید ہوگی۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا آپ ہمیں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے؟

ج: میں ابھی تک یہ سمجھنے سے معذور ہوں کہ عرب قومیّت اور اسی طرح دُوسری جغرافیائی قومیتیں واقعی جامعہ اسلامیہ کے تصوّر کی راہ میں ابتدائی مرحلہ بن سکیں گی۔ اس کے برعکس مجھے سخت اندیشہ ہے کہ اگر ہم عرب اور غیر عرب، ترک اور غیر ترک، پاکستانی اور غیر پاکستانی کی تفریق کو نشو و نما دیتے چلے گئے تو ایک وقت وہ آ جائے گا جب عالم گیر اُمّتِ مسلمہ کی وحدت کا خواب بھی ہم مشکل ہی سے دیکھ سکیں گے۔ اسی طرح مَیں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ مغربی یا مشرقی استعمار سے نجات پانے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی جغرافیائی قومیتیں ہمارے لیے کیسے مددگار بن سکتی ہیں۔ دُنیا میں مسلمان بحیثیت مجموعی ۵۰ کروڑ سے کم نہیں اور زمین کا بہت بڑا رقبہ بے شمار وسائل کے ساتھ ان کے قبضے میں ہے۔ نیز روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں جو کلمۂ توحید کے ماننے والوں سے خالی ہو۔ اگر ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے متحد ہوں تو دُنیا کی کوئی سامراجی طاقت ایسی نہیں ہے جو ہمارا وزن محسوس کیے بغیر رہ سکے۔ ہماری دوستی بھی ہر طاقت کے لیے اہم ہوگی اور دشمنی بھی اہم۔ اور ہم مل کر ہر استعمار کا مقابلہ زیادہ قوت کے ساتھ کر سکیں گے۔ لیکن اگر ہم زبان یا وطن یا نسلی بنیاد پر الگ الگ کیمپ بنا ڈالیں تو ہمارا ہر کیمپ بجائے خود کمزور ہوگا اور ہم میں سے کسی کی بھی اتنی طاقت نہ ہوگی کہ کوئی استعماری طاقت ہم سے ڈرے یا کوئی دوسری طاقت ہماری دوستی یا دشمنی کی اہمیت محسوس کرے۔

س: کیا جناب عام سُننے والوں کے نام کوئی پیغام دینا پسند فرمائیں گے؟

ج: میرے سامعین اس وقت غالباً سب کے سب مسلمان ہی ہیں، اُن کو میرا پیغام یہ ہے کہ وہ اُن ذمّہ داریوں کو سمجھیں اور ادا کریں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ صرف اتنا کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے خدا کو اور اس کے دین کو مان لیا۔ بلکہ جب آپ نے خدا کو اپنا خدا اور اس کے دین کو اپنا دین مانا ہے تو اس کے ساتھ کچھ ذمّہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن کا شعور آپ کو ہونا چاہیے اور جن کے ادا کرنے کی آپ کو فکر ہونی چاہیے۔ اگر آپ انھیں ادا نہ کریں گے تو اس کے وبال سے نہ دنیا میں چھوٹ سکیں گے، نہ آخرت میں۔ وہ ذمّہ داریاں کیا ہیں؟ وہ صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ خُدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں، وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں، وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ معاملات میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے ضابطے پر عمل کریں بلکہ ان سب کے علاوہ ایک بڑی اور بہت بھاری ذمّہ داری آپ پر یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ آپ تمام دنیا کے سامنے اس حق کے گواہ بن کر کھڑے ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں۔ مسلمان کے نام سے آپ کو ایک مستقل اُمّت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ آپ بندگانِ خدا پر شہادتِ حق کی حُجّت پوری کر دیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

"اور اس طرح ہم نے بنایا تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی اُمت تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو، اور رسولؐ تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔"

یہ آپ کی اُمّت کا عین مقصدِ وجود ہے جسے آپ نے پُورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوادی۔ یہ آپ پر خُدا کا عائد کیا ہوا فرض ہے۔ کیوں کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ :

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو خُدا کی خاطر اُٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو۔"

اور یہ نرا حکم ہی نہیں بلکہ تاکیدی حکم ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ۔

"اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بھی بتادیا ہے کہ اِس فرض کو انجام نہ دینے کا نتیجہ کیا ہے۔ آپ سے پہلے اِس گواہی کے کٹہرے میں یہودی کھڑے کیے گئے تھے، مگر انھوں نے کچھ تو حق کو چھپایا اور کچھ حق کے خلاف گواہی دی اور فی الجملہ حق کے نہیں بلکہ باطل کے گواہ بن کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انھیں دھتکار دیا اور اُن پر وہ پھٹکار پڑی کہ :

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ۔

"ذلّت (ورُسوائی) اور محتاجی (وبے نوائی) ان سے چمٹادی گئی اور وہ خُدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔"

یہ شہادت جس کی ذمّہ داری آپ پر ڈالی گئی ہے اس سے مُراد یہ ہے کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے، جو صداقت آپ پر منکشف کی گئی ہے، انسان کے لیے فلاح و نجات کی جو راہ آپ کو دکھائی گئی ہے، آپ دُنیا کے سامنے اس کے حق و صداقت

ہونے پر اور اس کے راہِ راست ہونے پر گواہی دیں ــــ ایسی گواہی جو اس کے حق و راست ہونے کو مبرہن کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجّت پوری کر دے۔ یہ شہادت دو ہی طرح کی ہوسکتی ہے۔ ایک قولی شہادت، دوسرے عملی شہادت۔ قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دُنیا پر اس حق کو واضح کریں جو انبیاء کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے۔ سمجھانے اور دل نشین کرنے کے جتنے طریقے ممکن ہیں ان سب کو استعمال کر کے، تبلیغ و دعوت اور نشر و اشاعت کے جتنے طریقے ممکن ہیں ان سب سے کام لے کر، علوم وفنون نے جس قدر مواد فراہم کیا ہے وہ سب اپنے ہاتھ میں لے کر ہم دنیا کو اس دین کی تعلیم سے روشناس کریں جو خُدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ فکر و اعتقاد میں، اخلاق و سیرت میں، تمدّن و معاشرت میں، کسبِ معاش اور لین دین میں، قانون اور نظمِ عدالت میں، سیاست اور تدبیرِ مملکت میں اور بین الانسانی معاملات کے تمام دُوسرے پہلوؤں میں، اس دین نے انسان کی رہنمائی کے لیے جو کچھ پیش کیا ہے اُسے ہم خوب کھول کھول کر بیان کریں۔ دلائل اور شواہد سے اس کا حق ہونا ثابت کریں اور جو کچھ اس کے خلاف ہے اس پر معقول تنقید کر کے بتائیں کہ اِس میں کیا خرابی ہے۔ اِس قولی شہادت کا حق اَدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُمّت مجموعی طور پر ہدایتِ خلق کے لیے اسی طرح فکر مند نہ ہو جس طرح انبیاء علیہم السّلام انفرادی طور پر اس کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے۔ یہ حق اَدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام ہماری تمام کوششوں اور قومی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہو۔ ہم اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور اپنے وسائل و ذرائع اس پر لگا دیں۔ ہمارے تمام کاموں میں یہ مقصد لازماً ملحوظ رہے اور ہم اپنے درمیان سے کسی ایسی آواز کے اُٹھنے کو تو کسی حال میں برداشت ہی نہ کریں جو حق کے خلاف شہادت دینے

والی ہو۔

رہی عملی شہادت، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں جن کو ہم حق کہتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سُنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کرے۔ وہ ہمارے برتاؤ میں اس شیرینی کا ذائقہ چکھ لے جو ایمان کی حلاوت سے انسان کے اخلاق و معاملات میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود دیکھ لے کہ اس دین کی رہنمائی میں کیسے اچھے انسان بنتے ہیں، کیسی عادل سوسائٹی تیار ہوتی ہے، کیسی صالح معاشرت وجود میں آتی ہے، کس قدر صاف ستھرا اور پاکیزہ تمدّن پیدا ہوتا ہے، کیسے صحیح خطوط پر علوم و ادب اور فنون کا نشو و نما ہوتا ہے اور اجتماعی و انفرادی زندگی کا ہر پہلو کس طرح سُدھر جاتا ہے، سنور جاتا ہے اور بھلائیوں سے مالامال ہو جاتا ہے۔ اس شہادت کا حق صرف اس طرح اَدا ہو سکتا ہے کہ ہم فرداً فرداً بھی اور قومی حیثیت سے بھی اپنے دین کی حقانیت پر مجسم شہادت بن جائیں۔ ہمارے افراد کا کردار اس کی صداقت کا ثبوت دے، ہمارے گھر اس کی خوشبو سے مہکیں اور ہماری دُکانیں اور ہمارے کارخانے اس کی روشنی سے جگمگائیں، ہمارے ادارے اور ہمارے مدرسے اس کے نُور سے منوّر ہوں، ہمارا لٹریچر اور ہماری صحافت اس کی خوبیوں کی سند پیش کرے، ہماری قومی پالیسی اور اجتماعی سعی و جہد اس کے برحق ہونے کی روشن دلیل ہو، غرض ہم سے جہاں اور جس حیثیت میں بھی کسی شخص یا قوم کو سابقہ پیش آئے وہ ہمارے شخصی اور قومی کردار میں اس بات کا ثبوت پالے کہ جن اُصولوں کو ہم حق کہتے ہیں وہ واقعی حق ہیں اور ان سے فی الواقع انسانی زندگی اصلح اور اعلیٰ و ارفع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ اس شہادت کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو

صرف اس وقت جب کہ ایک اسٹیٹ انہی اُصولوں پر قائم ہو جائے اور وہ پورے دین کو عمل میں لاکر اپنے عدل و انصاف سے، اپنے اصلاحی پروگرام سے، اپنے حُسنِ انتظام سے، اپنے امن سے، اپنے باشندوں کی فلاح وبہبود سے، اپنے حکمرانوں کی نیک سیرت سے، اپنی صالح داخلی سیاست سے، اپنی راست بازانہ خارجہ پالیسی سے، اپنی شریفانہ جنگ سے اور اپنی وفادارانہ صلح سے ساری دنیا کے سامنے اس بات کی شہادت دے کہ جس دین نے اس اسٹیٹ کو جنم دیا ہے وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسانی کی بھلائی ہے۔ یہ شہادت جب قولی شہادت کے ساتھ مل جائے تب وہ ذمّہ داری پُوری طرح اَدا ہوجاتی ہے جو اُمتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے، تب نوعِ انسانی پر بالکل اتمامِ حجّت ہوجاتا ہے اور تب ہی ساری اُمّت اس قابل ہوسکتی ہے کہ آخرت کی عدالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بعد کھڑی ہوکر شہادت دے سکے کہ جو کچھ حضورؐ نے ہم کو پہنچایا تھا وہ ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا، اور اس پر بھی جو لوگ راہِ راست پر نہ آئے وہ اپنی کج روی کے خود ذمّہ دار ہیں۔

بس عام سامعین کو میرا پیغام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے دلوایا تھا:

تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ـ

"آؤ اس امر کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ خُدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔"

ہم سب ایک خُدا کے بندے، ایک رسولؐ کے پیرو اور ایک کتابِ مبین

کے ماننے والے ہیں اور ایک ہی قبلہ ہم سب کا مرکز و مرجع ہے۔ آئیے ہم سب اس بات پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کے سوا اِس دُنیا میں کسی کی بندگی نہ کریں گے، اس کے قانون کے سوا کسی قانون کی پَیروی نہ کریں گے اور اُس کے حکم کے سوا کسی کا حکم اُس کی زمین چلنے نہ دیں گے۔

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔

عمان ریڈیو کو اِنٹرویو

ارضِ عرب کی سیاحت کے دوران جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ جب عمان کے فندق بالاس (پیلس ہوٹل) میں قیام پذیر تھے، ۲ر جنوری ۱۹۶۰ء کی شام ۴½ بجے عمان ریڈیو کے نمائندے نے جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے یہ انٹرویو لیا، جو ۳ر جنوری کو عمان ریڈیو سے نشر ہوا۔

س : اس سفر سے جسے آپ اِن دنوں کر رہے ہیں، آپ کے پیشِ نظر کیا مقصد ہے؟

ج : اس سفر سے میرا مقصد انبیاء علیہم السلام کے آثار اور اُن تاریخی مقامات کو دیکھنا اور سمجھنا ہے جن کا ذکر قرآن پاک یا سیرت کی کتابوں میں ہوا ہے۔ میں اِن دنوں تفہیم القرآن کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اِس تفسیر کی تیاری کے دوران میں مَیں نے یہ محسوس کیا کہ قرآن کے بہت سے مقامات کو آدمی اُس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک ان علاقوں اور مقامات کو دیکھ نہ لے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہوا ہے۔ اس وجہ سے میں نے یہ سفر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں مکّہ، طائف، بدر، مدینہ، مدائن صالح، خیبر، تبوک اور مغائر شعیب کو دیکھتا آرہا ہوں۔ اب یہاں سے بیت المقدس اور الخلیل جاؤں گا، وہاں سے واپس آکر میرا ارادہ دمشق اور قاہرہ جانے کا ہے تاکہ وہاں سے جزیرہ نما سینا جاسکوں

س : آپ کی یہ تفسیر کس زبان میں ہے؟

ج : میں یہ تفسیر اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ لیکن میرا پختہ ارادہ ہے کہ اس کا عربی، انگریزی اور دُوسری زبانوں میں بھی ترجمہ شائع کیا جائے۔ اب تک عربی میں صرف اس کے ایک حصے، تفسیر سُورۂ نور کا ترجمہ ہوا ہے اور وہ اِن دنوں زیرِ طبع ہے[1]۔

س : عربی زبان میں آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ج : عربی زبان میں اب تک میری بیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے الحجاب، الربا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرہ حال ہی میں دمشق سے شائع ہو چکی ہیں۔

س : اسرائیل کے یہودی ان دنوں دریائے اُردن کا رُخ بدلنے کی سازش کر رہے ہیں، آپ کا اِس صریح زیادتی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج : میرے نزدیک یہ اِسی طرح صریح زیادتی ہے جس طرح بلادِ عرب کا ہر شخص اسے زیادتی تصوّر کر رہا ہے۔ میں فلسطین میں اسرائیل کے وجود ہی کو عدوان سمجھتا ہوں کجا کہ میرے نزدیک دریائے اُردن کے ایک قطرے پر بھی اس کا حق ہو۔

س : کیا آپ پاکستان کے عرب ممالک سے تعلقات پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

ج : میرے پاس اِس بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں کیوں کہ ان معلومات کا تعلق حکومتوں سے ہے۔ البتہ میں پاکستان کے عام باشندوں کے متعلق یہ واضح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ وطن، زبان یا رنگ کی بنیاد پر قومیت کے قائل نہیں ہیں، ان میں وطنی قومیت کا تصوّر کبھی پیدا نہیں ہو سکا اور وہ مراکش سے انڈونیشیا تک سارے عالمِ اسلامی کو ایک دارالاسلام اور دُنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک برادری

[1] اب یہ ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

سمجھتے ہیں۔ اور کسی مسلمان ملک کے رویے میں اگر وہ اس کے خلاف تبدیلی محسوس کرتے ہیں تو انھیں سخت اذیت ہوتی ہے۔ کاش عالمِ اسلامی کے دُوسرے ممالک میں بھی یہی تصوّر کارفرما ہوتا۔

س: اُردن میں آپ دوسری مرتبہ تشریف لا رہے ہیں وہ ایسی کون سی بات ہے جو اس مرتبہ آپ نے یہاں محسوس کی ہے؟

ج: مَیں نے اس مرتبہ اُردن میں ہر جگہ عمرانی اور مادی ترقی کے اثرات محسوس کیے ہیں، خصوصاً نئی سڑکیں، جو بن گئی ہیں یا بن رہی ہیں۔ اُن سے نہ صرف اُردن کے باشندوں کو بہت آرام پہنچا ہے بلکہ بیرونی سیّاحوں کو تاریخی مقامات تک جانے اور انھیں دیکھنے میں بہت آسانی ہوگئی ہے۔

—— * ——

بی۔بی۔سی کو انٹرویو

سفر ارض القرآن کے دوران مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ جب القدس میں قیام پذیر تھے تو ۵ جنوری ۱۹۶۰ء کی رات بی۔بی۔سی لندن کا نمائندہ برائے اُردن ان کے پاس پہنچا اور یہ انٹرویو عربی زبان میں ریکارڈ کیا۔ بی بی سی لندن نے اپنے عربی پروگرام میں ایک ہفتے کے بعد نشر کیا۔

س: آپ کی اُردن میں تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟

ج: اِس سیاحت سے میرا مقصد انبیاء علیہم السّلام کے آثار اور ان اقوام کے آثار کو بچشمِ خود دیکھنا ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ میں آج کل قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھ رہا ہوں، اس تفسیر کی تیاری کے دوران میں مَیں نے محسوس کیا کہ قرآن مجید کے بہت سے مقامات کو آدمی اُس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک ان علاقوں اور مقامات کو دیکھ نہ لے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا۔ اِسی وجہ سے میں نے یہ سفر کیا ہے اور اس سلسلے میں مکّہ، طائف، بدر، مدینہ، مدائن صالح، خیبر، تبوک اور مغائر شعیب کو دیکھتا ہوا آرہا ہوں اور اب اُردن و فلسطین کے آثار دیکھنے کے بعد جزیرہ نما سینا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

س: ہم جماعت اسلامی کے متعلق اکثر سُنتے اور پڑھتے رہتے ہیں، کیا اس کے متعلق آپ ہمیں کچھ معلومات دے سکتے ہیں؟

ج : یہ جماعت اب سے اُنیس سال پہلے اس مقصد کے لیے قائم ہوئی تھی کہ اسلام کو ایک مکمّل نظامِ حیات کی حیثیت سے عملاً قائم کیا جائے اور وہ اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ صرف کتابوں کے اوراق پر ہی نہیں بلکہ عملی زندگی کے میدان میں کارفرما ہو۔ اب اسی مقصد کے لیے میں اپنی ذاتی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور اُمید ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح فرداً فرداً کام کر رہے ہوں گے۔

س : عربی زبان میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں کیا آپ ان کے متعلق ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟

ج : عربی زبان میں اب تک میری بیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں الحجاب، الرّبا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرہ حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اور آج کل سُورۂ نور زیرِ طبع ہے۔

س : عرب اور دُنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مسائل میں آپ کس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں؟ خصوصاً مسئلۂ فلسطین کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے؟

ج : قضایا العرب اور قضایا المسلمین میرے نزدیک الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ان سب کو تمام عالمِ اسلامی کے مشترک قضایا سمجھتے ہیں۔ خود وہ بلادِ عرب کے قضایا ہوں یا پاکستان کے یا انڈونیشیا کے یا کسی اور ملک کے۔ اِس نقطۂ نظر کے مطابق فلسطین کا قضیہ بھی صرف عربوں کا قضیہ نہیں بلکہ تمام عالمِ اسلام کا قضیہ ہے، اسے عربوں کا قضیہ قرار دینا اسے کمزور کرنا ہے۔

———※———

قاہرہ ریڈیو کو انٹرویو

سیاحت عربستان کے دوران مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جب گرینڈ ہوٹل (قاہرہ) میں ٹھہرے ہوئے تھے تو ۱۹ر جنوری کی صبح قاہرہ ریڈیو کا نمائندہ ہوٹل آیا اور اُس نے مولانا سے یہ انٹرویو لیا، جو اسی رات نشر کیا گیا۔

س: سُنا ہے اِن دنوں آپ قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھ رہے ہیں۔ یہ تفسیر آپ کس زبان میں لکھ رہے ہیں اور اس سے آپ کے پیش نظر کیا مقصد ہے؟

ج: مَیں پچھلے چند سال سے قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہا ہوں۔ اس تفسیر سے میرے پیشِ نظر اصل مقصد یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن مجید کی رُوح اچھی طرح سمجھائی جا سکے اور جو شبہات و شکوک ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں اُنھیں دور کیا جائے۔ یہ تفسیر میں اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ شائع کیا جائے۔ عربی میں اس کا صرف ایک حصّہ تفسیر سُورۂ نور منتقل کیا جا چکا ہے اور وہ اِن دنوں دمشق میں زیرِ طبع ہے۔ انگریزی ترجمہ شروع ہو چکا ہے۔ سندھی اور بنگلہ میں بھی اس کے بعض حصّے شائع ہو چکے ہیں۔

س: عربی میں آپ کی تصنیفات کتنی ہیں اور کون کون سی؟

ج: میری تصنیفات زیادہ تر اُردو میں ہیں۔ عربی میں بیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

جن میں الحجاب، الرّبا، مبادی الاسلام اور اسس الاقتصاد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

س : کیا آپ کے ہاں پاکستان میں عربی مدارس پائے جاتے ہیں ؟ کیا ان مدارس سے متعلق آپ ہمیں کچھ معلومات دے سکتے ہیں ؟

ج : پاکستان اور ہندوستان میں ہزاروں مدارس ایسے ہیں جن میں عربی زبان اور قرآن مجید، حدیث، فقہ اور دوسرے اسلامی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ انگریزی استعمار کے زمانے میں عربی اور دینی تعلیم جب اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں سے خارج کر دی گئی تو مسلمانوں نے خود اپنے مصارف سے آزاد مدارس قائم کیے تھے تاکہ عربی زبان اور اسلامی ثقافت کو زندہ رکھا جا سکے۔ یہ مدارس اب تک اسی طرح چل رہے ہیں۔ برِّصغیر میں لاکھوں افراد ایسے پائے جاتے ہیں جو ان مدارس سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔

س : اپنے سفر میں آپ 'دیر سانت کاترین' جانے کے لیے مصر تشریف لائے ہیں، کیا یہاں کے بعد کسی اور ملک میں بھی جانے کا قصد رکھتے ہیں ؟

ج : میرا سفر قریب قریب اب قاہرہ پر ختم ہو رہا ہے۔ کل مَیں 'دیر سانت کاترین' روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے واپس آنے کے بعد میرا ارادہ یہی ہے کہ دمشق اور کویت کے راستے اپنے وطن واپس چلا جاؤں، کسی اور ملک کے سفر کا میں ارادہ نہیں رکھتا۔

———— ٭ ————

سفرِ ارض القرآن

عربستان کی تفصیلی ومطالعاتی سیاحت کے بعد مولانا موصوف بذریعہ ہوائی جہاز ۵ر فروری ۱۹۶۰ء کی صبح کراچی اور ۶ر فروری کو لاہور واپس پہنچ گئے۔ غالباً مولانا پہلے اور منفرد مفسرِ قرآن ہیں جنھوں نے محض کتابی معلومات پر انحصار کرنے کی بجائے خود ارضِ قرآن کے متعلقہ مقامات کا گہرا مشاہدہ ومطالعہ کیا۔ اس بات نے ان کی تفسیر "تفہیم القرآن" کی علمی وقعت اور استناد میں قابلِ رشک اضافہ کر دیا ہے۔ ہفت روزہ "شہاب" لاہور کے نمائندے نے عربستان کے اس سفر کے مشاہدات وتاثرات سے آگاہ ہونے کے لیے مولانا موصوف سے ۱۴ر فروری کو یہ تفصیلی انٹرویو لیا جو اس ہفت روزہ کے اتحاد عالمِ اسلامی نمبر مورخہ ۲۱ - ۲۸ر فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

نمائندہ شہاب تقریباً مقررہ وقت پر ذیلدار پارک کی اس تاریخی عمارت میں پہنچا، جو پاکستان بننے کے بعد سے اب تک تعمیر واصلاح کی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا، اور ابر پارے اس کے ساتھ دل لگی کر رہے تھے، موسم کھلا کھلا تھا۔ ملاقاتیوں کی مجلسِ عام برخاست ہوئے پون گھنٹہ گزر چکا تھا ــ تنہائی اور سکوت کا عالم! مولانا نماز میں معروف تھے۔ فارغ ہوئے تو عرضِ سلام کے بعد مدعا پیش کیا۔ برآمدے میں نشست رہی۔ مولانا نے نہایت اطمینان سے ایک ایک سوال میں اپنے مشاہدات و

تاثرات بیان کیے۔ جس ترتیب سے گفتگو ہوئی تقریباً اسی طرح پیش کی جا رہی ہے:

س: یہ طویل سفر بلحاظ صحت آپ کے لیے کیسا رہا جب کہ مختلف آب و ہوا سے آپ کو گزرنا پڑا ہوگا؟

تھکنے کی مہلت بھی نہیں ملی

ج: میری صحت کے لیے یہ سفر بہت مفید رہا۔ وجع مفاصل کی جو تکلیف ۵۸ء کے وسط سے اُبھر رہی تھی، اس سفر کی مشقت نے اس کا قلع قمع کر دیا ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں تکلیف کا آغاز ہوا مگر سفر نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اس کی کچھ پزیرائی کی جا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح وہ اُٹھی تھی اُسی طرح ختم ہوگئی۔ اسی طرح پتھری کی تکلیف بھی بار بار اٹھتی تھی مگر مشقت نے اس کو بھی سختی سے دبا دیا۔ حتیٰ کہ سفر کے دَوران میں تھکنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔

آب و ہوا کی تبدیلیاں

اختلافِ آب و ہوا کا یہ حال تھا کہ عمان سے ہم چار ہزار فٹ کی بلندی سے نشیب کی طرف چلنا شروع ہوئے تو دو ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر سمندر کی سطح سے تیرہ سو فٹ نیچے پہنچ گئے اور پھر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر بیت المقدس کی بلندیوں پر تھے۔ تھوڑی سی مدت میں درجۂ حرارت کا اتنا زبردست تفاوت پایا کہ اُس میں نزلہ ہو جانا کچھ بعید نہ تھا، لیکن خدا کا فضل ہے کہ مجھ جیسے نزلے کے پرانے مریض پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس طرح سینا کے سفر میں ہم ابوزنیمہ کے قریب سطح سمندر سے ایک گز کی بلندی پر تھے اور پانچ گھنٹے کے اندر اندر ہم سطح سمندر سے پانچ ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے اور اسی طرح واپسی پر پانچ ہزار دو سو فٹ کی بلندی سے اُترے تو تھوڑی دیر میں سطح سمندر

سے ایک گز کی بلندی پر تھے۔ اس سفر میں بھی گرمی اور سردی کا اتنا نمایاں فرق تھوڑی مدت کے اندر دیکھا کہ نزلے کا اثر ہو جانا عین متوقع تھا مگر اللہ کے فضل سے ایک چھینک بھی نہیں آئی۔ ایسے ہی نمایاں فرق مدینہ اور عقبیٰ کے درمیان صحرائی سفر میں بھی مسلسل پیش آتے رہے۔ کسی مقام سے کپڑے پہن کر چلتے تو شام ہوتے ہوتے جب صحرا میں رات آتی تھی سخت سرد ہوا میں ٹھنڈے پانی سے اکثر دھو کرنا پڑتا، لیکن بس یہ اللہ کا فضل ہی تھا کہ اُس نے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑنے دیا۔

س: سرزمینِ عرب کے باشندوں اور ان کی مختلف حکومتوں کا رویّہ کیسا رہا؟

ناقابلِ فراموش

ج: ہمارے ساتھ ہر جگہ انتہائی برادرانہ سلوک کیا گیا۔ خصوصاً سعودی عرب اور اُردن کے حکام اور فرماں رواؤں کی عنایات اور مہمان نوازیوں کی یاد ہم کبھی فراموش نہ کر سکیں گے ——ہمیں کسی جگہ بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ہم اپنے ملک سے باہر کہیں ہیں۔ زبان اور عاداتِ معاشرت کے فرق کے سوا اور ہر لحاظ سے اپنے آپ کو بالکل اپنے وطن کی طرح محسوس کرتے رہے۔

بعض واقعات خصوصیت سے مہمان نوازی کے ایسے ہیں کہ جو عرب ملکوں کی روایتی تواضع کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ خیبر کے گورنر صاحب ہماری دعوت خاص اہتمام سے کرنا چاہتے تھے مگر ہم نے سفر میں تاخیر ہونے کا عذر پیش کر کے رخصت چاہی تو چلتے ہوئے انھوں نے میزبانی کے طور پر ایک بکرا ساتھ کر دیا۔

س: کسی مرحلے میں کوئی خاص زحمت یا غیر معمولی تکلیف تو پیش نہیں آئی؟

فورڈ پک اَپ

ج: غیر معمولی تکلیف کے واقعات ہمیں مدینہ اور عقبہ کے درمیانی سفر میں پیش آئے ہیں جو اس راستے پر سفر کرنے والے ہر شخص کو لازماً پیش آنے ہی چاہییں۔ بلکہ ہمیں تو سفر میں نسبتاً کم تکلیف پہنچی، کیوں کہ ہمارے پاس بالکل جدید ترین ماڈل کی فورڈ پک اَپ تھی جس کے ٹائروں اور جس کی مشینری نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی ہم کو دغا نہ دی۔ ورنہ اِس طرح کے سفر میں جان تک سے ہاتھ دھونے کی نوبت آسکتی ہے۔ اِن صحرائی سفروں میں سب سے زیادہ پُرخطر مقام وہ ہوتا ہے جہاں زمین پر میلوں تک چٹانوں کی سطح ہونے کی وجہ سے کسی نوعیت کے بھی نشاناتِ راہ موجود نہیں ہوتے۔ ایسے موقعوں پر اگر مسافر بھٹک جائے تو پھر جب تک پانی کا ذخیرہ اس کے پاس ہے اُسی وقت تک زندگی کی مہلت ہے۔ پانی کا ذخیرہ ختم ہوا اور جان گئی۔ مدینہ اور عقبہ اور العلا کے درمیان نشاناتِ راہ ناپید ہیں البتہ خیبر اور العلا کے درمیان کچھ نشان ہیں۔

س: اِس سفر میں قرآن اور تاریخ سے متعلق جو علمی حقائق سامنے آتے ہیں ان سے آپ صرف تفہیم القرآن میں کام لیں گے یا الگ کتابی شکل میں لائیں گے؟

مستقل کتاب

ج: میں اِن شاء اللہ ایک مستقل کتاب لکھوں گا جس میں ان علاقوں کے متعلق اپنے مشاہدات اور اپنی تحقیقات بھی لکھوں گا اور دُوسرا تاریخی مواد بھی جو کچھ موجود ہے اس کتاب میں جمع کروں گا۔

س : کیا آپ کو اپنے ذوق کا کھانا اس سفر میں ملتا رہا ہے؟ عربی کھانوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ریڈ ڈیول

ج : پاکستان اور ہندوستان کے لوگ چٹپٹے مسالے دار کھانوں کے عادی ہیں، انھیں دنیا میں کہیں کا کھانا بھی مزے کا نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے عرب دوست میزبان اپنی طرف سے انتہائی پُرتکلف دعوتیں کرتے تھے مگر افضلانِ مذاق کی وجہ سے ہم بمشکل ہی آدھا پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔ البتہ جب کبھی ہم ہوٹل میں کھاتے تو سُرخ مرچ مانگ لیا کرتے تھے اور پھیکے سیٹھے کھانوں پر مرچ چھڑک کے اپنے ذوق کی تسکین کر لیتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُردن، شام، مصر میں ہر جگہ سُرخ مرچ موجود تھی اور بعض جگہ پسی ہوئی بھی ہم کو ملی۔ نہ معلوم یہ حضرات اس کا کیا استعمال کرتے ہیں۔ بعض جگہ یورپ سے آئی ہوئی سُرخ مرچ کی ایک چٹنی بوتلوں میں مل جاتی تھی جس کا نام کسی صاحبِ ذوق نے ریڈ ڈیول (Red Devil) یعنی "شیطانِ سرخ"، رکھ چھوڑا تھا۔ بہرحال کہیں کہیں اِس شیطان سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

س : اِس سفر پر جانے سے پہلے کیا آپ نے مشرق و مغرب کے مختلف سفرناموں کا مطالعہ فرما لیا تھا اور وہ مسائل پیشِ نظر رہے ہیں جن سے بعض مسلم اور مشرقی علماء نے تعرض کیا ہے؟

سفر سے پہلے ذہنی تیاری

ج : اِس سفر پر جانے سے پہلے میں قریب قریب وہ ساری کتابیں پڑھ چکا تھا۔ جو مغربی سیاحوں اور محققین نے ان ممالک پر لکھی ہیں۔ اور بیشتر سفرناموں کے

نوٹس بھی میں نے اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ جن سے مشاہدات میں بہت مدد ملی۔ قدیم عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات بھی میرے سامنے تھے۔ ان پیشگی معلومات کی وجہ سے بہت سی جگہ مقامی باشندوں نے بھی اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ میں یہاں آنے سے پہلے ان مقامات اور علاقوں کے متعلق خود اہل ملک کی بہ نسبت زیادہ واقفیت رکھتا ہوں۔

س: علمی لحاظ سے کن مقامات و آثار کے مشاہدے سے آپ نے زیادہ اہم نتائج اخذ کیے ہیں؟

عِلمی اہمیت

ج: علمی لحاظ سے تو ہر جگہ ہی کا سفر بہت مفید ثابت ہوا ہے لیکن خاص طور پر صالحؑ اور پٹیرا کے سفر میں میں نے بعض ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو اب تک کسی پیشرو محقق کی تحریروں میں میری نظر سے نہیں گزرے۔

س: اقوامِ ماضیہ جو عذابِ الٰہی کا نشانہ بنیں ان میں سے کن کے عبرت انگیز آثار زیادہ واضح شکل میں قرآن کی تصدیق کرتے ہیں؟

العلا سے اُردن کی سرحد تک

ج: اِس معاملے میں مدائن صالحؑ کے آثار سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ وہاں اب تک پہاڑوں میں کھُدے ہوئے مکانات وادی میں ہر طرف موجود ہیں اور العلا سے اُردن کی سرحد تک کئی سو میل کی ایک لمبی پٹی میں مسلسل ایسے پہاڑ پائے جاتے ہیں جو ایک شدید زلزلے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

س: ڈاکٹر حمید اللہ نے غزوۂ حنین کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اِس غزوہ کا کوئی مقام اب تک

معین نہیں کیا جا سکا اور نہ اِس نام کی کوئی آبادی موجود ہے ۔ اس کے متعلق آپ نے کیا مشاہدہ کیا ہے ؟

معرکۂ حُنین کا مقام

ج : حُنین نام کی کوئی بستی تو کبھی نہیں تھی ، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی نہ تھی ۔ یہ ایک طویل وادی ہے ۔ جو آج بھی اسی نام سے موجود ہے اس وادی میں خاص کس جگہ معرکہ پیش آیا تھا اس کا پتا نہیں چلتا ۔ حنین کی وادی میں میلوں سفر کرتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سا خاص مرحلہ ایسا ہے جہاں اِس نوعیت کا معرکہ پیش آ سکتا تھا ۔ ہمارے ذہن میں چوں کہ قصبہ حنین کی وہ تفصیلات موجود تھیں جو سیرت میں بیان ہوئی ہیں ، اس لیے اِن تفصیلات کی روشنی میں بغور دیکھا ہے اور ایک حصّے کے متعلق ہمارا گمان ہے کہ اغلباً یہیں معرکہ پیش آیا ہو گا ۔ ہم نے اِس حصّے کی تصویر بھی لے لی ہے اور اِن شاء اللہ مَیں اپنی مفصّل کتاب میں اس کی تمام تفصیلات بیان کروں گا ۔ لیکن بہر حال یہ قیاس ہے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے ۔

ذوالمجنہ اور عکاظ کے مقامات کو بھی ہم نے تحقیق کیا ہے ۔ میں اِن شاء اللہ اپنی کتاب میں جو نقشہ اِس علاقے کا دوں گا اس میں ان کے مواقع وضاحت کے ساتھ دوں گا ۔

س : بدر و اُحد کے میدانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کیا کوئی نئے پہلو واقعاتِ سیرت کو سمجھنے کے لیے اخذ ہوئے ؟

کتابی معلومات سے آگے

ج : اِن مقامات پر جاکر نقشۂ جنگ اچھی طرح سمجھ میں آیا ۔ غزوۂ بدر، اُحد، خود طائف کا معرکہ، تبوک اور حُنین، ان تمام معرکوں کی جو ٹھیک پوزیشن ہے وہ ان مقامات پر جاکر پوری طرح سمجھ میں آئی ۔ خصوصاً تبوک کے سفر میں غزوۂ تبوک اور یرموک کے سفر میں غزوۂ یرموک کو سمجھنے کا بہترین موقع ملا ۔ یہ غزوات کبھی کتابوں سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتے تھے ۔

س : غزوۂ بدر سے قبل حضورؐ نے دیدبانی کے لیے جو فوجی مہمات روانہ فرمائی تھیں اور غزوۂ بدر کے سلسلے میں جو فوجی نقل وحرکت بنفسِ نفیس حضورؐ نے اپنی سرکردگی میں کی تھی کیا اس سے متعلقہ مقامات ، نالے اور پہاڑیاں اب بھی انہی ناموں سے موجود ہیں ؟

قدیم مقامات

ج : بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جن کے قدیم نام اب موجود نہیں ہیں اور ان کا تعین کرنا قریب قریب محال ہے ۔ البتہ اس علاقے میں سفر کر کے بکثرت غزوات سراپا سمجھ میں آجاتے ہیں ۔

س : انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرامؓ کے مزاروں میں سے کن کن کی زیارت ہوئی ؟

انبیاء کے مزارات

ج : انبیاء علیہم السلام میں سے صرف حضرت ابراہیمؑ کا مزار ثابت ہے اور اس کے بعد حضرت ہارونؑ اور حضرت لوطؑ کے مزارات بھی بہت بڑی حد تک قرینِ قیاس ہیں ۔ حضرت لوطؑ کے مزار پر ہم گئے تھے اور حضرت ہارونؑ کے مزار کی زیارت کئی میل کے فاصلے سے نصیب ہوئی ۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت

معاذؓ بن جبل، حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح، حضرت شرجیلؓ بن سنہ اور حضرت ضرارؓ بن ازور، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے مزارات کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ غزوۂ طائف، غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد اور غزوۂ خیبر کے شہداء کے مزارات بھی دیکھے۔

س: کیا ان مزاروں کے ساتھ بھی مجاوری کا ویسا ہی نظام موجود ہے جیسا یہاں پایا جاتا ہے؟

نظامِ مجاوری

ج: سعودی عرب کے ماسوا دُوسرے تمام علاقوں میں مزارات اسی شان کے بنے ہوئے ہیں جیسے ہمارے ملک میں ہیں اور بعض بعض جگہ مجاوری بھی اسی طرح کی موجُود ہے۔

س: سرزمینِ عرب میں امن و امان کے لحاظ سے کیسے حالات ہیں؟

کوئی چوری نہیں ہوتی

ج: سرزمینِ عرب میں امن کی وہ کیفیت ہے جس کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ لوگ اپنے مکانوں کے دروازے کھُلے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، دُکانیں کھُلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور چوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آتا۔ ہمارے ایک دوست ظہران سے ہمیں لینے کے لیے بحرین پہنچے۔ دو روز ہمارے ساتھ بحرین میں رہے، پھر ہمارے ساتھ ہی بحرین سے ظہران گئے اور وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ صاحب اپنے گھر کا دروازہ کھُلا چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے اور تین دن کی اس غیر حاضری میں ان کے گھر کے ایک تنکے کو بھی

کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ لوگوں کے سامان اگر راستے میں کہیں گر پڑتے ہیں تو کئی کئی روز گزر جانے پر بھی وہ اپنے سامان کو اسی جگہ پڑا ہوا پاتے ہیں جہاں وہ گرا تھا۔

س: کیا بدوی اور صحرائی علاقوں میں بھی قانون کا احترام پایا جاتا ہے ؟

خطرہ عنقا ہے

ج: ہم صحراؤں میں شب و روز پھرتے رہے ہیں اور کئی راتیں ہم نے صحرا میں گزاری ہیں اور یہ وہی علاقے ہیں جہاں سعودی حکومت سے پہلے حاجیوں کے قافلے لٹا کرتے تھے۔ مگر ہماری جان و مال کو کہیں کوئی خطرہ پیش نہیں آیا بلکہ خطرے کا خطرہ بھی ہمارے دل میں نہیں گزرا۔ یہ صرف ایک چیز کی برکت ہے اور وہ ہے حدودِ شرعیہ کا اجرا۔ اس کے سوا کوئی دوسری توجیہہ جرائم کے اس فقدان کی نہیں کی جا سکتی ۔۔ ہم نے دریافت کیا کہ جیلوں میں کس قسم کے جرائم میں زیادہ تر لوگ قید کاٹ رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اکثر ڈرائیور ہیں جو اپنی ریس ڈرائیونگ (تیز رفتاری) کی وجہ سے قید کاٹ رہے ہیں۔

س: لوگ وہاں عام طور پر لین دین کے معاملات میں کیسے ہیں ؟

معاملاتی اخلاق

ج: لین دین کے معاملات میں ان میں بس اتنی ہی خرابیاں ہیں جو ہمارے اکثر ممالک میں پائی جاتی ہیں۔ کوئی غیر معمولی حالت نہیں۔ مثلاً قیمت زیادہ بتائی جاتی ہے اور کسی سے زیادہ اور کسی سے کم لے لیتے ہیں۔ اشیا میں ملاوٹ کرنے کی وہ عام بیماری وہاں نہیں پائی جاتی جو یہاں ہے۔

س: تیل کی دولت کا اثر معاشرے پر کیسا پڑ رہا ہے؟

معیارِ زندگی اور گرانی

ج: تیل کی دولت نے چند سال کے اندر یک لخت لوگوں کی مالی حالت اور ان کے معیارِ زندگی کو اتنا بلند کر دیا ہے جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے تنخواہیں، مزدوریاں، اشیائے فروخت کی قیمتیں سب بے انتہا چڑھی ہوئی ہیں۔ غیر ملکی مصنوعات تو بلاشبہ ہمارے ہاں کی بہ نسبت بے حد سستی ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کسٹم ڈیوٹی بہت کم ہے۔ خصوصاً کویت اور بحرین میں بالکل برائے نام ہے۔ لیکن دوسری ضروریاتِ زندگی بے حد گراں ہیں۔ مکانوں کے کرائے اتنے ہیں کہ ہمارے ہاں کسی بڑے سے بڑے شہر میں بھی حتیٰ کہ کراچی اور لاہور میں بھی، میں سمجھتا ہوں کہ اس معیار سے چوتھائی سے زیادہ نہیں۔

س: کیا دولت کے اس سیلاب میں سے عوام کو بھی حصہ مل رہا ہے؟

تیل کی دولت میں عوام کا حصہ

ج: عوام تک اس کا اثر اس طرح پہنچ رہا ہے کہ مزدوریاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ سعودی حکومت بھی اور کویت کی حکومت بھی ہر ممکن بہانے سے اس دولت کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ کویت میں نہایت عالی شان ہسپتال بنے ہوتے ہیں جس میں علاج، غذا اور دوا کے بہترین انتظامات ہیں اور ہر شخص کا علاج بالکل مفت کیا جاتا ہے بلکہ کویت میں کسی ڈاکٹر کی پریکٹس چل ہی نہیں سکتی۔

تعلیم، لباس اور کھانا مفت

اِسی طرح سے تعلیم پر سعودی حکومت بھی اور کویت کی حکومت بھی بہت خرچ کر رہی ہے۔ طلبہ کو کھانا، کپڑا، غذا، کتابیں دینے کے علاوہ حکومت جیب خرچ بھی دیتی ہے۔ قریب کے زمانے میں سعودی حکومت نے تعلیم کو عام کرنے میں غیر معمولی قدم اُٹھائے ہیں۔ ہمیں کوئی چھوٹی سے چھوٹی بستی بھی ایسی نہیں ملی جہاں مدرسہ نہ قائم ہو۔

کویت کے پرائمری مدارس کی عمارتیں ہمارے ہاں کے بڑے سے بڑے اُمراء کی کوٹھیوں سے زیادہ شان دار ہیں۔ ہر طالب علم کو گرمی اور جاڑے کے دو دو سوٹ دیے جاتے ہیں۔ مدرسے میں دودھ، پھل اور ناشتہ لازمی طور پر طالب علم کو ملتا ہے۔ بہرحال مختلف تدبیروں سے یہ حکومتیں عوام تک اِس دولت کو پہنچانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ کسی کی زمین اگر سرکاری کام کے لیے حکومت لیتی ہے تو منہ مانگے دام دے کر، بلکہ بسا اوقات بائع کی توقع سے بھی بہت زیادہ دام دیتی ہے۔ اِن حکومتوں کے اکثر معاملات کو دیکھ کر ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ تیل کی دولت کو عوام کے اندر پھیلانے کی خود خواہش مند ہیں اور اس کے لیے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہیں۔

س: کیا عربی شہروں میں بھکاریوں کی کثرت ہے؟

بھکاری

ج: مکّہ اور مدینہ میں بھکاری موجود ہیں اور غالباً رہیں گے۔ کیوں کہ یہ صدیوں کی بگڑی ہوئی عادات کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح جن علاقوں سے حاجیوں کے قافلے

گزرا کرتے تھے اُن میں بھی ہم نے بچوں تک میں بھیک مانگنے کی بیماری پائی ہے۔ لیکن باقی سعودی عرب کے کسی علاقے میں ہمیں بھک منگوں سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ اُردن میں بھی ہم نے یہ بیماری صرف بیت المقدس میں پائی۔

س: لوگوں میں مغربی معاشرت کا اثر کس حد تک ہے اور خواتین میں بگاڑ کی رفتار کیا ہے؟

سیلاب

ج: مغربی تہذیب کا سیلاب عرب ممالک کے اُوپر بُری طرح ٹوٹ پڑا ہے۔ سعودی حکومت میں علماء کے اثر کی وجہ سے جو انھیں ایک حد تک حکومت میں حاصل ہے تھوڑا سا رُکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مگر دُوسرے ممالک علانیہ اور کُھلّم کُھلّا اس سیلاب میں بہہ رہے ہیں اور کوئی رُکاوٹ کسی نوعیت کی نہیں ہے۔ پہلے اخوان کی تحریک بڑی حد تک اس سیلاب کو روک رہی تھی لیکن اب یہ ایک طوفان ہے جو بلا روک ٹوک بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہم نے ہر جگہ اب معتدبہ عنصر ایسا پایا ہے جو اس صورتِ حال کو انتہائی دل گرفتگی کے ساتھ محسوس کر رہا ہے اور کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن استبداد پسند حکومتیں اپنے دائرے میں کسی نوعیت کی اجتماعی تنظیم اور تحریک کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لیے ہر مزاحمت کے بغیر فواحش، بے حیائی، الحاد اور اشتراکیت کے فتنے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

س: اشتراکیت کے سدِّباب کے لیے آیا کوئی نتیجہ خیز کام ہو رہا ہے؟

اشتراکیت کا سدِّباب

ج: اشتراکیت کے متعلق ان حضرات کو یہ غلط فہمی ہے کہ طاقت کے زور سے اس کو انھوں نے روک رکھا ہے۔ لیکن جو شخص بھی اشتراکیت کے مزاج کو سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ جب زبانیں بند ہوتی ہیں اور قلموں پر پہرے بیٹھے ہوتے ہیں اور تمام اجتماعی تحریکات رُکی ہوئی ہوتی ہیں تو اس وقت سے زیادہ سازگار فضا اشتراکیت کے لیے کوئی دوسری نہیں ہوتی۔ عراق میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب تک ہمیں بھی تجربہ نہ ہو جائے گا ہم دوسرے ٹھوکر کھانے والوں سے کوئی سبق نہ لیں گے۔

س: عربی نیشنلزم کس رفتار سے نشو و نما پا رہا ہے۔ کیا عوامی طبقوں تک اس کا اثر پہنچ چکا ہے؟

عربی قوم پرستی

ج: اُونچے اور متوسط طبقوں میں اس کا زہر خاصا پھیل چکا ہے اور حکومتیں بھی بہت بڑی حد تک اس پالیسی کو اپنا رہی ہیں لیکن عام مسلمان ہر جگہ اسلامی اخوت ہی کو جانتا ہے اور ذرا چھیڑتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر مسلمان ہونے کا احساس قومیت کے احساس کی بہ نسبت قوی تر ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک معتد بہ عنصر ایسا موجود ہے جو قومیت کے اس مغربی تصوّر کا سخت مخالف ہے اور اسے عربوں کے لیے بھی نقصان دہ سمجھتا ہے۔ لیکن آج کل عرب ممالک پر سیاسی طاقت سے جو لوگ مسلّط ہیں وہ مختلف اسباب سے اس قومیتِ جاہلیہ کی علَم برداری اور ہمّت افزائی کر رہے ہیں اور ادیبوں اور صحافیوں اور شاعروں کا ایک لشکر اس فتنے کی آبیاری کر رہا ہے۔

کفر پر سلام

حال ہی میں ایک شاعر کا ایک قصیدہ شائع ہوا ہے جس پر اس کو "قدیس قومیۃ عربیۃ" کا لقب دیا گیا ہے اور انعامات سے اس کو نوازا گیا ہے۔ اس قصیدے کا صرف ایک شعر سن لیجیے اور اندازہ کیجیے کہ یہ لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

سَلَامٌ عَلٰی کُفْرٍ یُوَحِّدُ بَیْنَنَا
وَاَهْلاً وَسَهْلاً بَعْدَهٗ لِجَهَنَّمَ

(سلام ہو اس کفر پر جو ہمارے درمیان اتحاد پیدا کرتا ہے پھر اس کے بعد ہماری طرف سے خوش آمدید ہے جہنّم کے لیے)۔

میں نے جب یہ سنا تو بے اختیار کہا کہ ان شاء اللہ جہنم بھی اس کو اور اسے داد دینے والوں کو اہلاً و سہلاً ہی کہے گی۔

ایک ہی منبع

میں نے اکثر مقامات پر عرب بھائیوں سے کہا کہ ہمارا اور تمہارا رشتہ اسلام کی بدولت ہے اسلام کو تم لے کر اٹھو تو دنیا کے ۵۰، ۶۰ کروڑ مسلمان تمہارے ساتھ ہیں لیکن اس کفر و جاہلیت کو اختیار کرو گے تو دنیا کے مسلمان تو درکنار عرب کے مسلمانوں کا بھی بہت بڑا حصّہ تم کو الوداع کہے گا اور تم کسی طرف سے بھی کوئی تائید نہ پا سکو گے۔ میرا یہ احساس ہے کہ عربی ممالک میں قومیت اور الحاد اور فسق و فجور یہ تینوں چیزیں ایک ہی منبع سے آ رہی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چل رہی ہیں۔ جو لوگ قومیّت کے علم بردار ہیں، وہی الحاد کے علمبردار ہیں اور وہی فسق و فجور پھیلا رہے ہیں، اور ان ظالموں کو یہ احساس بھی نہیں

کہ اس قومیتِ عربیہ کی بدولت خود عرب ریاستوں کی خیر نہیں کیوں کہ اکثر و بیشتر ریاستیں وہ ہیں جن کی آبادی کا غالب حصّہ غیر عرب آبادی پر مشتمل ہے۔ اور اگر ریاست اسلام کے بجائے قومیت پر قائم ہو تو وہ پھر عرب آبادی سے کسی وفاداری کی توقع نہیں کر سکتی۔

س: کیا مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ضبطِ ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی کی رَو ان ممالک میں چل رہی ہے؟

خاندانی منصُوبہ بندی

ج: یہ سوال کہیں کہیں اُٹھ رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی رَو ایسی نہیں چلی ہے۔ اس وقت تک جتنے لوگ بھی وہاں پیدا ہوئے ہیں وہ اپنے دنیا میں آجانے کو جتنا حق بجانب سمجھتے ہیں اسی حد تک نئے آنے والوں کے حق کو بھی مانتے ہیں۔ آگے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ان کی عقل اتنی ترقی کر جائے گی کہ وہ نئے آنے والوں کا دروازہ تھرڈ کلاس کے مسافروں کی طرح روک کر کھڑے ہو جائیں گے۔

س: ممالک اسلامیہ میں اتحاد کس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے؟

اتحادِ عالمِ اسلامی

ج: ممالکِ اسلامیہ میں کسی اتحاد کا تصوّر اسلام اور اسلامی تہذیب کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ ممالک اسلامیہ ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو جو چیز ملا کر ایک کرتی ہے وہ عقیدہ ہے اور اصول، تہذیب و اخلاق کی یکسانی ہے۔ جتنا ان کے عقائد میں تفاوت ہوگا اور ان کی زندگی کے

طور طریقوں اور اخلاقی اُصولوں میں اسلامی تہذیب سے بُعد پیدا ہوگا، اتنا ہی وہ ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے جائیں گے۔ مثال کے طور پر کھانے پینے ہی کے معاملے کو لیجیے۔ ہم پورے اطمینان کے ساتھ اپنے ملک سے نکل کر دنیا کے ہر مسلمان کے گھر میں اس کے دستر خوان پر کھانا کھا سکتے ہیں کیوں کہ ہمارے اور اس کے درمیان حرمت اور حلّت کے حدُود یکساں ہیں اور ہمیں کوئی خطرہ اس بات کا نہیں ہوتا کہ مسلمان کے دستر خوان پر ہمیں حرام چیز سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن فرض کیجیے کہ اگر دنیا کے مختلف حصّوں کے مسلمان مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر اسلام کے حدودِ حلال وحرام کو فراموش کردیں تو ہمارے لیے ایک عیسائی اور بُت پرست کے دستر خوان اور ایسے مسلمان کے دستر خوان میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ہمارا وہ رشتہ جو ہمیں ایک مسلمان کے ساتھ ایک دستر خوان پر جمع کرتا ہے صرف اس ایک چیز کی وجہ سے ختم ہوجاتا ہے۔ اس ایک مثال سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدّن سے ہٹ جانے کے بعد دُنیا کے مسلمانوں کو کوئی طاقت ایک متحد اُمّت بناکر نہیں رکھ سکتی۔ جو لوگ مسلمانوں کے اندر مغربی تہذیب کو پھیلا رہے ہیں، افسوس ہے کہ انھوں نے کبھی اس بات کو نہیں سوچا کہ وہ اپنے آپ کو کتنی بڑی پشتیبان طاقت سے محروم کر رہے ہیں۔ امریکہ اور اس کی جیسی قومیں اربوں رُوپے کی دولت دوسرے ممالک کے اندر جس گُڈوِل کے حاصل کرنے کے لیے صرف کر رہی ہیں وہ گُڈوِل ہر مسلمان ملک کو بالکل مفت یا صرف اسلام کی بدولت دُنیا میں حاصل ہے۔ لیکن یہ نادان لوگ اس چیز کی قدر نہیں پہچانتے اور اس کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

دورۂ مشرقِ وسطیٰ کے تاثرات

مشہور صحافی م ۔ش نے "لاہور کی ڈائری" میں مولانا مودودیؒ سے ایک ملاقات کی تفصیلات کو قلم بند کیا۔ یہ ڈائری ہفت روزہ "شہاب" لاہور، مورخہ ۱۷ر اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔

حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب کو تین ساڑھے تین ماہ تک مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کے بعد لاہور مراجعت فرمائے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہونے کو آیا تھا لیکن شوقِ ملاقات کی فراوانیوں کے باوجود ان کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہونے کا موقع نہیں مل رہا تھا، آخر خدا خدا کر کے اس عید کی تقریبِ سعید نے اس تمنّا اور آرزو کو بارآور ہونے کا موقع دیا۔ نمازِ عید سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کی خدمتِ عالیہ میں حاضری دی۔

حضرت مولانا اپنے عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ بیرونی ملکوں کی سیاحت نے مولانا کی صحت کو چمکا دیا تھا۔ اس کا اظہار ان کے چہرے پر زیادہ رونق کی شکل میں موجود تھا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو مولانا نے فرمایا کہ "مکّہ معظمہ میں حاضری کے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہیں اور جب مدینہ منوّرہ جائیں تو

یہ معلوم ہوتا ہے گویا باپ کے حضور کھڑے ہیں۔" یہ دو فقرے ایک خوش عقیدہ مسلمان کے جذبات اور حسیات کے حقیقی طور پر آئینہ دار ہیں۔

عرب ممالک کی قومی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: "بنیادی جذبات اور بیرونی معاشی اور اقتصادی اثرات کے تضاد سے ایک لاوا ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ جب آتش فشاں پہاڑ کی طرح یہ پھوٹ بہا تو اس تزلزل کے اثرات دُور دُور تک مُترتب ہوں گے۔"

اِس نقطہ نگاہ کی وضاحت فرماتے ہوئے حضرت مولانا نے اُس دولت کی طرف اشارہ کیا جو سیّال سونے (پٹرول) کے طفیل عرب ممالک میں سیلاب کی مانند اُمڈی ہے۔ مثلاً ایک کویت ہی کو لیجیے۔ فی کس آمدنی کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا ملک شاید دنیا بھر میں اوّل نمبر ہو۔ دولت کے کچھ مقتضیات ہوتے ہیں۔ ایک طرف یہ تقاضے معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں برپا ہو رہے ہیں، دوسری طرف دین کے تقاضے ہیں۔ پُرانی معاشرت اور اخلاق کی ایک تہہ ہے جس کے نیچے نئے ہیجان پرورش پا رہے ہیں۔ آخر ایک نہ ایک دن پُرانے اور نئے تقاضوں میں ٹکراؤ ہوگا جس سے دھماکے کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

عرب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جس سُرعت اور تیزی سے نئے تمدّن کے مظاہر فروغ حاصل کر رہے ہیں اس کا اندازہ کچھ وہاں پہنچ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ امریکن آئل کمپنی کے کارفرماؤں اور کارندوں نے ریت کے سمندر میں عیش و راحت کے جزیرے بنادیے ہیں۔ ریت کے سمندر میں تیراکی کے لیے تالاب، گرم اور جھلستے ہوئے ماحول میں ٹھنڈے ٹھار دفاتر، مکانات اور دُکانیں موجود ہیں۔ ریت کے سمندر میں اُنھوں نے اس طرح ریل گاڑی چلائی ہے کہ ریت کا ایک ذرّہ بھی ریلوے لائن کی صفائی میں مخل نہیں ہوتا، اور ریلوے کے ڈبے شروع سے

اخیر تک سب ہی ایرکنڈیشن۔

نئے دار الحکومت ریاض میں الٰہ دین کے چراغ کی طرح محلات، دکانوں اور مکانوں کی ایک جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی دنیا بس رہی ہے۔ کیڈی لک کاروں کے قافلے کول تار کی سڑکوں پر دن رات رواں دواں رہتے ہیں۔ ایک طرف اس نئی دولت کا سیلاب ہے اور ایک طبقے کی خوش حالی اور فارغ البالی کی نئی جنتیں ہیں، دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترویج کے لیے روایاتی مشینری ہے۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو مقررہ عمال لوگوں کو نماز کے لیے پکارتے ہیں۔ دکانیں بند کر دی جاتی ہیں۔ بظاہر کہیں پر فحاشی نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جدید اور قدیم کب تک کھلے طور پر متصادم ہونے سے بچتے رہیں گے۔

حضرت مولانا نے مصر، شام، عراق، شرق اُردن اور فلسطین کے متعلق اپنے گہرے تاثرات کا اظہار بھی فرمایا۔ انھوں نے جمال عبدالناصر، مفتیٔ فلسطین، شاہ حسین اور قاسم کے متعلق معلومات افزا باتیں بتائیں۔

میں نے جب ان سے پُوچھا کہ کیمونزم کس حد تک عرب ممالک کو متاثر کر رہا ہے اور کیمونزم کا مستقبل کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ عراق میں جس طرح کیمونزم نے اپنا ہاتھ رکھا ہے اس سے کیمونزم کے مستقبل کو بہت دھکّا لگا ہے۔ لوگ کیمونزم کو عملی میدان میں سرگرمِ عمل دیکھ کر کانپ اُٹھے ہیں۔ حضرت مولانا نے میرے ایک سوال کے جواب میں یہ بھی کہا کہ مصر میں ایک منظم تبلیغی ادارہ ہے۔ جو افریقہ کے حبشیوں میں کامیابی سے کام کر رہا ہے۔ جماعت اسلامی کا لٹریچر بھی عربی زبان میں منتقل ہو رہا ہے، اس کے اثرات مستقبل میں خوش گوار ہوں گے۔

اسلام اور مسلمان — دَورِ حاضر میں

۲۵؍ فروری ۱۹۶۲ء کے ہفت روزہ " شہاب " لاہور میں یہ انٹرویو" مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے ایک انٹرویو "کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا۔ انٹرویو سے پیشتر ذیل کا نوٹ درج تھا:

" پچھلے دنوں ایک رسالے (؟) کے نمائندے نے اپنے خاص نمبر کے لیے مولانا مودودیؒ سے مختلف مسائل پر ایک انٹرویو لیا تھا، اُسے قارئینِ شہاب کی دل چسپی کے لیے ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔"

س: اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کے دو شعبے ہیں۔ ایک معاش (دنیوی زندگی) دوسرے معاد (اُخروی زندگی) ان کا باہم کیا رشتہ ہے؟

ج: اسلامی نقطۂ نظر سے دراصل انسانی زندگی ناقابلِ تقسیم ہے۔ انسان نے معاش اور معاد کو دو شعبوں میں محض افہام وتفہیم کی خاطر تقسیم کیا ہے۔ فی الحقیقت معاش اور معاد کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ اسلام کے نزدیک معاد میں انسان کو انہی نتائج سے سابقہ پیش آتا ہے جن کے لیے اس نے معاش میں سروسامان کیا ہو۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ معاش غلط ہونے پر معاد صحیح ہو۔ لازماً معاد کی صحت معاش کی صحت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام نے معاش کے مسائل کا کیا حل پیش کیا ہے یہ بہت تفصیل

طلب ہے۔ مختصر بات یہ کہ اسلام دُنیا میں زندگی گزارنے کے اُصول وضوابط اور حدود بیان کرتا ہے جو قرآن وسنّت میں واضح طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی پابندی معاش کے درست ہونے کی ضامن بھی ہے اور معاد کی بھی۔

س: کیا اسلام میں کوئی ایسا نظریہ اور واضح پروگرام ہے جس سے زندگی کے ہر شعبے پر روشنی پڑ سکے اور ہم اپنی معاشرت کے ہر گوشے کو جانچنے کے لیے کوئی ایسا معیار دریافت کر سکیں جو ہماری مشکلات کا آخری حل ہو؟

ج: آپ کا دُوسرا سوال تفصیل طلب ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے ہم کو خُدا پرستی، آخرت پر یقین اور رسالتؐ کے اتباع کا مستقل نظریہ دیا ہے اور اس نظریے کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں۔ ہمارے لیے انفرادی واجتماعی زندگی کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار اگر کوئی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم کس حد تک اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوئے رسولِ خدا کی دی ہوئی ہدایات کا پابند بناتے ہیں؟

مولانا ابھی اِنہی دُو سوالوں کے جوابات لکھوانے پائے تھے کہ کچھ مہمان آ گئے۔ اب موضوعِ سخن یوں بدلا۔ ایک نے استفسار کیا:-

س: کیا وہ شخص جو گھوڑے پر سوار ہو اور دستِ سوال دراز کرے اس کی حاجت روائی کرنا مناسب ہوگا؟

ج: مولانا نے فرمایا کہ سوال اس کا نہیں کہ وہ پیدل ہے کہ سوار، دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا احتیاج ہے جس نے اسے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ بظاہر سفید پوش یا ہٹا کٹا ہے، یا اس کے برعکس اس کے بدن پر چیتھڑے ہیں اور جسم نحیف ونزار ہے۔ یہ کوئی معیار نہیں ہے اس بات کا کہ اعانت کا مستحق کون ہے اور کون نہیں؟ بے روزگاری میں بھلے چنگے ہٹے کٹے

جب انھیں کوئی راستہ زندگی بسر کرنے کا نظر نہیں آتا بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔

بات سے بات نکلی ، مسلمانوں کی زبوں حالی اور بے حسی کے پیشِ نظر یہ کہا گیا کہ اِن دنوں عیسائیت بہت فروغ پا رہی ہے مولانا نے فرمایا :

"اِسلام کی رواداری کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ وہ غیر مذہب کے لوگوں کو اس بات کی کُھلی چھٹی دے دے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مذہب کو خریدنے کی بھی کوشش کریں ۔ عالم یہ ہے کہ مشنری کالجوں اور اسکولوں میں ترجیحی سلوک ہو رہا ہے ۔ مثلاً عیسائیوں سے فیس بہت کم لی جاتی ہے یا نہیں لی جاتی اور مسلمانوں سے بھاری بھاری رقمیں وصول کی جاتی ہیں ۔ یا مشنری ہسپتالوں میں دیکھیے کہ عیسائیوں کی بغیر فیس کے دوا دارو کی جاتی ہے ۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی کھال اُدھیڑی جاتی ہے ۔ غرض کہ پاکستان میں عیسائیوں کا زندگی کے جن جن شعبوں میں اثر و نفوذ ہے وہ ان کے ذریعے عیسائی اور غیر عیسائی لوگوں کے درمیان ترجیحی سلوک روا رکھ کر غیر عیسائیوں یعنی خاص کر مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا :

"اِس قباحت کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں اُن میں سے بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم بجان و دل شعائرِ اسلام کی تعمیل نہیں کرتے ۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی کسی پارک یا کُھلے مقام پر نماز پڑھنے سے شرماتا ہے ۔ یا ہمارے پڑھے لکھے حضرات بسا اوقات احکامِ شرعیہ کو ذاتی اغراض و مصالح کے لیے نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ دراصل یہ جو کچھ ہو رہا ہے مسلمانوں کی قوتِ ارادی کے کمزور ہونے کا نتیجہ ہے ۔ اگر ہمارا آدمی ارادے کا پکّا

اور دُھن کا سچّا ہو تو ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے۔ گاندھی کو دیکھیے جب سے لنگوٹی باندھی، کپڑے اُتارے اور اپنی بکری کو اپنے ہمراہ لیا، زمانے میں سینکڑوں انقلاب آئے، رنگ بدلے مگر ایک نہیں بدلی تو گاندھی کی وضع نہیں بدلی۔ حتّٰی کہ وہ یہی لنگوٹی باندھے ہوئے شاہِ انگلستان سے بھی مل آیا۔ حالاں کہ دربار کے رکھ رکھاؤ کے یہ خلاف تھا مگر گاندھی کر گزرا۔ یا سکھوں کو دیکھیے، ڈاڑھی کو نہیں چھوڑا، زندگی کے ہر شعبے میں گئے۔ حکومت کی بڑی بڑی کلیدی آسامیوں پر فائز ہوئے مگر کسی کو ان کی ڈاڑھی پر اعتراض کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اصل میں زمانے کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ ڈھالنے والوں سے جس رنگ میں چاہیں ڈھل جاتا ہے اور ڈھلنے والوں کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔"

مولانا سے ٹیڈی بوائز کے سلسلے میں استفسار کیا گیا، آپ نے کہا:

"یہ بات یاد رکھیے کہ نقّال تا وقتیکہ اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں کم تر نہ سمجھے جس کی نقالی مقصود ہے، نقالی نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ ٹیڈی بوائز کا نقالی کرنا ہماری ذہنی غلامی کا آئینہ دار ہے۔ غلامی میں اپنی چیزیں خواہ کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہوں خود اپنی نگاہوں سے گر جاتی ہیں۔ اس کے برعکس حاکموں کی چیز میں چاہے لاکھوں عیب ہوں محکوموں یا غلاموں کو وہ بھلی نظر آتی ہیں۔"

س: کیا اسلام لوگوں کے لیے ایک زندہ معنویت کھو بیٹھا ہے یا لوگ اسلام کی زندہ معنویت کھو بیٹھے ہیں؟

ج: اسلام نے اپنی معنویت کبھی نہیں کھوئی۔ البتہ لوگوں نے اس کی معنویت کھو دی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حفظِ صحت کے اصول اپنی جگہ اٹل ہیں۔ ان کی معنویت ان کی ذات میں ہر آن موجود ہے البتہ اگر ان اُصولوں کے خلاف زندگی بسر کر کے بیمار ہوں تو وہ خود ان کی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔

س: کیا یہ صحیح نہیں کہ دُنیا کے خصوصًا دَورِ حاضر کے مسلمانوں کے مسائل پیدا ہی اسی لیے ہوتے ہیں کہ وہ اسلام کو زادِ راہ کی بجائے امرت دھارے کی طرح استعمال کرتے ہیں؟

ج: دورِ حاضر کے مسلمان بالعموم، اب اسلام کو امرت دھارے کے طور پر بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ اُنھوں نے اسے ایک تعویذ یا منتر سمجھ لیا ہے کہ محض اسے گلے میں لٹکا لینے یا اس کے الفاظ جَپ لینے سے سب بلائیں دُور ہو جائیں گی۔

س: ہمیں تعلیم کا موجودہ نظام کس طرف لیے جارہا ہے؟ اس سے ہمیں شعور و آگہی میسّر آرہی ہے یا گمراہی اور الحاد و بے دینی؟ آپ کے نزدیک تعلیم میں کس بات کو اہمیت دینی چاہیے، تعلیم اور اخلاق میں باہم کیا رشتہ ہے؟

ج: تعلیم سے مُراد اگر وہ تعلیم ہے۔ جو ہماری یُونی ورسٹیوں اور کالجوں میں دی جارہی ہے تو وہ ہمیں روز بروز اپنے آپ سے بے گانہ کر رہی ہے۔ وہ ہمیں مسلمانوں کا سا شعور نہیں بلکہ ایک غیر مسلم کا سا شعور دے رہی ہے۔ بلکہ غیر مسلم کا شعور بھی وہ نہیں جو انگلستان میں انگریزوں اور امریکہ میں امریکیوں کو دیا جاتا ہے، بلکہ وہ شعور جو بیرونی حاکم اپنے محکوموں کو دینا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس تعلیم کے ذریعے سے اپنی قومی خودی اور غیرت بھی کھو رہے ہیں اور ہمارے اندر کوئی قومی سیرت بھی پیدا نہیں ہو رہی ہے۔

تعلیم اور اخلاق میں وہی رشتہ ہے جو غذا اور قوتِ حیات میں ہے۔ اگر کوئی غذا قوتِ حیات پیدا نہیں کرتی تو وہ صحیح غذا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی تعلیم صالح اخلاق نہیں پیدا کرتی تو وہ صحیح تعلیم نہیں ہے۔

س: اسلام میں دین اور سیاست کس معنی میں ایک ہیں؟

ج: اِسلام غیر دینی سیاست کو شیطنت سمجھتا ہے۔ اس کا منشاء دینی سیاست

قائم کرنا ہے ۔یعنی حکومت اور اس کے حکمران پہلے خود خُدا اور رسولؐ کے تابعِ فرمان ہوں پھر انہیں حق پہنچتا ہے کہ حکومت کریں ۔

س : کیا نزولِ وحیِ قُرآنی کا مقصود زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہدایت مہیا کرنا ہے ؟ اگر ایسا ہو تو کیا ہدایت نصوص قُرآنی سے حاصل ہوتی ہے یا تعبیر نصوص سے ؟

ج : وحی قرآنی کے نزول کا مقصود اگر دنیا کی زندگی میں انسان کی رہنمائی کرنا نہ ہو تو پھر اس کا نزول سرے سے ہی بے معنی ہے۔

نصوصِ قُرآنی سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے لامحالہ یہ ضروری ہے کہ ان کے معنی سمجھے جائیں ۔معنی سمجھے بغیر نصوص کے الفاظ سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی ۔البتہ فرق جس چیز سے واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہم قُرآن سے اس کا منشا معلوم کرتے ہیں یا قُرآن کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالتے ہیں ۔ پہلی صورت میں ہم اس سے رہنمائی حاصل کریں گے ، دُوسری صورت میں ہم اس کی رہنمائی کا منصب سنبھال لیں گے ۔

س : مسلمانوں کی تاریخ تمام تر اسلام سے اِبا، انحراف، سرکشی اور بغاوت اور انکار کی تاریخ ہے ۔ اگر ایسا ہو تو کون سے اُصول میں اِس بات کی ضمانت ہے کہ تاریخ کا رُخ اسلام کے اتباع کی طرف پھیرا جا سکتا ہے ؟

ج : یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ سراسر اسلام سے انحراف وبغاوت کی تاریخ ہے ۔مسلمانوں نے اسلام کا اتباع بھی کیا اور اس سے انحراف بھی کرتے رہے ۔ اتباع کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں اور انحراف کے نتائج بھی ۔اگر آج ہم صحیح تعلیم و تربیت کا نظام قائم کرلیں تو ممکن ہے کہ انحراف ختم ہوجائے ۔

ہمارا نظامِ تعلیم

جناب مسکین حجازی نے "ہمارا نظامِ تعلیم" کے موضوع پر مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے انٹرویو لیے۔ یہ انٹرویو ہفت روزہ "شہاب" لاہور میں ۸ر اپریل ۱۹۶۳ء کو شائع ہوئے۔ یہاں انٹرویوز کا تعارف اور مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب کا انٹرویو دیا جارہا ہے۔

نظامِ تعلیم کی مختلف لوگوں نے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ تعلیم کا مفہوم بھی بڑا وسیع ہے۔ عام طور پر نظامِ تعلیم سے مُراد یہ ہے کہ کسی ملک کے تعلیمی اداروں میں کیا کچھ، کس طرح، کس مقصد کے تحت پڑھایا جاتا ہے۔ اصطلاحات اور ان کے معانی کی تفصیلات سے قطع نظر، کسی نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ ملک کے مخصوص حالات اور روایات کے مطابق اس کے تقاضے پورے کرسکے۔ بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ نظامِ تعلیم کی مقصدیت کے سلسلے میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگ پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم دُوسرے ملکوں کے نظام ہائے تعلیم کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا مطمحِ نظر "بہترین شہری" پیدا کرنا ہے۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم یہ مقصد پُورا کرتا ہے یا نہیں۔

مسٹر ایرک ڈکنسن (سابق صدر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور) نے ایک بار "آل انڈیا محمڈن کانفرنس[1]" علی گڑھ میں لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا: "اگر ہم یہاں کی ایک یا دو مشہور یونیورسٹیوں کے نصاب پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اُن میں ایک چیز مشترک ملے گی۔ ایک ایسی چیز جو اُستاد اور شاگرد دونوں کی ایک کھوکھلی روایت بن چکی ہے، یعنی نصاب کی کتابوں کی مقررہ تعداد، جس سے باہر کچھ معلوم کرنے یا بتانے کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ جو لوگ (امتحان میں) یہ ثبوت مہیا کر دیتے ہیں کہ وہ مذکورہ کتابوں اور ان کے مندرجات سے آگاہ ہیں وہ ڈگریاں حاصل کرنے کے حق دار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب طالب علم فارغ التحصیل ہوتا ہے تو اس کی شخصیت، انفرادیت، غرض تمام صلاحیتیں غارت ہو چکی ہوتی ہیں۔ تاہم یہاں کے والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی نظامِ تعلیم کی بدولت ان کے بچے مستقبل میں مدبّر بنیں گے ــــ اس نظام کی بدولت نہیں ــــ اس کی موجودگی میں بظاہر "نامور شخصیتیں" ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان شخصیتوں کے سیاسی یا سماجی مرتبے کی بھڑک چمک سے مرعوب ہوئے بغیر انہیں قریب سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیم پُختہ ہیں۔ اور اگر ہم ان کے پاس ایسے مسائل لے کر جائیں جنھیں حل کرنے کے لیے صحیح قوتِ فیصلہ، وسیع النظری اور مہذب سمجھ بوجھ کی ضرورت ہو تو ہمیں مایوسی بھی ہوگی اور شرمندگی بھی۔

"کالج کیریر" طلبہ کو کوئی ایسی چیز دینے میں ناکام رہا ہے جس کی بدولت وہ صرف زندہ رہنے کے بجائے سچّی خوشی کے حصولِ زندگی اور اس کے مسائل کی تفہیم کے اہل ہو گئے ہوں۔

قومی تعلیم کمیشن نے ہمارے نظامِ تعلیم میں اہم اور دُور رس تبدیلیوں کی سفارش کی ہے۔ ان سفارشات پر عمل بھی شروع ہو چکا ہے۔ لیکن تبدیلیوں کا یہ مرحلہ بڑا کٹھن ہے۔ اسے خلوصِ نیت، انقلابی جذبہ اور پوری جدوجہد کے ساتھ طے کرنے کی

---

[1] دیکھیے "اسٹڈیز ان اینڈ لٹریچر" از ایرک ڈکنسن۔

ضرورت ہے۔ سفارشات کے الفاظ اور ان کی تعبیروں میں اُلجھنے کی بجائے اصلاح کے پیشِ نظر تبدیلیوں کے مقصد کی تکمیل ہونی چاہیے۔ ورنہ یہ تبدیلی ایک میکانکی تبدیلی ہو کر رہ جائے گی۔ اصلاح کا مقصد پورا کرنے کے لیے اُستاد اور شاگرد دونوں میں ایک نئے اندازِ فکر کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے نصاب بھی بدلنے پڑیں گے۔ اسلامی درس گاہوں کا مسئلہ اس کے علاوہ ہے۔ نصاب اور تدریس کی نوعیت کے اعتبار سے وہ بھی دوسرے تعلیمی اداروں سے مختلف نہیں۔ وہاں بھی مقررہ ومخصوص کتابیں صرف رٹائی جاتی ہیں۔ اوران سے فارغ التحصیل ہونے والوں کو قومی و مُلکی معاملات کی شُدبُد بھی نہیں ہوتی۔

تیسرا اہم مسئلہ مشنری اور خالص انگریزی اسکولوں کا پیدا کردہ ہے۔ یہ اسکول قائم تو پاکستان میں ہیں لیکن ان کی فضا انگلستان کی ہے۔ صاحبِ حیثیت پاکستانی اپنے بچوں کو انہی اسکولوں میں بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نظامِ تعلیم اور اس سے متعلقہ مسائل پر ماہرینِ تعلیم ہی بہتر طور پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ایرک ڈکنسن نے تو کہا تھا کہ یہاں کی نام ور شخصیتیں نیم پختہ ہیں۔ لیکن میں نے جن شخصیتوں سے رابطہ پیدا کیا ان کی پختگی یا غیر پختگی کا تو علم نہیں البتہ ان میں بیشتر اس مسئلہ پر — بوجوہ — اظہارِ خیال نہ کرسکے۔ جن حضرات نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ان کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

تعلیم، ان تمام معلومات اور تجربات کو جو ایک نسل کو پچھلی نسلوں سے پہنچی ہیں اور جو اسے خود اپنی زندگی میں حاصل ہوئی ہیں، زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے آئندہ نسل تک منتقل کرے، تاکہ وہ انسانی تہذیب و تمدّن کو اور زیادہ آگے بڑھانے کے

قابل ہو سکے۔ لیکن صرف اتنی تعریف سے بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی جب تک کہ ساتھ ساتھ یہ امر ملحوظ نہ رکھا جائے کہ تمام نوعِ انسانی میں انسانی روایات اور معلومات ایک ہی نوعیت کی نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں کے پیرووں نے ان معلومات و تجربات کو اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق مرتب و منظم کیا ہے۔ ان سے کچھ خاص نتائج نکالے ہیں اور ان نتائج کے مطابق ہی اس تہذیب کی صورت گری ہوئی ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ یہ بات تعلیم کے مقصد میں از خود شامل ہے کہ ایک قوم اپنی آئندہ نسلوں کے لیے اپنے دور تک کی تمام معلومات اور تجربات اس طرح مرتب کرے کہ جس سے اُس کی آئندہ نسلیں اس کی تہذیب سے واقف، اس کی قائل اور پیرو بن کر اُٹھیں اور آئندہ انہی خطوط پر ترقی کریں جو اس کی تہذیب سے مطابقت رکھتی ہوں۔ جو قوم یہ کام نہیں کرتی وہ خودکشی کا ارتکاب کرتی ہے۔ اور جو قوم اپنی آئندہ نسلوں کو اپنی تہذیب کے خلاف کسی دوسری طرز کی تہذیب پر تعلیم دیتی ہے وہ اپنی تباہی کا سامان کرتی ہے۔ اس کو صحیح معنوں میں تعلیم کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

تعلیم اسلامی دور میں

اسلامی دور میں تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن کر اُٹھیں اور دنیا میں تہذیب و تمدن کے نظام کو اس طرز پر چلانے کے قابل ہوں جو اسلام چاہتا ہے۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں کی تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم کو حاصل تھی۔ مزید برآں مسلمانوں نے دنیا کے وہ تمام علوم پڑھے اور پڑھائے جو دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے درکار تھے۔ مگر ان سارے علوم کو انھوں نے مسلمان بنایا پھر ان کو تعلیم میں داخل کیا۔

ایک مثالی نظامِ تعلیم

دُنیا میں جو بھی نظامِ تعلیم قائم کیا جائے اس میں بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتے ہیں اور آدمیت کا وہ کیا نقشہ ہے جس کے مطابق آپ لوگوں کو تعلیم و تربیت دے کر ڈھالنا چاہتے ہیں؟

بعض لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بالکل غیر جانب دارانہ تعلیم دی جانی چاہیے۔ تاکہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات اور حقائق کا بالکل معروضی مطالعہ کریں اور آزادانہ نتائج اخذ کر سکیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس طرح کا معروضی مطالعہ صرف کیمرے کیا کرتے ہیں انسان نہیں کر سکتے۔ انسان ان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہر حال اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ وہ مسائل، معاملات اور حقائق کے متعلق سوچنے کا ایک طرز اور ایک فکر رکھتا ہے۔ اور اسی فکر پر وہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے جسے ہم کلچر کہتے ہیں۔ اور ایک قوم کے لیے جس کے اپنے کچھ عقائد ہوں، اپنا نظریۂ زندگی ہو، اپنا اُصول ہو، لازم ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کو اس غرض کے لیے تیار کریں کہ وہ اس کے کلچر کو سمجھیں، زندہ رکھیں اور آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔

دُوسری چیز جو کسی نظامِ تعلیم میں بنیادی حیثیت کی حامل ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دین و دُنیا کی تفریق مٹا دی جائے۔ ایسے نظامِ تعلیم کے مطابق لازم ہے کہ انسان دُنیا کو سمجھے اور دُنیا کے سارے کام چلانے کے قابل ہو اور اپنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال سکے کہ کسی مرحلے پر بھی دین اور دُنیا میں ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ اور جب کبھی ایسا مسئلہ درپیش ہو تو دُنیا کو دین کے نقطۂ نظر سے سمجھا جائے۔

اِس سلسلے میں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ایک اور چیز تشکیلِ سیرت ہے۔ وہ نظامِ تعلیم جس کا مقصد محض کتابیں پڑھانے اور علوم و فنون سکھا دینے سے حل ہو سکتا ہے

کبھی مثالی نظامِ تعلیم نہیں کہلا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تشکیلِ سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے جس کے نتیجے میں بنیادی انسانی اخلاقیات پیدا ہوں گی اور معاشرے کی تعمیر صالح بنیادوں پر رکھی جا سکے گی، اور قوم کے وہ تمام تقاضے پورے ہو سکیں گے جو ایک آزاد اور ترقی پسند قوم کو درپیش ہوتے ہیں۔

پاکستان کا مروّجہ نظامِ تعلیم

اگر مروّجہ نظامِ تعلیم سے مُراد وہ نظامِ تعلیم ہے جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا اور جسے ہم قیامِ پاکستان کے پندرہ سال بعد بھی بوجوہ سینے سے لگائے ہوئے ہیں تو معاف کیجیے اس سے مطمئن ہونے کا سوال تو درکنار ایک پاکستانی اور خصوصًا مسلمان کے لیے یہ نظامِ تعلیم شرمناک ہے۔ اِس نظامِ تعلیم کو رائج کرتے وقت انگریز کے پیشِ نظر یہ تھا کہ وہ اِس ملک میں ایسے آدمی تیار کرے جو باہر سے آکر حکومت کرنے والی قوم کے بہتر سے بہتر آلۂ کار بن سکیں۔ اس کو یہاں ایسے آدمی درکار تھے جو اس کی زبان سمجھتے ہوں، جو اس کے ان اُصولوں کو جانتے اور سمجھتے ہوں جن پر وہ مُلک کا نظام چلانا چاہتا تھا، اور جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اس سرزمین میں انگریز کی منشا کو خود انگریز کی طرح پُورا کر سکیں۔ یہ اسی نظامِ تعلیم کا اثر ہے کہ آج ہم اپنی روایتی فرض شناسی، مستعدی، جفاکشی، صبر و ثبات، عزم و استقلال، باقاعدگی و باضابطگی اور ضبطِ نفس سب کچھ بھول چکے ہیں، قومی کردار تباہ ہو چکا ہے اور مغربی قوموں کی تقلید میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ دینی و ملّی غیرت کا جنازہ اپنے ہاتھوں نکالنے پر تیار ہیں۔

موزوں نظامِ تعلیم

ہمیں ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کرنا چاہیے جو ایسے افراد تیار کرے جو ہماری

قومی تہذیب کو جو دین کے سوا کچھ نہیں، اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ اس کے اُصولوں کو خوب جانتے ہوں، ان کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہوں، اس کے مطابق مضبوط سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق کے مالک ہوں۔ ان کی قابلیت اس نہج کی ہو کہ اجتماعی زندگی کے پُورے کارخانے کو ہماری اس تہذیب کے اُصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔ اور یہ نظامِ تعلیم ایسا ہو جو آنے والی نسلوں کو اگر سول سروس کے امتحان کے لیے تیار کرے تو ساتھ ساتھ انہیں امام، مفتی اور علمائے دین بھی بنا سکے۔

اِن مقاصد کے حصُول کے لیے ضروری ہے کہ ہم بچے کی تعلیم کا آغاز اس طرح کریں کہ اس کے ذہن پر یہ ثبت ہو جائے کہ یہ دُنیا ایک خُدا کی سلطنت اور ایک خُدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خُدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں۔ اور جو کچھ بھی ہے خُدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے۔

یاد رکھیے جب تک آپ قُرآن و حدیث کا دامن نہیں تھامتے بچّوں میں وہ اسلامی رُوح پیدا کر سکنے سے قاصر ہیں جو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ان اداروں سے پڑھ کر نکلنے والے کسی طور بھی قومی قیادت کرنے کے قابل نہیں بن سکتے۔ وہ اسی طرح رشوتیں کھائیں گے، اسی طرح بددیانتی اور خیانت کریں گے جیسا کہ آج ہو رہا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ علومِ حاضرہ کو چھوڑ دیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے، آپ ان تمام علوم کو اپنائیے، جو آج دُنیا میں پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے پڑھانے سے قبل بچّے کے ذہن کو اسلامی اقدار، اسلامی عقائد اور اسلامی اخلاقیات پر اس قدر پختہ کر دیجیے کہ اس کا ذہن کسی مرحلے پر بھی شک و شبہ کا شکار نہ ہو سکے۔ اس کا عمل کسی صورت میں بھی اسلام کے خلاف نہ ہو۔

تاریخ کی تعلیم میں ضروری ہے کہ ہمارے طلبہ نہ صرف قوم و ملک کی تاریخ پڑھیں بلکہ اس کے ساتھ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہوں، اور وہ ثانوی تعلیم ختم کرنے

سے پہلے ہی یہ جان لیں کہ اسلام ایک ازلی وابدی تحریک تھی، ساتویں صدی میں یکایک شروع نہیں ہوگئی تھی۔ انھیں ان مثالی شخصیتوں سے روشناس کرایا جائے جو ان کے لیے معیارِ انسانیت کا درجہ رکھتی ہوں تاکہ جب وہ عملی دُنیا میں قدم رکھیں تو اپنی قومی تہذیب کے احترام کے جذبے سے سرشار ہوں لیکن سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو فکرِ اسلامی اور نظامِ اسلامی سے واقف ہوں، جو رُوحِ اسلامی سے سرشار اس نظام کو قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ ورنہ وہ لوگ جو نہ اسلام سے واقف ہوں نہ اس کے نظامِ تعلیم سے، نہ اس کے قیام کے خواہاں، ایسا نظام تعلیم قائم کرنے سے قاصر رہیں گے جو ہماری دینی اور دُنیاوی احتیاجات کا حل ہو۔

اربابِ تعلیم

میں اپنی تعلیم گاہوں کے موجُودہ ماحول سے کسی صورت مطمئن نہیں۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگیت کے مظاہر، یہ از فرق تا بقدم مغربی تہذیب وتمدّن کا غلبہ، یہ کالجوں کے مباحثے اور انتخابات کے طریقے، اگر یہ سب کچھ آپ کے ہاں یُوں ہی جاری رہے اور ان میں سے کسی چیز کو بھی بدلنے پر آپ راضی نہیں تو اس ذہنی وتہذیبی غلامی کے ماحول میں ایک آزاد مسلم مملکت کے وہ باعزت شہری اور کارکن کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے جنھیں اپنی قومی تہذیب پر فخر ہو۔

اگر آپ ایک ایمان دار اور باضمیر قوم تیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ تمام نظام بدلنا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگی طرزِ زندگی سب چھوڑنا ہوگا۔ اس کے لیے ایسے معلّمین اور معلّمات کی ضرورت ہے جو سیرت واخلاق اور اعلیٰ قابلیت کے حامل ہوں۔ یاد رکھیے فاسدالعقیدہ اور فاسدالاخلاق اُستاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی، اخلاقی اور عملی تربیت نہیں دے سکتے جس کی ہمیں نئے دَور کے لیے ضرورت

ہے۔تعلیم اگر بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا ستیاناس کردے گی۔اس لیے اگر ہم اپنی قومی زندگی کو خرابیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے اسکولوں، کالجوں اور یُونی ورسٹیوں کے ماحول کی تطہیر سے اس کا آغاز کرنا ہوگا۔

مذہبی درس گاہیں

دراصل اِن درس گاہوں کو مذہبی درس گاہیں کہنا ایک غلط فہمی ہے۔ان درس گاہوں میں جو نظامِ تعلیم زیرِ عمل ہے وہ دراصل مذہبی نہیں بلکہ سول سروس کا نظام تھا۔جو قدیم دَور میں مسلمان حکومتوں کی ضروریات کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔اس نظامِ تعلیم کی افادیت عملاً اُسی دن ختم ہوگئی تھی جس دن انگریزی حکومت یہاں مُسلط ہوئی۔ لیکن چوں کہ اس میں ہماری مذہبی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے بہت کچھ سامان موجود تھا، دُوسرے ہم اپنی آبائی میراث سے بالکل منقطع نہیں ہونا چاہتے تھے، اس لیے ہم نے اسے سینے سے لگا لیا اور بوجوہ کسی تغیّر و تبدّل کے بغیر اس کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔یہی وجہ ہے کہ اِس نظامِ تعلیم کے مطابق تعلیم پانے والے عملی زندگی میں کوئی نمایاں حصّہ نہ لے سکے اور وہ وقت کی زندگی اور اس کے مسائل سے ناآشنا رہ گئے۔سوائے اس کے کہ وہ مسجدیں سنبھال لیں یا وعظ گوئی کا پیشہ اختیار کریں زمانے کا ساتھ نہ دے سکے۔

قابلِ توجّہ مسئلہ یہ ہے کہ اس نظام کے تحت تعلیم پانے والوں کی طرف سے جب زمانے نے بے اعتنائی برتنی شروع کی تو انھوں نے نزاعی مسائل کو اُبھارا تاکہ قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی رہے اور اس طرح یہ لوگ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کرسکے اور نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اُصولوں کو منطبق کرسکے۔

جیساکہ قبل ازیں عرض کرچکا ہوں کہ یہ نظامِ تعلیم سے ہم دینی نظامِ تعلیم سمجھے

ہوئے ہیں اور جس سے مذہبی پیشوا اور علمائے دین تیار کرنے کا کام لیا جا رہا ہے، دراصل آج سے دو اڑھائی سو برس پہلے کی سول سروس کی تعلیم ہے۔ جس میں زیادہ تر اس وجہ سے دینی تعلیم کا جوڑ لگایا گیا تھا کہ اس وقت ملک کا قانون اسلامی فقہ تھی اور اُسے نافذ کرنے والوں کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔ اور آج ہم اسے غنیمت سمجھ کر اس کو اپنی دینی تعلیم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو یہ دین کی ضروریات پوری کر سکے اور نہ ہی زمانے کے موجودہ درپیش مسائل کا حل۔

موجودہ مذہبی درس گاہوں کے نظام میں تبدیلیاں

جیسا کہ قبل ازیں کسی سوال کے جواب میں کہہ چکا ہوں کہ دین و دنیا کی تفریق ختم کر دی جائے اور ایسا نظامِ تعلیم نافذ کیا جائے جو بیک وقت ہمارے لیے پیشوائے دین، سکرٹری، ڈاکٹر تیار کر سکے۔ ہماری ساری قومی ضروریات کو بیک وقت پورا کر سکے۔ اس موجودہ تعلیمی نظام کو ختم کر دے جو دین و دنیا کی تفریق کے گمراہانہ نظریے پر مبنی ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا یہ انٹرویو جناب الطاف حسن قریشی کے قلم سے ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ" لاہور کے سالنامہ نومبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ جناب الطاف حسن قریشی نے اُردو ادب و صحافت میں انٹرویو نگاری کی جو جدید روایت قائم کی ہے یہ اُس کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کی تلخیص ہفت روزہ "ایشیا" لاہور کے ۱۴ ر اور ۲۱ ر نومبر ۱۹۶۲ء کے شماروں میں پیش کی گئی۔ بعد میں اسی انٹرویو کو انھوں نے اپنی تالیفات "ملاقاتیں" اور "مقابل ہے آئینہ" میں بھی شامل کیا۔

تعارف

آج سے تقریباً سترہ سال پہلے کی بات ہے کہ میری عمر صرف بارہ تیرہ سال کی تھی اور میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سال کے وسط میں ہماری جماعت کے لیے ریاضی کے نئے اُستاد آئے۔ ان کا نام چودھری نظام الدین تھا۔ ان کی شخصیت نہایت سادہ لیکن بے حد جاذب تھی۔ میں اُن کی طرف کھنچتا گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ میں اکثر اُن کے ہاں جایا کرتا تھا۔

چودھری صاحب کو اُردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور مجھے بھی بچپن ہی سے

شعر وادب سے دل چسپی تھی ۔ ہم اکثر ادبی، علمی اور دینی مسائل پر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ۔ یہ گفتگوئیں مجھے اچھی اور معلوماتی کتابوں کے مطالعے پر اُبھارتی رہتی تھیں ۔

اکتوبر کی ایک صبح کو میں نماز پڑھتے ہی چودھری صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہ چولھے پر چائے تیار کر رہے تھے ۔ جب چائے تیار ہوگئی تو انھوں نے مجھے بھی چائے کی پیالی دی اور خود بھی پینے لگے ۔ چائے تو پی ہی اس لیے جاتی ہے کہ آپس میں باتیں کی جاسکیں۔ چودھری صاحب کی باتوں کی حلاوت نے چائے کی مٹھاس میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا ۔ دَورانِ گفتگو میں مَیں پوچھ بیٹھا :

"آپ کے نزدیک آج کل اُردو کا سب سے اچھا نثر نگار کون ہے ؟"

" سیّد ابوالاعلیٰ مودودی" چودھری صاحب نے بے ساختہ جواب دیا۔ پھر اُنھوں نے ہاتھوں کو خاص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا :

" وہ اِس انداز سے لکھتا ہے کہ آگ لگاتا چلا جاتا ہے ۔"

نظام الدین صاحب کے یہ فقرے غیر شعوری طور پر میری کتابِ ذہن پر منقّش ہو گئے۔ میں اسکول کے کام سے فارغ ہو کر مودودی صاحب کی کتابیں پڑھتا اور چودھری صاحب ان کتابوں کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ۔ اِسی طرح دو تین سال بیت گئے ۔ پاکستان بنا اور ہم وقتی طور پر نواں کوٹ لاہور کے گرد و نواح میں آکر ٹھہرے ۔ غالباً یہ ۱۹۴۸ء کا آغاز تھا ۔ سردیوں کا موسم تھا ۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ مودودی صاحب سردار پورہ اچھرہ کی مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں ۔ ان دنوں میرے پاس سائیکل بھی نہ تھی ۔ میں پیدل نواں کوٹ سے سردار پورہ پہنچا ۔ مودودی صاحب کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں تمام نمازیوں کا طواف کر رہی تھیں ۔ نماز کے بعد مولانا نے درس کا آغاز سورہ بقرہ سے کیا ۔ مولانا میرے اس تصوّر کے قریب قریب نکلے جو میں نے ان کے بارے میں برسوں سے قائم کیا ہوا تھا ۔ مودودی صاحب سے پہلی بار تفسیرِ قرآن سُن کر مجھے کچھ

مایوسی ہوئی۔ نہ زورِ خطابت، نہ فلسفہ وحکمت کی باتیں، نہ عربی کی لمبی لمبی اور طویل عبارتوں کے حوالے۔ بس قرآن کے مفاہیم کا سیدھا سادہ اور مختصر بیان۔ تاہم میں مسلسل درس میں شریک ہوتا رہا اور میرے ذہن کے سانچے ٹوٹتے، پگھلتے اور نئے انداز میں ڈھلتے رہے۔

مجھے تلاشِ معاش میں لاہور سے باہر جانا پڑا اور زندگی کے جھمیلوں میں اتنا بکھر گیا کہ کچھ یاد نہ رہا۔ چار پانچ سال یہی کیفیت رہی۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں قدرت مجھے پھر لاہور لے آئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لاہور مارشل لاء کی آہنی گرفت میں تھا اور ملک کی سیاسی فضا میں اضطراب اور بے چینی کے بادل تیر رہے تھے۔ ۱۲ مئی ۱۹۵۳ء کی صبح کو اخبار آیا تو میری نگاہ اس سرخی پر پڑی:

"ابوالاعلیٰ مودودی کو فوجی عدالت نے سزائے موت کا فیصلہ سنادیا"

مجھے دفعۃً ماضی کے تمام واقعات یاد آگئے۔ مودودی صاحب کا باوقار، شگفتہ اور سُرخ وسفید چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ نہ جانے میرا اضطراب ہر لحظہ کیوں بڑھ رہا تھا۔ میں اسی عالم میں سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مسلم ٹاؤن کے قریب سے جو نہر گزرتی ہے، اس کے کنارے ٹہلتا رہا۔ میرا ہر قدم بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے مودودی صاحب سے کچھ زیادہ عقیدت بھی نہیں تھی، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ ایسے بلند پایہ نثر نگار اور جید عالم کو اس انداز سے سزائے موت دینا صریحاً زیادتی ہے۔ دل کی یہی آواز شعروں میں ڈھلنے لگی اور وہیں پندرہ بیس منٹ میں ایک غزل موزوں ہوگئی:

وہ اور ہی ہوں گے کم ہمت آلام ومصائب سہہ نہ سکے
شمشیر وسناں کی دھاروں پر جو حق وصداقت کہہ نہ سکے
اِک جذبِ حصولِ مقصد نے یوں حرص وہوا سے پاک کیا
ہم کفر کے ہاتھوں بک نہ سکے، ہم وقت کی رَو میں بہہ نہ سکے

تم دار و رسن کی منزل کو اربابِ تعیّش کیا جانو!
ہم جامِ شہادت پی پی کر وہ کہہ گئے، جو کچھ کہہ نہ سکے!
تھے تم سے زیادہ طاقت ور، پر چشمِ فلک نے دیکھا ہے
توحید کا طوفاں جب اُٹھا، وہ مدِ مقابل رہ نہ سکے
الطافِ محبت اور ہے کیا جُز سوزِ دروں، جُز دردِ نہاں
وہ پچھلے پہر کے نالے بنے، جو آنکھ سے آنسو بہہ نہ سکے

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اشکوں کا یہ سیلاب کسی طرح رُکتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نہر کے پُل پر بیٹھ کر بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رو دیا۔ حالاں کہ میں زندگی میں اس سے پہلے اپنی عزیز بہنوں کی موت پر بھی نہیں رویا تھا۔

اسی ذہنی کرب و اذیت میں پانچ چھ روز گزر گئے۔ اب صرف ایک ہی خواہش دل و دماغ میں جاگزیں تھی کہ مودودی صاحب کو ایک نظر دیکھا جائے۔ میں نے جیل میں اُن سے ملاقات کرنے کا انتظام کر لیا۔ ہم چار پانچ ساتھی مودودی صاحب کے سامنے کھڑے تھے۔ اُنھوں نے وہ خاص لباس زیبِ تن کیا ہوا تھا، جو موت کی سزا پانے والے قیدیوں کو پہنایا جاتا ہے۔ ہم سب افسردہ اور مایوس تھے اور ہمارے چہروں پر موت کی سی اُداسی پھیلی ہوئی تھی لیکن مودودی صاحب کے بُشرے پر اُمید کی شفق اور تبسّم کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ میں عالمِ حسرت و یاس میں پکار اٹھا:

"مولانا، اب کیا ہوگا؟"

مودودی صاحب نے ٹھہرے ہوئے اور پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا:

"اللہ تعالیٰ مجھے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے زندگی نہیں چھین سکتی اور اگر میرا وقت آن پہنچا ہے تو پھر مجھے کوئی بھی زندگی نہیں بخش سکتا۔ اس میں آخر گھبرانے کی بات ہی کیا ہے؟"

ان لفظوں نے میرے جسم میں ہمت و عزیمت کی برقی رَو دوڑا دی اور میں وہاں سے زندگی کی توانائیاں اور قوتیں لے کر ایک نئے عزم کے ساتھ واپس آیا۔

اس سے پہلے یہ خبر آ چکی تھی کہ مودودی صاحب نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس خبر کے کچھ دنوں بعد یہ خبر آئی کہ مودودی صاحب کی سزائے موت عمر قید کی سزا میں تبدیل ہو گئی ہے، لیکن قدرت کی حکمتیں نرالی ہیں۔ مودودی صاحب تین سال سے پہلے ہی رہا ہو کر آ گئے۔ اُس وقت یہ شعر بے ساختہ میرے ہونٹوں پر آ گیا تھا ؎

سزا کی طرح نئی ڈالیے کہ دیوانے
مقام دار و رسن سے گُزر کے آئے ہیں

اِنٹرویو

مودودی صاحب کی اِس بلندیِ کردار اور بے مثل استقامت نے میرے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا، لیکن اس تاثر پر وقت کی تہیں جمتی چلی گئیں۔ تاہم ابھی ایک آدھی چنگاری باقی تھی اور اسی چنگاری کی حرارت نے میرے ذہن میں مودودی صاحب سے اِنٹرویو لینے کی تحریک پیدا کی۔

مودودی صاحب کے لیے سوال نامہ مرتّب کرتے وقت مجھے خاصی دقّت پیش آئی۔ وہ ایک مفکرؔ، عالِم دین، ایک صاحب طرز نثر نگار و خطیب، ایک سیاسی تنظیم کے راہبر اور ایک معاشرتی مصلح کی حیثیت سے معروف ہیں اور پھر ان کی یہ ساری حیثیتیں ایک بڑی حیثیت میں مدغم ہو گئی ہیں۔ وہ بڑی حیثیت داعیِ اسلام کی ہے۔ مَیں نے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ سیاست کے موضوع کو گفتگو سے قطعی طور پر خارج رکھا جائے اور صرف " غیر سیاسی" باتیں کی جائیں، کیوں کہ ہمارے ملک کی فضا "سیاسی تذکروں"

کے لیے ساز گار نہیں اور ہمیں سیاست کے پیچ وخم کا شعور ہی کب ہے ۔ پھر سوچا یہ ادب بھی غیر ضروری سا ہے ۔ ادیبوں اور شاعروں نے قوم کو بے عملی کے انجکشن لگانے کے سوا اور دیا ہی کیا ہے ۔ اور اسلام ـــــ اس پر بھی باتیں سوچ سمجھ کر ہی کرنی چاہییں ۔کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ باتیں ہمارے بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہوں ۔ اور ہمارے ملکی مسائل ـــ یہ تو سب حل ہو چکے ہیں ، ان پر آخر کیا گفتگو کی جائے ۔
میں اسی فکر میں غلطاں تھا کہ خیال کی ایک اور رَو اُبھری ۔

" زندگی ایک مربوط تسلسل کا نام ہے ، اسے اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ زندگی ایک پودے کی مانند ہے جسے اپنی نشوونما کے لیے افکار کا رس ، شعروادب کی شبنم ، سیاست کی تمازت اور سر پھروں کا خونِ جگر درکار ہے ۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو نکال لیجیے ، زندگی کا پَودا مُرجھا جائے گا ۔"

اس خیال کے آتے ہی میں نے " بھرپور " سوال نامہ مرتّب کیا اور تین نشستوں میں مودودی صاحب سے ان سوالات کے جوابات حاصل کیے ۔ انٹرویو کے دَوران میں اُن کی شخصیّت کے کئی چھپے ہوئے گوشے اُجاگر ہوئے ۔ ایسے گوشے جو بعض حضرات کے لیے دل چسپ ہوں گے اور بعض کے لیے مایوس کُن اور کچھ کے لیے حیرت زا ۔ میرا تاثراتی احساس ان تینوں احساسات سے جُدا ہے ۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس احساس کا نام کیا ہے ۔

مودودی صاحب ہمیں (میرے ساتھ تین ساتھی اور تھے) اپنے ملاقات کے کمرے میں لے گئے ۔ معلوم ہوتا ہے یہ کمرہ ان کا اسٹڈی روم بھی ہے ، آفس بھی اور لائبریری بھی ۔ کمرے کے اندر چاروں طرف الماریاں تھیں جن میں مختلف زبانوں کی ضخیم اور نایاب کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں ۔ کمرے کے مرکز میں ایک بڑی میز بچھی ہوئی تھی جس پر کتابیں ، رسالے اور لکھنے پڑھنے کے کاغذات ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے ۔ صاف ستھرا ، خاموش اور سادہ کمرہ

مکین کی کچھ صفات و خصائص کا پتا دے رہا تھا۔ صفات اور خصائص کے خاکے میں رنگ آپ اپنے ذوق اور پسند کے مطابق بھر لیجیے۔ کیوں کہ یہاں ایسے اشخاص کی کمی نہیں جنھیں "بے ترتیبی" میں "حُسن" اور "انتشار" میں "سُلجھاؤ" نظر آتا ہے اور جن کے نزدیک "قرینہ" ہی زندگی کے جسم کا سب سے بڑا ناسُور ہے۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت

اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے مودودی صاحب سے سب سے پہلے وہی سوال کیا جو مَیں ہر "عظیم شخصیت" سے سب سے پہلے کرتا آیا ہوں، یعنی:

"ابتدائی زندگی کے دل چسپ واقعات، والدین کی تربیت کا تشکیلِ سیرت پر اثر، اور بچپن کی معصوم خواہشیں۔"

مولانا نے قدرے 'پس و پیش' کے ساتھ کتابِ زندگی کے چیدہ چیدہ اوراق پلٹنے شروع کیے:

"میں نے ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد (انڈیا) کے مقام پر ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو برِّصغیر پاک و ہند میں انگریزی طرزِ زندگی اختیار کرنے میں پیش پیش تھا۔ علی گڑھ کالج کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے سرسیداحمد خاں نے ایک "مدرسۃ العلوم" قائم کیا تھا۔ میرے والد مرحوم اس مدرسے کے اوّلین طلبہ میں سے ایک تھے، اور وہ قدرتی طور پر سرسید کی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے، لیکن ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیانی وقفے میں ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ اس مغربی تعلیم نے ان کی زندگی کو اسلام کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اس احساس کی بدولت اُن میں ایک عظیم انقلاب رُونما ہوا۔ وہ اب مغربی تہذیب اور اس کی اخلاقی قدروں سے سخت متنفّر ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی پُوری زندگی کو مغربی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی

اور انھوں نے اس معاملے میں اتنا سخت رویّہ اختیار کیا کہ مجھے مدّت تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انھیں انگریزی بھی آتی ہے، تاہم جدید تعلیم کی وجہ سے جو خاص قسم کی سُتھرائی پیدا ہوجاتی ہے، وہ آخر وقت تک باقی رہی۔

"مولانا،" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ اُن میں یہ انقلاب کیوں کر آیا؟"

مودودی صاحب نے آہستہ سے کھنکھارتے ہوئے جواب دیا:

"میں قطعیت کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ میرے بڑے بھائی نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، تاہم میرا یہ اندازہ ہے کہ دینی کتب کے مطالعے سے انھیں یہ احساس ہوا کہ ہم میں کیا تغیرات رونما ہوگئے ہیں۔"

مولانا ایک نرم رَو جُوئے آب کی مانند آگے بڑھ رہے تھے۔

"میرے خاندان کے متعلق دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اس خاندان کو سخت دشواریوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے تشدد نے اِس خاندان کے افراد میں انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت پیدا کردیا تھا۔ اسی رچے بسے جذبے کے تحت والدمرحوم انگریزی ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس ماحول میں پروان چڑھنے کے باعث میرے دل میں انگریزی ملازمت کی طرف کبھی میلان پیدا نہیں ہوا۔

والدمرحوم میری تربیت پر خصوصی توجّہ دیا کرتے تھے۔ وہ میری زبان اور اخلاق کو معیاری، سُتھرا اور پاکیزہ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصّے، تاریخِ اسلام اور تاریخِ ہند کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔ وہ میری عادات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی ملازمہ کے ایک بچّے کو مارا تو اُنھوں نے اس بچّے کو بلاکر کہا کہ تو بھی اسے

مار۔ مجھے اِس سے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کبھی کسی زیرِ دست پر نہیں اُٹھا۔"

مولانا کے آخری لفظوں نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں نے حسرت بھری نظروں سے ماضی کے نشانات کو دیکھا۔ کتنے اچھے تھے وہ والدین! بچّوں کی تربیت ان کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور ہماری اس نئی پود کے والدین ـــــ اُف توبہ ـــــ بچّوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ان کے فرائض ہی میں شامل نہیں۔ انھیں زر پرستی اور عیش کوشی سے اتنی فراغت کہاں نصیب کہ بچّوں کی ذہنی اور اخلاقی درستی و اصلاح کی طرف متوجّہ ہوں۔ وہ فلمی گانوں کی لوریاں دے کر بچّوں کو سُلاتے ہیں۔ وہ ریڈیو کی دُھنوں پر مٹکتے، چھلکتے اور رقص کرتے ہیں۔ قرآن، سُنّت اور علمائے کرام کے اقوال سے بچّوں کے کان ناآشنا رہتے ہیں۔ وہ ذرا بڑے ہوتے ہیں تو نرسری اور کنڈر گارٹن کے سبز باغوں میں داخل کر دیے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے سوا اور سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ خوش حال گھرانوں کے بچّوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ تم حکم چلانے کے لیے پیدا ہوئے ہو اور خادموں اور ملازموں پر تشدّد کرنے ہی سے وقار اور رُعب قائم رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے کتنے بچّے خُدا ترس اور نیک سیرت انسان بن سکیں گے؟

مولانا اپنی مخصوص دھیمی آواز میں میرے سوالات کا جواب دیے جا رہے تھے۔

آغازِ تعلیم کے متعلق مولانا نے بتایا کہ گھر پر عربی پڑھی۔ اسکولوں اور کالج میں مختلف علوم زیرِ مطالعہ رہے۔ انگریزی زبان میں استعداد تعلیمی دَور کے بعد حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے کا مجھے کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ میں ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا اور میرے ذہن نے کبھی بھی مُستقبل کا کوئی حسین خاکہ نہیں بنایا، البتہ اس دَور میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ مُجھ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

جب میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اُس وقت میری عمر سولہ سترہ سال کی

تھی۔ اس کے بعد میں نے "آوارہ خوانی" شروع کی۔ جو کچھ ملا پڑھ ڈالا۔ ہر موضوع اور ہر عنوان پر ہر قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت ہی خطرناک نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اُٹھتا چلا گیا۔ تشکیک وارتیاب سے ایمان وایقان کی بنیادیں منہدم ہوگئیں۔ خُدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد لغو اور غیر منطقی نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال تک یہی کیفیت رہی۔

"مولانا، کیا یہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرت واستعجاب کے عالم میں پوچھا۔ ایک ہلکی سی مُسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ اُنھوں نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں میرے چہرے پر جمادیں۔ مَیں نے محسوس کیا کہ وہ مُجھ سے پوچھ رہی ہیں:

"تمھیں یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

میں گھبرا اُٹھا، مگر مولانا حالیؔ کے اِس شعر نے گھبراہٹ کو عقیدت میں تبدیل کر دیا:

تقاضائے محبّت ہے وگرنہ
مجھے اور جُھوٹ کا تم پر گماں ہو

مَیں نے عالمِ شوق وجستجو میں مولانا سے دریافت کیا:

"اِس کے بعد کیا ہوا؟"

مولانا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

"تذبذب وتشکیک کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ عربی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ میں نے قرآن اور حدیث کا براہِ راست مطالعہ شروع کیا۔ حقائق ومعارف کُھلتے چلے گئے، بے یقینی کا غبار دُھلتا چلا گیا۔ میں نے دُوسرے ادیان کی کتابوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ ادیان کے تقابلی مطالعے نے مجھے ایک گونہ اطمینان عطا کیا۔ دراصل اب میں نے اسلام سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مجھے اس کی حقانیت پر کامل یقین تھا۔"

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے مولانا کی نگاہوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوگئی تھی جیسے عرفان ویقین کا نُور عینک کے سپید شیشوں میں جھانک رہا ہو۔

س : "مولانا، اسلام کے پُورے نظامِ حیات کو اس کے اصلی خط وخال اور وسیع مفہوم کے ساتھ سمجھنے میں قرآن و حدیث کے علاوہ آپ کو اور کون سی کتابوں نے مدد دی؟"

ج : "ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں نے میرے ذہن کو پختہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔"

تصنیف وتالیف کا محرک

اِسی موضوع پر میں نے ایک اور سوال کیا:

"اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیوں کر آیا؟"

مولانا ایک منٹ کے لیے خاموش رہے اور پھر اپنے دوہرے جسم کو جنبش دیتے ہوئے کہنے لگے:

"اسلام کے موضوعات اور مسائل پر لکھنے کا خیال دو باتوں کی بناء پر پیدا ہوا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں شُدھی تحریک کا بانی سوامی شردھانند ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوا، جس پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور اُنھوں نے مسلمانوں اور اسلامی تعلیمات کے خلاف الزامات کا ایک طوفان برپا کردیا۔ جذبۂ قومیّت نے مجھے ان بُہتان تراشیوں اور دُشنام طرازیوں کے خلاف لکھنے پر اُکسایا۔ انھیں دنوں مولانا محمد علی جوہر جامع مسجد دہلی میں جمعے کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ ہر جُمعے اُن کی تقریر سننے کے لیے آتا تھا۔ ایک جمعے کے خطبے میں مولانا نے فرمایا کہ "اِس وقت اِس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی خُدا کا بندہ اسلام کے صحیح تصوّرِ جہاد پر ایک مبسُوط کتاب لکھے۔ جس میں جہاد کے خلاف اُٹھائے ہوئے تمام

اعتراضات اور الزامات کے مدلّل جوابات دیے گئے ہوں۔" میں نے دورانِ تقریر ہی میں یہ فیصلہ کرلیا کہ میں جہاد کے موضوع پر کتاب لکھوں گا۔ اس طرح اس کام کا آغاز جذبۂ قومیت سے ہوا، لیکن آگے چل کر یہ جذبۂ اسلام کی وسعتوں میں جذب ہوکر رہ گیا۔"

مولانا محمد علی جوہر کا ذکر آیا تو میں نے ان کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال کیا:

"مولانا، آپ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں؟ ایک طبقے کی رائے یہ ہے کہ وہ سادگی سے گاندھی جی کا فریب کھاتے رہے۔"

مودودی صاحب نے دُکھ کے ایک گہرے تاثر میں ڈوبتے ہوئے جواب دیا:

"ایک شخص کے مرنے کے بعد آپ جو چاہیں اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں، لیکن درحقیقت مولانا محمد علی جوہر مسلمانوں کے لیے سب سے گہرا درد رکھتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اس کے بعد سے پھر سچا دینی جذبہ رکھنے والا لیڈر پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے غلطیاں کی ہوں گی، لیکن مَیں نے بہت ہی کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو اسلام کے لیے اتنا گہرا اخلاص رکھتے ہیں۔ یہ اُن جیسے لوگوں ہی کے کردار کا اثر تھا کہ کسی کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے شعائر کا احترام اور ان پر عمل پیرا ہوئے بغیر وہ سیاسی لیڈر بن سکے۔"

میں نے دل میں سوچا، کتنا اچھا تھا وہ دَور جو بیت گیا۔ آج معاملہ بالکل اُلٹ ہوچکا ہے۔ "سیاست دان" کہتے ہیں: "بھلا سیاست کا دین سے کیا تعلق ہے۔ ایک متدین اور متقی شخص کو سیاست کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ "سیاست کے چھینٹے" اس پاک باز انسان کے صاف ستھرے لباس کو داغ دار بنا دیں۔"

بڑے بڑے لوگ اس بات کو اب اتنے زور اور بلند آہنگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ

ذہن اس فلسفے کو معقول اور صحیح سمجھنے لگا ہے ع

انقلابات ہیں زمانے کے

میں نے سوچنا بند کر دیا اور سوالات کرنے شروع کر دیے :

دین اور مذہب میں فرق

"مولانا دین اور مذہب میں کیا فرق ہے ؟"

"شریعت میں مذہب کا لفظ مکتبِ خیال (School of thought) کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن دین سے مُراد وہ پُورا ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جو خُدا اور اس کے رسُول ؐ نے ہمیں دیا ہے ۔"

نظامِ زندگی کے لفظوں نے میرے رہوارِ فکر کو ایک مہمیز لگائی اور میں نے فلسفیانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا:

اِسلام میں اجتہاد

"زندگی مسلسل متحرک ہے ۔ یہ بڑھتی، گھٹتی اور پھیلتی رہتی ہے ۔ اس کے خول میں بے پناہ لچک ہے ۔ اگر اسلام ایک نظامِ زندگی ہے تو کیا اس میں بھی لچک موجود ہے؟"

مولانا نے بے ساختگی کے عالم میں کہا:

"اس میں وہ فطری لچک موجود ہے جس کا تقاضا زندگی کرتی ہے ۔ اجتہاد اسی لچک کا دُوسرا نام ہے ۔ اجتہاد کے ذریعے سے اسلام زندگی کے ہر گلِ تازہ کی آبیاری کرتا ہے اور ہر نئے اُبھرنے والے گوشے کو روشنی فراہم کرتا ہے ۔ اسی بنا پر اسلام میں اجتہاد کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور ہر زمانے میں اس کی ضرورت رہی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اجتہاد کو متضاد مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے ۔

یہ کہہ کر مودودیؒ صاحب ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور میں نے اِس وقفے میں سوال کیا :

"مولانا! وہ متضاد مقاصد کیا ہیں؟"

"اجتہاد کا ایک مقصد تو یہ ہوسکتا ہے کہ جو نئے حالات پیش آئیں، ان پر اسلام کے اُصول اور احکام منطبق کیے جائیں۔ دُوسرا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ مخصوص نظریات اور خواہشات ذہن میں پہلے سے موجود ہوں، ان کے مطابق اسلام کو ڈھالا جائے۔ پہلی قسم کا اجتہاد صحیح معنوں میں اجتہاد ہے اور ہر دَور میں علماء اس اجتہاد کے قائل رہے ہیں، لیکن مؤخرالذکر اجتہاد نہ تو اسلامی اصطلاح کے مطابق اجتہاد ہے اور نہ کوئی مسلمان اس اجتہاد کا قائل ہے۔ غضب یہ ہے کہ اجتہاد کا نازک کام آج کل وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں جو اس کام کے سرے سے اہل ہی نہیں۔ اجتہاد کے لیے خاص قسم کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی ضرورت ہے۔"

مولانا اپنی فراخ اور کشادہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رُکے ہاتھ کی جنبشیں بتا رہی تھیں کہ ان کے جذبات میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا ہے۔

"مولانا! اجتہاد کے لیے کس نوعیت کی صلاحیتیں درکار ہیں۔ آخر ہر شخص اجتہاد کیوں نہیں کرسکتا؟" میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے سوال کیا۔

"اس کام کے لیے بہت سی صلاحیتیں درکار ہیں، لیکن کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے مغربی قوانین، معاشیات، اقتصادیات کا عِلم کافی ہے اور انگریزی ترجموں سے قرآن پڑھ کر اور حدیث و فقہ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی کامیابی سے اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح کا اجتہاد کوئی ایسا شخص نہیں کرسکتا جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو یا اخلاص کے ساتھ مسلمان رہنے کا خواہش مند ہو۔ صحیح معنوں میں اجتہاد کا اہل وہ شخص ہوسکتا ہے جو عربی زبان میں مہارت رکھتا ہو،

زبان کی نزاکتوں کو سمجھ سکتا ہو، قرآن کو اس کی اصل زبان میں نہ صرف سمجھنے کے قابل ہو بلکہ اپنی عمر کا غالب حصّہ اس نے فہمِ قرآن کی نزاکتوں میں صرف کیا ہو۔ حدیث پر وسیع نگاہ رکھتا ہو، فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے اُصولوں اور مختلف اَدوار کے فقہاء کے کلام سے واقف ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وقت کے مسائلِ زندگی پر بھی نگاہ رکھتا ہو۔"

"مولانا! میں نے جوش انگیز لہجے میں سوال کیا۔" اگر ایک گروہ دُوسرے قسم کا اجتہاد کرنے لگے اور اُسے ملک میں نافذ کرنے پر بھی مُصر ہو، تو پھر قوم کو کیا کرنا چاہیے؟"

مولانا نے نہایت ہی پُرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا:

"پُوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہیے، کیوں کہ اس گروہ کا طرزِ عمل لازمی طور پر ملک کو انتشار اور تباہی کے گرداب میں پھینک دے گا۔ یہ مختصر سا مغرب زدہ گروہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا ہے، ایک نیا دین قوم پر زبردستی ٹھونستا رہے گا اور قوم اس کو دفع کرنے کے لیے زور لگاتی رہے گی اور اس کشاکش میں ترقی کے راستے پر ہمارا قدم ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ تُرکی اس کا تجربہ کر چکا ہے اور اس تجربے کے بُرے نتائج وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔ اب پاکستان بھی آنکھیں بند کر کے اسی راستے پر چلنے لگا ہے۔ انجام پہلے ہی سے صاف نظر آرہا ہے۔"

میں انجام کے بارے میں سوچ کر کانپ اُٹھا۔ یاس کی اُبھرنے میرے ذہن کو ڈھانپ لیا۔ اتنے میں اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ عالمِ اشتیاق میں اس کی طرف لپکا اور اس کی روشنی میں مولانا سے ایک اور سوال کر دیا:

علماء کی ذمّہ داریاں

"کیا اِن حالات میں علماء پر بھاری ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی؟"

مولانا نے قدرے توقف سے جواب دیا :

"مجھے آپ کے جذبات کی شدت کا احساس ہے، مگر یہ تو سوچیے کہ علماء اس سوسائٹی ہی کے تو فرد ہیں جس کی اخلاقی حِس تقریباً تقریباً مرچکی ہے۔ ایسے معاشرے میں حق گو، جرأت مند باضمیر اور ایثار کیش علماء کہاں سے آئیں۔ اگرچہ علماء کا طبقہ دوسرے طبقوں کی نسبت اب بھی کئی اعتبار سے بلند ہے، لیکن دین کے لیے جان کی بازی لگانے کا جذبہ بڑی حد تک سرد پڑ چکا ہے۔ کم ہمت معاشرے میں یہ جذبہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔"

میری گردن ندامت سے جُھک گئی۔ ہم نے علماء کو دیا ہی کیا ہے جس کے عوض ہم ان سے کسی چیز کی توقع رکھیں۔ نہیں، نہیں، ہم نے انھیں بہت کچھ دیا ہے۔ افلاس دیا ہے، مہذب گالیاں دی ہیں اور انھیں سب سے گھٹیا معیارِ زندگی دیا ہے۔ ... ان کے علاوہ انھیں اور کیا چاہیے؟ میرا دل بھر آیا۔ کیا علماء اسی سلوک کے مستحق ہیں؟

اِسلام کا تعزیراتی نظام

رومال سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے میں نے ایک دُوسرے موضوع پر سوال کیا:

"کچھ ماہرینِ قانون کی رائے ہے کہ چوں کہ سزاؤں کے تعیّن کے بارے میں فقہاء میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، اس لیے اسلام کا تعزیراتی نظام قابلِ عمل نہیں ہے۔ اِس موضوع پر آپ کے تاثرات کیا ہیں؟"

مولانا نے پان کو دانتوں سے چباتے ہوئے جواب دیا :

"اگر آپ کوئی کام نہ کرنا چاہیں تو اس میں ہزاروں کیڑے ڈال سکتے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس بات پر اتفاق کریں کہ ہم اسلام کا قانونِ تعزیرات رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے قانونِ تعزیرات کی بنیادیں ــــ قرآنِ مجید کے احکام، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات اور خلافت راشدہ کے نظائر ہیں۔

فقہاء کے درمیان اختلافات کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسی اس زمانے میں قانون دان اور ججوں میں اختلافات ہوتے ہیں، باوجود اس کے کہ قانون ایک ہے۔ اگر یہ اختلافات موجودہ زمانے کے قانون پر عمل کرنے میں مانع نہیں ہیں تو قدیم زمانے کے قانون دانوں اور قاضیوں کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں وہ آخر اصل قانون کو نافذ کرنے میں کیسے مانع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اصل قانون یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اب اختلافات جو ہو سکتے ہیں وہ اس میں ہو سکتے ہیں کہ چور کی تعریف کیا ہے؟ کس حالت میں ایک شخص کو اس چوری کا مرتکب قرار دیا جائے جس پر شارع نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے؟ اس کے لیے کیا شہادت ملنی ضروری ہے؟ کون سا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ کس جگہ سے کاٹا جائے گا؟ ان امور میں جتنے اختلافات بھی ہیں اگر اُن کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر فقیہہ نے اصل قانون کے الفاظ اور عہدِ نبوی اور عہد خلافتِ راشدہ کے نظائر سے اپنی رائے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، اور جو کچھ جس کے نزدیک ثابت ہوا ہے اس کو اس نے اپنی فقہ میں درج کیا ہے۔ ان چیزوں کا جو شخص بھی علمی مطالعہ کرے گا اس کو محسوس ہو جائے گا کہ جس طرح ان مآخذ سے قدیم زمانے میں قانون اخذ کیا جا سکتا تھا اسی طرح آج بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور جب تک کوئی شخص اس اصل قانون کے مآخذ سے استنباط کر رہا ہے اس کا اجتہاد اسلام کے دائرے ہی میں مانا جائے گا۔ مغربی تہذیب اور اس کے تصوّرات سے مغلوب لوگ جب قدیم فقہاء کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور "اجتہاد" کی باتیں کرتے ہیں ان کا اصلی مدعا اسلامی قانون سے فرار ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟ اجتہاد کی اوّلین شرط یہ ہے کہ آدمی اسلام کو سچے دل سے حق مانتا ہو اور اخلاص کے ساتھ اس کی پیروی کا ارادہ رکھتا ہو۔ جن "صاحب" میں یہ بنیادی شرط ہی نہیں پائی جاتی وہ اگر اجتہاد کریں گے تو

اسلام کے قانون کو مسخ کریں گے۔"

تہذیبِ مغرب

موضوع کو بدلنے کے لیے مَیں نے ایک دُوسری نوعیت کا سوال کیا:

" یہ بین الاقوامیت کا دَور ہے۔ اس عہد میں مختلف تہذیبوں کا ایک دوسرے پر اثرانداز ہونا بالکل فطری اَمر ہے۔ ان حالات میں اگر ہم مغربی تہذیب سے مصالحت (Adjustment) کریں تو کیا حرج ہے؟"

"تہذیبوں" کے میل جول سے فعالیّت اور انفعالیت کا عمل ضرور شروع ہوجاتا ہے، یعنی ایک تہذیب اثر ڈالتی ہے اور دُوسری تہذیب اثر قبول کرتی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت ہمارے لیے قابلِ قبول ہے۔ تہذیبیں برابر کی سطح پر رہ کر کبھی سفر نہیں کرتیں۔ ایک تہذیب غالب ہوتی ہے اور دوسری مغلوب۔ اس عمل میں کوئی درمیانی راہ موجود نہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کو غالب رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں "مدافعت" کی سوچ بچار کی بجائے جارحانہ قدم اُٹھانا ہوگا۔ وہ قومیں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہا کرتیں جو اپنی حفاظت کے لیے اپنے چاروں طرف قلعے تعمیر کرلیتی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تہذیب میں دنیا کی غالب تہذیب بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کا انحصار مسلمانوں پر ہے کہ وہ اسے غالب تہذیب بنانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کوئی غیوّر اور آزاد قوم تہذیب کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کیا کرتی۔ قوم کی تہذیبی انفرادیت ختم ہوگئی تو پھر اس میں باقی ہی کیا رہ گیا؟ اور جو لوگ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر دُوسروں کی تہذیب کو اپناتے ہیں اُن کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

تہذیب کی بات چھڑی تو مجھے ثقافت اور کلچر کا خیال آگیا۔ اس لفظ نے دانشوروں

اور مفکروں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اِس لیے مَیں نے کلچر کو موضوعِ گفتگو بنانا ضروری سمجھا۔ اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے میں مولانا سے مخاطب ہوا :

اِسلامی ثقافت

"آپ جب اسلامی ثقافت کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو منفی رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیزیں اسلامی ثقافت میں داخل نہیں ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اسلامی ثقافت میں کیا کیا داخل ہے اور اس کے تفصیلی خدو خال کیا ہیں ؟"

مولانا نے میرا سوال بغور سُنا اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا :

"بات یہ ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے لیے کچھ حدود مقرر کر دیتا ہے اور انسانی آزادی کو ان حدود میں محدود رہنا چاہیے۔ حدود ہمیشہ منفی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ حدود میں صرف یہ بتا دیا جاتا ہے کہ صرف یہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔ اِن حدود میں رہتے ہوئے ایک فرد اپنے حُسنِ ذوق کے اظہار اور نشو و نما کے لیے راہیں تلاش کر سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کے فطری داعیوں اور تقاضوں پر قدغن نہیں لگائی ہے بلکہ صحت مند نشو و نما کی راہیں متعیّن کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی شریعت نے حیوانوں اور انسانوں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اب اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آرٹ کا ارتقاء بند ہو گیا، بلکہ مسلمانوں میں جو حُسن کاری کا جذبہ تھا اس نے تصویر کا راستہ چھوڑ کر خطّاطی، نقش و نگار، پچی کاری اور ایسے ہی دوسرے راستے اختیار کر لیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان راستوں میں مسلمانوں نے جو آرٹ کے کمالات دکھائے ہیں وہ کسی طرح بھی مجسمہ سازی کے کمالات سے کم تھے یا ان میں حُسن کاری نہ تھی۔ ایسا ہی دوسرے میدانوں میں ہوا۔"

تصویروں کے بارے میں میرے ذہن میں بیک وقت کئی سوالات اُبھر رہے تھے۔ میں نے اِن سوالات کو ایک سوال میں مدغم کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا:

"بعض تصویریں اپنے رنگوں کے امتزاج اور فن کار کے خونِ جگر کی آمیزش کے باعث نظر کو بالیدگی اور تازگی بخشتی ہیں۔ کیا اسلام ان کی بھی اجازت نہیں دیتا؟"

مولانا نے مُسکراتی ہوئی نظریں مجھ پر جماتے ہوئے جواب دیا:

"جی نہیں، اسلام جو حدود قائم کرتا ہے، وہ اتنے واضح ہوتے ہیں کہ جن پر ہر شخص پہنچ کر فیصلہ کرسکتا ہے کہ میں اس کے آگے نہیں جاسکتا۔ تصویر کو ایک مرتبہ جائز کرنے کے بعد پھر کوئی خط کسی مقام پر بھی نہیں کھینچا جاسکتا کہ اس نوعیت کی تصاویر جائز ہیں اور اس نوعیت کی نہیں۔ ایک شخص عورت کی ننگی تصویر کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے اس کی رُوح کو بالیدگی ملتی ہے۔ یُوں تو پھر آپ کو عُریانی کے تمام مظاہر کو جائز قرار دینا پڑے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ مولانا بھی کمال کرتے ہیں۔ آخر عُریاں تصویر میں حرج ہی کیا ہے۔ اِن تصویروں سے ذوق نکھرتا ہے، بزنس چمکتا ہے، اشتہارات دیدہ زیب نظر آتے ہیں، ہوٹلوں اور دُکانوں کا حُسن بڑھتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ شاہراہوں کے چوراہے ان تصاویر کی آرائش سے پیرس کے چوراہے نظر آتے ہیں۔ تو کیا مولانا اسلام کے نام پر ہم سے یہ سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔ ہم "نوجوانوں" کا کیا بنے گا؟ یہ کائنات بے رنگ ہوجائے گی۔

سینما کا مسئلہ

خیالات کے سیلاب وگرداب سے اُبھرتے ہوئے میں نے مولانا سے ایک اور سوال کیا:

"کیا اسلامی ریاست میں سینما کو اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے گا؟"

"سینما کی موجودہ شکل تو نہایت ہی اخلاق سوز اور تباہ کُن ہے۔ وہ یوں کہ فلم کمپنیاں سُودی قرض سے سرمایہ حاصل کرکے کام آگے بڑھاتی ہیں۔ سرمایہ دار کا سُود اور اپنا نفع، دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لیے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ وہ ایسے فلم بنائیں جو افیون اور شراب کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچیں۔ یہ فلم لامحالہ جنس یا جرائم سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جو فلم اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے بنائے جائیں گے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اِسلامی ریاست اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لیے سینما اِستعمال کر سکتی ہے۔ فلم کو اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو ہمارے دیہاتی کے معیارِ معلومات کو گریجویٹ کے معیار تک لایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کام اُسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب آنکھوں سے پلائی جانے والی شراب کو بند کیا جائے۔ اب جو ٹیلی ویژن آ رہا ہے اس نے اور بھی قیامت ڈھا دی ہے۔ مغربی ممالک میں بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ ایک بڑے بچّے نے قتل کا منظر دیکھ کر چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا۔ جو مناظر پہلے فلم اسکرین تک محدود تھے، اب وہ گھر بیٹھے دیکھے جا سکتے ہیں۔"

مولانا بات کرتے کرتے رُک گئے۔ اُن کا لہجہ غم اور دردمندی کے جذبات میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ تاریخ کے جھروکوں سے ماضی اور حال کا مشاہدہ کرتے ہوئے مستقبل کے اُبھرتے ہوئے دھیمے دھیمے نقوش دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے یقین و وجدان کی الم آمیز کیفیت کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"آج پوُری انسانیت دو چیزوں کی وجہ سے تباہی کے قریب آتی جا رہی ہے۔ ایک سُودی کاروبار اور دوسری خاندانی منصوبہ بندی۔ اِن دونوں باتوں نے انسان کو نہایت ہی گھٹیا حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک نے اُسے مادّیت کا غلام بنایا اور دُوسری نے جنسی خواہشات کا۔ مجھے دُکھ ہے کہ یہ دونوں بلائیں میرے مُلک کی

طرف بڑھ رہی ہیں اور انھیں ہم خود خوشی خوشی لا رہے ہیں۔"
مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مولانا بھی جذبات رکھتے ہیں، مگر ان جذبات میں توازن تھا اور یہی توازن ان کے جذبات کو شورش کی آماج گاہ بننے نہیں دیتا۔

اِسلام اور زینت

لیکن میرا سینہ جذبات کا محشرستان بنا ہوا تھا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے نئے سوال کے لیے الفاظ جمع کرنے کی کوشش کی۔

"زندگی میں آسائش و زیبائش پیدا کرنے کے لیے اسلام ایک فرد کو کس حد تک جانے کی اجازت دیتا ہے؟"

مولانا نے کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان استعمال کرتے ہوئے جواب دیا:

"اسلام نہ آسائش کا مخالف ہے اور نہ زیبائش کا۔ حدود میں رہتے ہوئے آپ زندگی میں یہ دونوں باتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ دراصل اسلام ضرورت کے پیمانوں کے مطابق آپ کو تمام مباحات استعمال میں لانے کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ آپ کے طرزِ عمل سے اسراف اور کبر نہ ٹپکتا ہو۔ ضرورت کے لیے آپ دو منزلہ کوٹھی بھی بنوا سکتے ہیں اور اگر فی الواقع ضرورت ہو تو دروازوں پر پردے بھی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بلا ضرورت صرف نمائش کے جذبے کے تحت زندگی پر تکلف کے قیمتی غلاف چڑھانے لگیں تو اس عمل کو اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

"لیکن، مولانا، یہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جب انسان آسائشوں میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو پھر اس میں دین کے لیے جدّ و جہد کرنے کا احساس اور جذبہ بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم اِن آسائشوں سے احتراز کریں؟"

مولانا سوال سُن کر ایک منٹ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر فکر آمیز متانت

کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے :

"نہیں، الطاف صاحب، یہ مناسب نہیں۔ اسلام میں جو حدود مقرر ہیں ہم اُن میں اضافہ نہیں کرسکتے۔ اُصول کی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان مباح چیزیں استعمال میں لانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ لیکن کسی ایک فرد کو اگر مُباح چیز اسلام سے دُور لے جاتی ہے، تو وہ اس کے لیے ممنوع قرار پاتی ہے۔ مثال کے طور پر کوٹ اور پتلون کی کریز ٹوٹنے کا خیال اگر کسی کو نماز ادا کرنے سے باز رکھتا ہے تو یہ لباس اس کے لیے ممنوع قرار پائے گا۔ آسائشوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ زندگی کی آسائشیں، مسرّتیں اور جائز لذّتیں ہمارے لیے ہیں، لیکن اگر یہ ہمیں اسلام کے راستے سے ہٹانے کا سبب بنتی ہیں تو انھیں ٹھکرا دیجیے۔ اس بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسان کے معتقدات پختہ ہوں تو یہ چیزیں اثر انداز نہیں ہوا کرتیں۔ جس شخص کے سامنے مقصدِ زندگی ہوتا ہے اس کے لیے اصل چیز آسائش نہیں ہوتی، اصل چیز اس کا مقصد زندگی ہوتا ہے۔ آسائشیں جب تک مقصدِ زندگی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں، وہ ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور جس وقت حائل ہونا شروع ہوجاتی ہیں وہ لات مار دیتا ہے۔ جب آسائشوں اور مقصدِ زندگی میں تصادم ہوجائے تو پھر آسائشیں اُس پر حرام ہوجاتی ہیں۔"

مولانا کی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کا مقصدِ زندگی آسائشوں کا حصول ہے اور اب جب اِن آسائشوں پر ذرا سی بھی آنچ آنے لگتی ہے تو پھر یا تو ہم معتقدات کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں یا ذرا اُصول پسندی سے کام لیا تو ان معتقدات کو تاویلوں کے ذریعے آسائشوں سے ہم آہنگ کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی اغماض نہیں برتا جاسکتا کہ ایئرکنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والے جہاں ایک طرف غریبوں اور عوام کی زندگی کے مسائل سے

اور اسلام جن چیزوں کو نیکیوں سے تعبیر کرتا ہے اُن کی کوئی وقعت اُن کی نگاہ میں نہیں ہے۔ اسلامی روایات سے وہ منحرف ہو چکے ہیں بلکہ اُن کی نگاہوں میں ان روایات کے لیے کوئی احترام نہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں جو پروفیسر تعلیم دے رہے ہیں اُن میں سے اکثر اس خیال کے حامی ہیں کہ تاریخ انسانی میں مسلمانوں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ ایسے اُستاد بھی ہماری درس گاہوں میں موجود ہیں جو فرائڈ کے نظریات کے مُطابق انبیائے کرامؑ اور ہمارے رسُولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیّبہ کی تصریح فرماتے ہیں۔ اُونچے سرکاری مناصب پر ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو شراب اور سُود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رقص و سرود کو اسلامی تہذیب و ثقافت قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے عقائد اور عوام کے درمیان کوئی بھی مماثلت نہیں۔ اگر اقتدار اسلامی ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہو تو مسلمان عوام کو صرف چند سالوں میں بالکل تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اُن کے رگ و ریشے میں اِسلامی تصوّرات اور اقدار موجود ہیں۔ صرف اُن کو اُبھار کر عملی شکل میں لانے کی ضرورت ہے۔"

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا:

"مولانا، خُدا کرے! آپ کا حُسنِ ظن دُرست ہو۔ حالات تو کچُھ اور ہی اشارے کر رہے ہیں۔"

مولانا نے شفقت اور اُمید میں ڈوبی ہوئی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا: ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وقت زیادہ ہو چکا تھا۔ ہم نے مولانا سے اجازت لی۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھے۔ جو ٹھہراؤ، شفقت کی نرمی اور زندگی کی حرارت مولانا کے چہرے سے ٹپک رہی تھی وہی ہاتھ میں جذب تھی۔ واقعی تعمیری کاموں کے لیے انہی کی ضرورت ہے۔

ہاتھوں میں رہا ہے، مگر اس نے صرف بریک کا کام دیا ہے۔ گاڑی چلانے والی لیڈر شپ دُنیا پرستوں کے ہاتھوں میں رہی اور اُسی نے بگاڑ کو یہاں تک پہنچایا ہے۔ جب تک گاڑی کو چلانے والی لیڈر شپ دین دار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئے گی اُس وقت تک یہ حالت نہیں بدل سکتی۔ بعض مسلمان ملکوں میں تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ بریک ٹوٹ چکا ہے اور ڈرائیور گاڑی کو بگٹٹ نشیب کی طرف لے جا رہے ہیں اور اکثر مسلمان ممالک میں بریک کمزور پڑ چکے ہیں۔"

آہ، جن گاڑیوں نے کبھی بلندیوں کو سر کیا تھا، آج وہ نشیب کی طرف لڑھک رہی ہیں اور ہم تماشائی کی حیثیت سے یہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں اور ہم میں احساس کی ذرا سی بھی خلش پیدا نہیں ہوتی۔

عالمِ اسلام اور جمہوریت

مَیں نے پہلو بدلتے ہوئے مولانا سے سوال کیا:

"اِس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کیا کوئی متحدہ کوشش نہیں کی جا سکتی؟"

مولانا نے یاس اور اُمید کے ملے جُلے جذبات کو اپنے لہجے میں سموتے ہوئے جواب دیا:

"متحدہ کوشش سر دست تو صرف اِس حد تک ہو سکتی ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں میں دینی رُوح کو بیدار کرنے والے لوگ کام کرتے رہیں اور جب کبھی موقع ملے تو ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے اس وقت کے بین الاقوامی حالات کوئی موقع نہیں دے رہے ہیں۔ تمام مسلمان ممالک پر ایسے لوگ مسلط ہیں جو ایک طرف مغربی نیشنلزم کے تصورات کی پیروی کر کے اپنے اپنے ملکوں کو مضبوط فولادی سرحدوں میں محصور کیے ہوئے

ہیں۔ جس کی وجہ سے کوئی بین الاقوامی مسلم تحریک نہیں چل سکتی۔ اور دُوسری طرف وہ مغربی تہذیب وتمدّن کو اپنے ملکوں میں رواج دے رہے ہیں اور اس طرح وہ اسلامی تحریکوں کے راستے میں سخت رُکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

مؤتمر عالمِ اسلامی کی تازہ کانفرنس جو جدّہ میں ہوئی ہے اس سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ دراصل حج کے دنوں میں پُورے عالمِ اسلام کے مدبّرین اور علماء کو سرجوڑ کر مل بیٹھنے کا سب سے موزوں موقع میسّر آتا ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس سے ہم فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ باہمی ربط سے بے شمار فوائد وابستہ ہیں جن کی بدولت کام کی اَن گنت راہیں نکل سکتی ہیں۔ اس وقت عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت ایسے لٹریچر کی ہے جو اُٹھنے والے مختلف مسائل کا نہایت ہی صاف، معقول اور قابلِ عمل حل پیش کر سکے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ کچھ ممالک کی درس گاہوں میں بعض کتابیں نصاب میں داخل ہوگئی ہیں، اور بحیثیت مجموعی یہ وہاں کے نوجوان بالخصوص انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کر رہی ہیں۔ ان کتابوں میں عرب نیشنلزم پر بھرپور تنقید کی گئی ہے اور شاید یہ اسی کا اثر ہو کہ عرب ممالک میں عرب قومیت کے خلاف تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہی تحریک آگے چل کر اسلامی تحریک کے لیے راستہ ہموار کردے۔"

مولانا بات ختم کر چکے تو میں نے اِسی موضوع پر ایک اور سوال کر دیا :

"آپ نے عرب ممالک کی سیاحت کی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا اس سرزمین سے کسی اصلاحی اور جمہوری تحریک کے اُٹھنے کی توقع نہیں ؟"

مولانا نے جواب میں فرمایا :

" وہاں کے حالات کے اعتبار سے اس وقت کسی جمہوریت کے قائم ہونے

کے امکانات روشن نہیں ہیں۔ تقریباً تمام عرب ممالک میں آمریتیں قائم ہیں۔ عراق سوڈان اور مصر میں آمریت ہے۔ تیونس بھی قریب قریب آمریت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اُردن، مراکش اور لیبیا میں بادشاہی نظام قائم ہے۔ شام میں جمہوریت سر اٹھاتی ہے اور فوجی آمریت اسے بار بار پچھاڑ دیتی ہے۔ جمہوریت اس وقت عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں۔ سیاسی رقابتوں کی بنا پر ایک ملک دوسرے ملک میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ جمہوریت کا علم بردار خود اپنے ملک میں آمریت چلا رہا ہوتا ہے۔ تمام مسلم ممالک کا قریب قریب یہی حال ہے کہ ان ملکوں کی فوجیں اپنے اپنے ملک کو فتح کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔"

پاکستان کا اہم ترین مسئلہ

عالمِ اسلام پر تفصیلی گفتگو کے بعد پاکستان کے مسائل زیرِ بحث آئے۔ میں نے پاکستان کے بارے میں متعدد سوالات کیے اور یہ میرے سوالات کی آخری کڑی تھی۔

"آپ کے نزدیک اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ کیا ہے اور اسے کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟"

مولانا نے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے نزدیک پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ تقریباً وہی ہے جو تمام مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آخر کار لیڈر شپ آیا اسلام کو ماننے، سمجھنے اور اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے والوں کے ہاتھ میں آتی ہے یا ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے یا کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی قوم کو بگٹٹ غیر اسلامی راستے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر مستقبل قریب میں اس مسئلے کا فیصلہ پہلی صورت کے حق میں نہ ہوا تو مجھے

اندیشہ ہے کہ سارے مسلم ممالک سخت تباہی سے دو چار ہوں گے۔ بدقسمتی سے بیشتر مسلم ممالک میں جو لیڈرشپ قائم ہے وہ کسی عنوان بھی مسلم عوام کے ضمیر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ حکومتیں اگر سو برس بھی زور لگائیں تو بھی میں توقع نہیں رکھتا کہ وہ مسلم عوام کے عقائد اور ان کے تصورات، تہذیب تمدن اور ان کی اخلاقی قدروں کو تبدیل کرسکیں گی۔ اور میں یہ بھی توقع نہیں رکھتا کہ مزید سو برس میں وہ کسی دوسری تہذیب کی قدروں اور تصورات پر قوم کی تعمیر سیرت کرسکیں گی۔ اس کش مکش کا حاصل اس سے زائد کچھ ہوتا نظر نہیں آتا کہ مسلمان قوم کی کوئی سیرت اور کردار نہ بن پائے اور اخلاقی اعتبار سے وہ بالکل دیوالیہ ہوجائے اور کوئی مادّی ترقی بھی نہ کرسکے۔ ایک بے سیرت قوم، خواہ کتنے ہی ذرائع ووسائل رکھتی ہو، درحقیقت کوئی مادّی ترقی نہیں کرسکتی، اور کسی حکومت کی کوئی پالیسی خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی ایسی صورت میں کامیاب نہیں ہوسکتی جب کہ پوری قوم کا ضمیر پورے اطمینان کے ساتھ اس کے ساتھ نہ ہو۔ اس لیے میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام مسلمان ملکوں کے مستقبل کا انحصار صرف ایک صحیح قسم کی اسلامی لیڈرشپ پر ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ قیادت میسّر نہ آئی تو ہم سب کو بہت ہی بُرا دن دیکھنا پڑے گا۔"

صحیح قیادت

"اِس لیڈرشپ کو تیار کرنے کے لیے کس شعبے میں اصلاح درکار ہے؟" میں نے مولانا سے استفسار کیا۔

"لیڈرشپ کسی ایک شعبے میں نہیں اُبھرا کرتی۔ اس کو زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر اور نمایاں ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان ملکوں میں جمہوری نظام کو نشو ونما پانے کا موقع مل جائے تو بالکل ایک فطری ارتقاء کے طور پر مسلمان ملکوں میں اسلامی

لیڈرشِپ اُبھرآئے گی ۔ مغرب زدہ طبقہ ہرمسلمان ملک میں ایک بڑی ہی محدود اقلیت رکھتا ہے ۔لیکن مغربی استعمار کی بدولت یہ اقلیت اقتدار کی وارث بن گئی ہے ۔ یہ یہ طبقہ اس بات کو جانتا ہے کہ اگران ملکوں میں جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ملاتو آخرکار اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا ۔اس لیے یہ طبقہ سازشوں کے ذریعے آمریت قائم کررہا ہے ،اور جمہوریت کو اُبھرنے کا موقع نہیں دے رہا ہے ۔"

مسلمان عوام اور رہنما

"لیکن مولانا !مسلمان جمہور خود اسلام کے راستے سے بہت دُور ہیں ۔انھیں اسلام سے جذباتی لگاؤ تو ہوسکتا ہے مگر غالباً تربیت کی کمی کی وجہ سے ان میں وہ جوہر نظر نہیں آتا جو اسلامی لیڈرشپ کو جنم دے سکے ، تو پھر جمہوری نظام قائم کرنے سے صالح قیادت کیسے بروئے کار آسکے گی ؟"

مولانا نے ایک مفکّر کے سے انداز میں جواب دیا :

" ان دونوں کی حالت میں ایک بنیادی فرق ہے ۔عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ اگرچہ اُن میں جہالت بھی بہت پھیلی ہوئی ہے لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں ۔ کسی بُرے سے بُرے بدکردار آدمی سے آپ بات کریں تو تھوڑی دیر بعد آپ کو محسوس ہوجائے گا کہ اس کی قدریں (Values) ابھی وہی ہیں جو ایک مسلمان کی ہونی چاہییں۔ اور اپنی تمام بدکرداریوں کے متعلق اسے یہ تسلیم کرنے میں تامّل نہ ہوگا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے بُرا کررہا ہے ۔بُرائی کو بھلائی کہنے والے آدمی عوام میں آپ کو بہت ہی مشکل سے ملیں گے ۔

اس کے برعکس مغرب زدہ طبقے کی قدریں (Values) تبدیل ہوگئی ہیں ۔ان کا فلسفۂ زندگی بدل گیا ہے ۔اسلام جن چیزوں کو بُرا کہتا ہے وہ انھیں اچھا سمجھتے ہیں

اور اسلام جن چیزوں کو نیکیوں سے تعبیر کرتا ہے اُن کی کوئی وقعت اُن کی نگاہ میں نہیں ہے۔ اسلامی روایات سے وہ منحرف ہو چکے ہیں بلکہ اُن کی نگاہوں میں ان روایات کے لیے کوئی احترام نہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں جو پروفیسر تعلیم دے رہے ہیں اُن میں سے اکثر اس خیال کے حامی ہیں کہ تاریخ انسانی میں مسلمانوں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ ایسے اُستاد بھی ہماری درس گاہوں میں موجود ہیں جو فرائڈ کے نظریات کے مُطابق انبیائے کرامؑ اور ہمارے رسُولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیّبہ کی تصریح فرماتے ہیں۔ اُونچے سرکاری مناصب پر ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو شراب اور سُود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رقص و سرود کو اسلامی تہذیب و ثقافت قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے عقائد اور عوام کے درمیان کوئی بھی مماثلت نہیں۔ اگر اقتدار اسلامی ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہو تو مسلمان عوام کو صرف چند سالوں میں بالکل تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اُن کے رگ و ریشے میں اسلامی تصوّرات اور اقدار موجود ہیں۔ صرف اُن کو اُبھار کر عملی شکل میں لانے کی ضرورت ہے۔"

میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا:

"مولانا، خدا کرے! آپ کا حُسنِ ظن دُرست ہو۔ حالات تو کچھ اور ہی اشارے کر رہے ہیں۔"

مولانا نے شفقت اور اُمید میں ڈوبی ہوئی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا: ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وقت زیادہ ہو چکا تھا۔ ہم نے مولانا سے اجازت لی۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھے۔ جو ٹھہراؤ، شفقت کی نرمی اور زندگی کی حرارت مولانا کے چہرے سے ٹپک رہی تھی وہی ہاتھ میں جذب تھی۔ واقعی تعمیری کاموں کے لیے انہی کی ضرورت ہے۔

مولانا سے ان گنت سوالات کرنے کے بعد ایک سوال میں نے اپنے آپ سے کیا :

"تم ان لوگوں کے زمرے میں تو نہیں آتے جو اسلام کو مانتے ہوئے اس کے حدود میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں ؟"

سوال ڈائریکٹ تھا ۔ اس کی تندی اور تلخی کی تاب نہ لا سکا ۔ میں بوکھلا اٹھا ۔ بے حسی کے سحر نے جاگے ہوئے ضمیر کو یہ کہہ کر سلا دیا کہ اس نوعیت کے سوالات کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے ۔ ایسی باتیں بڑھاپے میں اچھی لگتی ہیں ۔

جوانی کی شمشیر خارا شگاف نے احتساب کی تلوار کو کند کر کے رکھ دیا اور میں سوچنے لگا ، نہ معلوم روزانہ اس طرح کتنی تلواریں کند ہوتی ہوں گی اور کتنے ضمیر بے حسی کی نیند سو جاتے ہوں گے ۔

غلافِ کعبہ کی مذہبی اور تاریخی حیثیت

> ۱۹۶۳ء میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کی بدولت پاکستان کو غلافِ کعبہ تیار کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہفت روزہ "شہاب" لاہور نے ۲۴ مارچ ۱۹۶۳ء "غلافِ کعبہ نمبر" شائع کیا تاکہ غلافِ کعبہ کی اہمیت سے عوام کو متعارف کرایا جائے۔ اس خصوصی شمارے میں جناب خالد کاشمیری کے قلم سے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کا یہ انٹرویو بھی شائع ہوا جس میں آپ نے غلافِ کعبہ کی مذہبی اور تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ یاد رہے کہ "غلافِ کعبہ اور اس کی شرعی حیثیت" کے موضوع پر مولانا کا ایک مستقل مقالہ بھی چھپ چکا ہے۔

مکّہ معظمہ ــــ پیغمبرِ دو جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس جائے پیدائش ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں قرآنِ مجید کا نزول ہوا ــــ یہی وہ مقدس جگہ ہے، جہاں حضرت جبریل امینؑ آسمانوں سے اُتر کر سرورِ کائناتؐ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے رہے ــــ اسی مقدس شہر میں منبعِ انوارِ الٰہی ہے جسے دُنیا کا ہر انسان کعبۃُ اللہ، بیتُ اللہ اور خانۂ خدا کے نام سے جانتا ہے۔

کرۂ ارض کے وسط میں ہونے کے علاوہ بیتُ اللہ تمام مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ مسلمان اس نام کی عظمت کے لیے ہر وقت اپنی جانیں قربان کرنے کو

تیار رہتے ہیں — اور خانۂ خدا — پرستارانِ توحید کی عظمت و غیرت کا پاسبان ہے۔ اسی کے متعلق شاعرِ مشرق (مرحوم) نے کہا ہے ؎

دنیا کے بُتکدوں میں پہلا وہ گھر خُدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

خانۂ کعبہ پر ہر سال حج کے موقع پر کپڑے کا نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے — گزشتہ کئی صدیوں سے غلافِ کعبہ مصر سے تیار ہو کر مکّہ معظمہ جاتا تھا۔ مگر اس دفعہ غلافِ کعبہ تیار کرنے کی سعادت پاکستان کے حصّے میں آئی — غلافِ کعبہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی نگرانی میں لاہور میں بُنا گیا۔

میں نے غلافِ مقدس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی وجہ سے چند ایک اہلِ علم حضرات سے استفسار کیا مگر معلومات کی تشنگی برقرار رہی۔ اس تشنگی کو دُور کرنے کے لیے مَیں نے مولانا مودودیؒ سے رجوع کیا۔

جمعرات کا دن اور شام کے ساڑھے چار بجے تھے۔ میں مولانا کی قیام گاہ کے صدر دروازے میں داخل ہوا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ باغیچے میں صفیں بچھی ہوتی تھیں۔ چند حضرات باغیچے کی سیڑھیوں میں کھڑے اپنی اپنی ٹوپی درُست کر رہے تھے، اور دو چار حضرات ایسے بھی تھے جو اپنے سروں پر رُومال باندھ رہے تھے۔ میں بائیں ہاتھ ایک درخت کے نیچے سائیکل رکھ کر مُڑا تو اُن میں سے چند ایک لوگ باغیچے کی سیڑھیاں اُتر گئے تھے اور کچھ سمٹ کر سیڑھیوں کے ایک طرف ہو گئے۔ مولانا مودودیؒ نمازِ عصر کی امامت کے لیے تشریف لا رہے تھے — نماز سے فارغ ہو کر مولانا اپنے دفتر میں تشریف لے گئے — میں نے اُن کے ایک آدمی کو اپنے آنے کی وجہ بتلائی۔ چوں کہ مَیں فون پر مولانا سے وقت لے چکا تھا۔ لہٰذا تھوڑی دیر بعد مجھے مولانا کے دفتر میں داخل ہونے کو کہا گیا۔ میں اندر داخل ہوا اور مولانا سے السلام علیکم کہا۔

"وعلیکم السلام" کہتے ہوئے مولانا اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جس شفقت و محبت سے اُنھوں نے میرے ساتھ مصافحہ کیا وہ آج کے دَور میں قریباً قریباً ناپید ہے۔ کیوں کہ علم وہ دولت ہے جسے ہر انسان حاصل کرسکتا ہے، مگر عمل کرنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ خلقِ عظیم کا مظاہرہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود کو ایک ــــ صحیح اِنسان بنانے کی کوشش میں مصروف ہوں۔

مولانا نے بڑی محبت سے ایک کرسی پر اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کو کہا ــــ میز پر ایک ہلکے سبز رنگ کے شیڈ کا برقی لیمپ رکھا ہوا تھا ــــ مولانا کے سُرخ وسپید چہرے پر سفید بُرّاق داڑھی ــــ ہلکے انگوری رنگ کی روشنی اور پھر مولانا کی شخصیت کے جلال نے ــــ کمرے کے ماحول کو گویا جِلا بخش رکھی تھی ــــ کمرے کے چاروں طرف شیشے کی الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں بھری پڑی تھیں ــــ اور میرے سامنے وہ انسان تشریف فرما تھا جس کی کوششوں سے ملک کے کروڑوں انسانوں کی تمنّا پُوری ہو رہی تھی ــــ لمحہ بعد مولانا گویا ہوئے:

"فرمائیے، آپ غلافِ کعبہ کے سلسلے میں کون سی معلومات چاہتے ہیں؟"

مَیں نے بصد احترام سوال کیا:

س: مولانا غلافِ کعبہ کی مذہبی اور تاریخی اہمیّت کیا ہے؟

ج: مذہبی نقطۂ نظر سے غلافِ کعبہ بنانا جائز ہے۔ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبے پر غلاف چڑھایا، پھر خلفائے راشدینؓ غلاف چڑھاتے رہے، اور اس وقت سے آج تک برابر یہ کام ہو رہا ہے۔

س: کیا حج کے موقع پر ہی غلاف بدلنا ضروری ہے؟

ج: حج کے موقعے پر ہی غلاف بدلنا کوئی ضروری نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دس محرم کو نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا ــــ بعد میں دو غلاف بھی

چڑھائے جانے لگے۔ ایک عیدالفطر کو اور دوسرا دس محرم کو ــــ مگر شرعاً اس کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں۔

س: مولانا! بیتُ اللہ پر حج کے موقع پر غلاف چڑھانا کس سال سے شروع ہوا؟

ج: اِس کی تاریخ مجھے معلوم نہیں۔ تاہم خلفائے راشدینؓ کے بعد ہی یہ سلسلہ (حج کے موقع پر) شروع ہوا۔

س: مولانا! یہ فرمائیں، کیا بیتُ اللہ پر ہر سال نیا غلاف چڑھانا ضروری ہے؟

ج: ہر سال نیا غلاف چڑھانا کوئی شرعاً ضروری نہیں۔ لیکن خانۂ کعبہ ایک ایسی عمارت ہے جو کھلے میدان میں بنی ہوئی ہے۔ بارشیں ہوتی ہیں، دھوپ پڑتی ہے، آندھیاں آتی ہیں۔ ایسے حالات میں بہتر سے بہتر کپڑا بھی سال بعد بوسیدہ ہوجاتا ہے اس لیے بدلنا پڑتا ہے۔

س: مولانا! کعبۃ اللہ پر غلاف چڑھانا اپنا حقیقی مقصد پُورا کر رہا ہے یا صرف ایک رسم بن کر رہ گیا ہے؟

ج: غلاف کعبۃ اللہ پر اس غرض سے چڑھایا جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہ میں کعبے کی اہمیّت اور عظمت قائم ہو۔ اور یہ غرض پہلے کی طرح اب بھی پوری ہو رہی ہے۔

س: مولانا! یہ فرمائیے، کیا عام لوگ (چند ایک مِل کر) غلاف تیار کروا سکتے ہیں؟

ج: اسلام سے پہلے ــــ عرب کے مختلف قبائل اور مختلف سردار کبھی پُورا غلاف لاکر چڑھاتے اور کبھی چادریں لٹکاتے تھے ــــ بعد میں (زمانۂ اسلام میں) غلاف تیار کرانا مسلمان حکومتوں کی ذمّہ داری قرار پایا اور عام لوگوں کے ذمّے یہ خدمت نہ رہی۔

س: مولانا! کعبۃ اللہ کا اندرونی غلاف بھی بدلا جاتا ہے؟

ج : نہیں، اندر کا غلاف ایک مدّت سے نہیں بدلا گیا۔

س : مولانا! یہ فرمائیں، اس غلاف کی تیاری میں آپ کی مساعی کا کتنا دخل ہے؟

ج : اس غلاف کی تیاری میں میرا صرف اتنا دخل ہے کہ پچھلے سال حج کے موقع پر جب مصر کا غلاف سعودی حکومت نے واپس کر دیا اور وہ (حکومت سعودی) خود غلاف تیار کروانا چاہتی تھی۔ میں نے سعودی سفیر صاحب کو توجہ دلائی کہ پاکستان میں بہترین کاریگر موجود ہیں، اور وہ اچھے سے اچھا کپڑا تیار کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ انھوں نے اس مشورے کو پسند فرمایا اور اپنے ایک ذمے دار آدمی کو لاہور بھیج دیا۔ مَیں نے یہاں اُن تمام مختلف لوگوں سے ان کا تعارف کروا دیا جو کپڑا بنانے کے ماہر تھے۔ ان میں سے لاہور کے یعقوب بنارسی صاحب کا نمونہ (جو کپڑا اُنھوں نے بُنا) پسند فرمایا اور اُن سے معاہدہ کر لیا۔ پھر مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ چوں کہ مَیں لاہور میں رہتا ہوں لہٰذا اس کام کی نگرانی کروں۔ بس میرا اِس کام میں اتنا ہی دخل ہے۔

س : مولانا! جب مصر کا غلاف واپس ہو گیا تھا تو پھر خانۂ کعبہ پر اس سال غلاف نہیں چڑھایا گیا؟

ج : ایک پُرانا غلاف رکھا ہوا تھا وہی چڑھا دیا گیا تھا۔

س : جناب یہ فرمائیے، کیا خانۂ کعبہ پر سیاہ رنگ کا ہی غلاف چڑھانا ضروری ہے؟

ج : غلاف کے لیے کوئی رنگ مقرر نہیں ہے۔

ساتویں صدی تک مختلف رنگوں کے غلاف چڑھائے جاتے رہے۔ کبھی سفید غلاف چڑھایا جاتا، کبھی زرد اور کبھی سبز رنگ کا غلاف بھی چڑھایا گیا۔ پھر ساتویں صدی میں ایک عباسی خلیفہ نے سیاہ رنگ کا غلاف بنوایا۔ جو اس کام کے لیے نہایت اچّھا سمجھا گیا۔ لہٰذا اُس وقت سے سیاہ غلاف ہی بنایا جانے لگا۔

س : مولانا! پرانا غلاف جو اُتارا جاتا ہے وہ کس مصرف میں لایا جاتا ہے یا اس کو کس مصرف میں لانا چاہیے ؟

ج : پرانے غلاف کو اُتار کر لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ـــــ فقہاء نے اس بات کو بھی جائز رکھا ہے کہ آدمی اس کا لباس بنا سکتے ہیں ـــــ مگر آج کل تو لوگوں میں تبرکاً اسے تقسیم کر دیا جاتا ہے ۔

س : مولانا! مَیں نے دیکھا ہے کہ پاکستان میں غلافِ کعبہ کے سلسلے میں اہلِ پاکستان کی طرف سے بھرپور عقیدت کا مظاہرہ کیا گیا ہے ، کیا اہلِ عرب بھی اس کے لیے اتنی ہی محبّت و عقیدت رکھتے ہیں ؟

ج : پاکستان میں غلاف کے سلسلے میں جو جوش و عقیدت پیدا ہوا ہے وہ کچھ اس وجہ سے ہے کہ پاکستان کے لوگ بیتُ اللہ کے ساتھ بہت زیادہ عقیدت و محبّت رکھتے ہیں ۔ اور کچھ اِس وجہ سے کہ ایک مدّتِ دراز سے کبھی یہاں سے غلاف بن کر نہیں گیا ـــــ خاص عرب میں تو اِس سلسلے میں کوئی نمایاں جذبہ نہیں پایا گیا ـــــ البتہ جب مصر سے غلاف روانہ ہوتا تھا تو محمل کی روانگی بڑے قومی جشن کی حیثیت رکھتی تھی ، اور اس سلسلے میں ایک خاص تقریب منعقد ہوا کرتی تھی ۔

س : مولانا! خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی ابتدا کب ہوئی تھی ؟

ج : غلاف کعبہ بہت قدیم زمانے سے چڑھایا جاتا رہا ہے ۔ بلکہ اسلامی روایات میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبۃ اللہ پر غلاف چڑھایا تھا ـــــ اسلام سے کم از کم دو سو برس پہلے سے اس بات کا تاریخی ثبوت ملتا ہے کہ غلاف ہمیشہ چڑھایا جاتا رہا ، اور کئی کئی غلاف بھی چڑھائے جاتے رہے ۔ اس کے علاوہ عرب کے لوگ چادریں بھی ڈالتے تھے ۔

س : مولانا! اگر کوئی حکومت غلاف کی تیاری میں اپنی خدمات پیش کرے تو اس کی پیش کش کو قبول کرنے کا حق حکومت سعودی عرب کو ہے یا ایک فرد کو یا کسی ایک ادارے کو بھی؟

ج : حجاز کی حکومت چوں کہ حرمین کی متولّی ہوتی ہے، اس لیے کسی ملک کی طرف سے غلاف کی تیاری کی پیش کش قبول کرنا اُسی کا کام ہے۔

س : مولانا! کیا آئندہ سے غلافِ کعبہ پاکستان میں ہی تیار ہوا کرے گا؟

ج : ہماری خواہش تو ضرور ہے کہ پاکستان کو اس خدمت کا موقع حاصل ہو، لیکن یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے کہ آئندہ بھی یہاں غلاف تیّار ہوا کرے گا یا نہیں۔

س : مولانا! یہ فرمائیں، روضۂ رسولؐ پر کیوں نہیں غلاف چڑھایا جاتا؟

ج : روضۂ مبارک پر غلاف کبھی نہیں چڑھایا گیا، اور نہ ہی شرعاً ایسا کرنا درست ہے۔ البتہ ایک مُدّتِ دراز سے روضۂ مبارک کی جالیوں پر پردے لٹکائے جاتے رہے ہیں۔

اب غلافِ کعبہ کی معلومات کے سلسلے میں میری تشنگی دُور ہو چکی تھی۔ مَیں نے سوال و جواب کا سلسلہ بند کر کے مولانا کے چہرے پر عقیدت سے بھرپُور ایک نگاہ ڈالی۔ کیوں کہ ــــ بااخلاق انسانوں سے ہم کلامی کا شرف روز روز حاصل نہیں ہوا کرتا۔ مولانا نے اسی شفقت و محبّت سے مجھے الوداع کیا جس طرح اُنھوں نے پہلے شفقت کا اظہار کیا تھا۔

مولانا انٹرویو کے دَوران جس ملائمت، اطمینان، شفقت، متانت، مُسکراہٹ اور سنجیدگی سے میری معلومات میں اضافہ کرتے رہے اس سے میرے دل پر گہرا نقش قائم ہو چکا ہے، اور ایسا نقش دُوسروں کے دلوں پر وہی لوگ چھوڑ سکتے ہیں جن کو اخلاق کی نعمت سے نوازنے میں قدرت نے بخیلی سے کام نہ لیا ہو۔

ــــــ ٭ ــــــ

اقبالؒ میرا روحانی سہارا تھا

پاکستان کے ایک معروف علمی و ادبی ماہنامہ "سیارہ" لاہور نے مئی ۱۹۶۳ء میں "اقبال نمبر" شائع کیا۔ یہ انٹرویو جناب غلام حسین اظہر نے مولانا مودودیؒ صاحب سے اس خصوصی اشاعت کے لیے لیا۔ یہ انٹرویو کئی مرتبہ ملکی رسائل و جرائد میں چھپ چکا ہے۔
"اقبال میرا روحانی سہارا تھا ......"

چند سال ہوئے ترجمان القرآن کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ الفاظ میری نظر سے گزرے۔ ان الفاظ میں مجھے جذبات و احساسات کی شدّت محسوس ہوئی۔ ان الفاظ کے پردے میں کیا المیہ کارفرما ہے۔ یہ جاننے کی چیز تھی۔ بارہا خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے، لیکن ہر بار مولانا کی گوناگوں مصروفیات کا خیال آتے ہی یہ خواہش دب کے رہ گئی۔ اب کے سیارہ کے "اقبال نمبر" کا مرحلہ آیا تو میں نے اِس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مولانا سے اس دیرینہ خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا نے کسی شام کو حاضر ہونے کو کہا۔ چنانچہ میں ۱۴/ اپریل کی شام کو مولانا کے ہاں حاضر ہوا۔ مولانا سے گفتگو کا ماحصل پیش خدمت ہے:-

"مولانا! آپ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ اقبال میرا رُوحانی سہارا تھا، اِس کے پسِ منظر میں کیا المیہ کارفرما ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے پٹھانکوٹ میں آنے کو لکھا تھا اور مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تم اِس جگہ آکر بیٹھ جاؤ تو میں بھی سال میں چھ مہینے وہاں گزارا کروں گا۔ اِس میں ایک ایسی جاذبیت تھی جس کی وجہ سے مَیں نے فوراً ہی اِس تجویز کو قبول کرلیا اور حیدرآباد سے پٹھانکوٹ چلا آیا۔ مگر اس ساری داستان کا المیہ یہ ہے کہ مارچ میں مَیں پٹھانکوٹ منتقل ہوا اور اپریل میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت مجھ پر اس حادثہ کا شدید اثر تھا۔ اسی احساس نے مجھے یہ الفاظ لکھنے پر مجبور کیا۔"

"مولانا! آپ کے اور علّامہ اقبال کے درمیان اس سلسلے میں جو مراسلت یا گفتگو ہوئی، اسے اگر تفصیلاً بتادیں تو مفید ہوگا۔"

"وہ خطوط تو میرے پاس نہیں ہیں، لیکن دُوسری تفصیلات بتائے دیتا ہوں۔"

مولانا نے اپنے مخصوص دھیمے دھیمے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"چوہدری نیاز علی صاحب نے دین کی خدمت کے پیشِ نظر ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے زمین وقف کی اور عمارات بنانی شروع کیں۔ لیکن ان کے سامنے یہ متعین نہ تھا کہ ادارہ کس قسم کا ہو۔ اُنھوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ کس قسم کا ادارہ قائم کیا جانا چاہیے۔ مَیں نے ایک خاکہ لکھ کر بھیجا، جو ان خطوط پر تھا جو بعد میں مَیں نے دارالاسلام کے بارے میں شائع کیا۔

اِسی دَوران میں اُنھوں نے علّامہ صاحب سے بھی رہنمائی کی غرض سے خط و کتابت کی۔ اس خط و کتابت کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں ہیں۔ البتہ یہ مجھے چوہدری نیاز علی صاحب سے معلوم ہوا کہ میری تجویز کردہ اسکیم انھوں نے علّامہ مرحوم کو دکھائی تھی اور انھوں نے اسے پسند کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس وقت کرنے کے یہی کام ہیں۔ اِس سلسلے کی ساری خط و کتابت چوہدری نیاز علی صاحب کے پاس محفوظ ہے اور ان سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ بلکہ وہ غالباً ایک دفعہ شائع کرچکے ہیں۔

تقریباً ۱۹۳۶ء ہی کا زمانہ تھا۔ جب پہلی مرتبہ علامہ صاحب نے مجھے نذیر نیازی صاحب یا میاں شفیع صاحب کے ہاتھ سے خط لکھوایا تھا کہ مَیں حیدرآباد چھوڑ کر پنجاب میں منتقل ہو جاؤں۔ مگر اُس وقت مَیں نے اظہارِ معذرت کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس وقت مَیں حیدرآباد ہی میں رہنے کا خیال رکھتا تھا، اور وہاں مَیں نے زمین بھی اس غرض سے خرید لی تھی کہ اِس طرح کا ایک ادارہ قائم کروں گا جس کی تجویز انھوں نے کی تھی۔"

"علامہ صاحب نے آپ کو پنجاب آجانے کے لیے کوئی خاص وجہ بھی لکھی تھی؟"

"بس یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مَیں پنجاب چلا آؤں، زیادہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کی مصلحت کیا ہے، البتہ ۱۹۳۷ء کے وسط تک پہنچ کر مجھے یہ خود محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند کو چھوڑ کر مجھے شمالی ہند کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ اُسی زمانے میں چوہدری نیاز علی صاحب نے اصرار کیا کہ میں پنجاب کا سفر کروں اور کم از کم ان کے اس مقام کو دیکھ لوں جو انھوں نے ایک ادارہ قائم کرنے کے لیے وقف کیا تھا۔ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ شمالی ہند کا سفر کر کے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کروں جہاں اپنے عزائم کے مطابق مجھے کام کرنے کا موقع ملے۔ اسی خیال سے مَیں نے شاید اگست کا آخر تھا، ۳۷ء میں پنجاب کا سفر کیا اور جالندھر اور لاہور سے ہوتا ہوا پٹھانکوٹ پہنچا۔ اس سفر میں علامہ اقبال مرحوم سے تفصیلی گفتگو ہوئی اور اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ چوہدری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے میں اسی کا انتخاب کروں اور وہ ادارہ قائم کروں جس کا خاکہ میں نے چوہدری صاحب کے نام اپنے خط میں لکھا تھا۔"

"آپ کا شمالی ہند کو مرکز بنانے کا ارادہ کیوں ہوا؟"

"مَیں نے یہ محسوس کیا کہ جنوبی ہند میں کام کرنے کے مواقع روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے مستقبل کا فیصلہ بڑی حد تک

شمالی ہند میں ہوگا۔"

"آپ کی اور علامہ اقبال مرحوم کی جو تفصیلی گفتگو ہوئی اُس میں کون سے مسائل زیادہ زیرِ بحث رہے؟"

"اس وقت جو گفتگو ہوئی وہ یہی تھی کہ مسلمانوں کے لیے کس نوعیت کے تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں میرے اور علامہ مرحوم کے خیالات قریب قریب یکساں تھے اور کام کا وہی خاکہ ان کے پیشِ نظر تھا جو میں نے پیش کیا تھا۔ اسی کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر ہم اس گفتگو میں سوچتے رہے۔ تفصیلات مجھے یاد نہیں رہیں۔"

"کیا اس وقت یہ چیز پیشِ نظر تھی کہ ہندوستان میں ایک اسلامی تحریک چلائی جائے؟"

"اس وقت تحریک پیش نظر نہ تھی۔ اس وقت دو چیزیں پیشِ نظر تھیں۔ ایک یہ کہ علمی حیثیت سے ان گوشوں کو پُر کیا جائے جن کے خالی ہونے کی وجہ سے اسلامی نظامِ زندگی موجودہ زمانے کے لوگوں کو ناکافی اور ناقابلِ عمل نظر آرہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مسلمانوں کی فکری اور عملی رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔ ایک خالص اور جامع اسلامی تحریک کا تخیّل اس وقت واضح طور پر سامنے نہیں تھا۔"

"علّامہ اقبال اُس وقت علمی میدان میں کون سے کاموں کو زیادہ اہمیّت دیتے تھے؟"

"زیادہ تفصیل یاد نہیں۔ اسلامی قانون اور فلسفے کی تدوین ان کے پیشِ نظر تھی۔ اس وقت جو بات ہوئی یہی تھی۔"

"مولانا! سُنا ہے علّامہ اقبال ترجمان القرآن کا خاص طور پر مطالعہ کیا کرتے تھے؟"

"یہ مجھے بعد میں نذیر نیازی صاحب اور میاں شفیع صاحب سے معلوم ہوا کہ علّامہ مرحوم ترجمان القرآن بڑے غور سے پڑھا کرتے تھے اور الجہاد فی الاسلام پڑھوا کر

سُنی تھی اور بہت پسند کیا تھا۔"

"مولانا! اسلامی نقطۂ نظر سے اقبال کو کون سی چیز عظمت بخشتی ہے؟"

"اس وقت حقیقت میں ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو مغربی تعلیم پر فخر کرنے والے عام لوگوں سے زیادہ تعلیم پائے ہوئے ہو اور ان سے بڑھ کر ہی مغربی علوم پر نگاہ رکھتا ہو، اور پھر وہ اس پُرزور طریقے سے اسلامی نظریات کی تائید کرے کہ مغرب زدہ لوگ اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہ کرسکیں۔ علّامہ اقبال کا اصل contribution یہ ہے کہ اس وقت جو مغربی علوم و فنون کا رُعب تھا اور ایک عام تصوّر تھا کہ خالص اسلام اِس زمانے میں نہیں چل سکتا۔ مغربی تہذیب سے (Compromise) کرنا ضروری ہے اور اسلامی نظریات کو مغربی نظریات میں ڈھالا جائے ـــــ اِس تصوّر کو اقبالؒ نے توڑا۔ اِس لحاظ سے اُس وقت اسلامی تحریک کے لیے اقبالؒ کی شخصیت اہم سہارا تھی۔ بہ حیثیتِ مجموعی اُنھوں نے جو خدمت سرانجام دی وہ بہت اہم اور قابلِ قدر ہے۔"

(بشکریہ سیّارہ، مئی ۶۳ء)

ریڈیو صوت الاسلام، کو انٹرویو

۱۹۶۳ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو (۱۷، ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ) کو نمائندہ "صوت الاسلام" نے شوبرا ہوٹل میں آپ سے انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو "اکبری حج" موسومہ فراست حج مؤلفہ ملک دین محمد مجروح کراچی کے صفحہ نمبر ۶۲ ۔ ۶۴ سے نقل کیا جا رہا ہے۔

نمبر۱: آپ رابطہ عالم اسلام کے اجتماع میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے ہیں، جناب کی رابطے کے متعلق کیا رائے ہے؟

رابطہ عالم اسلامی کی بنا ابھی پچھلے سال ہی ڈالی گئی ہے۔ گزشتہ ایک سال میں کچھ ابتدائی کام ہوا ہے۔ فی الواقع عالم اسلامی کے درمیان رابطہ و تعلق پیدا کرنے کے لیے مکہ معظمہ سے زیادہ موزوں مقام کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح موتمر عالم اسلامی کے منعقد کرنے کے لیے بھی حج کے موسم سے زیادہ موزوں موقع اور کوئی نہیں ہے، جہاں دنیا بھر کے مسلمان آتے ہیں اور ان میں اہلِ علم اور اصحابِ فکر اور اکابرِ اُمت کی بڑی تعداد موجود ہوتی ہے۔ رابطہ عالم اسلام کے پیشِ نظر ان ہی مواقع سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا، تو ان شاء اللہ یہ ادارہ بڑی مفید خدمت انجام دے گا۔

نمبر۲: اس سال کے حج میں جناب نے کیا محسوس فرمایا؟ کوئی غیر معمولی بات ہو تو ارشاد فرمائیں؟

اس سال ٹرکی اور الجزائر سے حجاج کی بہت بڑی تعداد آئی ہے۔ فرانسیسی حکومت کے زمانے میں بہت ہی کم الجزائریوں کو حج نصیب ہوتا تھا۔ ٹرکی سے پچیس ہزار اور الجزائر سے چھ ہزار حجاج آئے ہیں۔ سعودی حکومت کی طرف سے حجاج کی سہولت کے انتظامات روز بروز ترقی پذیر ہیں۔ اب مکہ معظمہ، منیٰ اور عرفات میں پانی کی مشکلات ختم ہو چکی ہیں۔ عرفات کے لیے بہت سے نئے راستے بن چکے ہیں۔ حرم پاک کی توسیع سب سے بڑھ کر ہے۔ سعودی حکومت حجاج کی تمام مشکلات کو رفع کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔

نمبر۳: مسلمانوں کے عام طور سے دینی انحطاط کا سبب آپ کی نظر میں کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

مسلمانوں کے دینی انحطاط کا سب سے بڑا سبب میرے نزدیک وہ عام جہالت ہے جو مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے جنوب تک تمام دُنیائے اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بہت ہی قلیل تعداد کو چھوڑ کر ہمارے عوام اور خواص سب ہی اسلام کی تعلیمات سے ناواقف ہیں اور جو معاشرہ پہلے اسلامی طریقوں پر قائم تھا اب نہیں ہے۔ اب دُنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کے اندر ایسا معاشرہ باقی نہیں رہا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عادتیں اور خصلتیں عام طور پر اسلام کے رنگ سے عاری ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس وقت شدید ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر اسلام کا علم پھیلایا جائے، اور جو لوگ بھی ہمارے اندر اہلِ خیر و اصلاح باقی ہیں وہ لوگوں کو اسلامی تربیت دینے کی طرف توجہ دیں۔

جماعتِ اسلامی کیسے قائم ہوئی؟

نومبر ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی کا "تحریکِ اسلامی نمبر" شائع ہوا۔ اس میں مدیر "چراغِ راہ" جناب خورشید احمد کے قلم سے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا یہ انٹرویو شائع ہوا۔

جماعتِ اسلامی کیسے قائم ہوئی؟ — کن حالات میں اس کا قیام عمل میں آیا؟ — اس کام کا آغاز کس طرح ہوا؟ — یہ ایسے سوال ہیں جو دل چسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ دل چسپ اس لیے کہ ایک طرف تو وہ لوگ جو اس کے پُرانے ہم سفر ہیں اور ان سوالوں کا تھوڑا بہت جواب انھیں معلوم ہے، ان کے مکمل جواب کے خواہش مند ہیں۔ دوسری طرف "تازہ واردانِ چمن" ہیں، انھیں ان سوالوں سے گہری دل چسپی ہے۔ مشہور عربی مقولہ ہے: کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنھیں جماعت سے تھوڑا بہت قلبی تعلق اور ہمدردی ہے، اس لیے ان کے دلوں میں بھی یہ سوالات یقیناً چٹکیاں لیتے ہوں گے۔

پھر یہ سوالات اہم ہیں، کیوں کہ ایک طرف تو یہ وہ بنیادی سوالات ہیں، جن پر دراصل خود تحریک کا انحصار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو جانے بغیر کوئی شخص بھی جماعت کے طریقِ کار اور اس کی تاریخ سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ مزید برآں جو لوگ اس کے ساتھ شریک ہیں ان کے لیے یہ معلومات وجہِ استقامت ہیں اور دوسری طرف جو لوگ جماعت کی روز افزوں ترقی کا دُور سے تماشا کر رہے ہیں وہ بھی سوچتے ہیں کہ

شاید یہ سب کچھ ایک دم سے ہوگیا ہے ـــــ لیکن ایسا نہیں ہے ـــــ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ـــــ جماعت کی اِس ترقی کے پیچھے ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ اس کی مستقل فکری بنیادیں ہیں، مسلسل جدوجہد اور بے پناہ صبر و استقامت کی کارفرمائی اور برس ہا برس کی پُوری تاریخ اس کے پیچھے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج جماعت اسلامی ایک قوت بن کر اُبھر رہی ہے۔ اس میں اللہ کے بندے برابر شامل ہوتے جا رہے ہیں اور اب اس کی آواز دُور دُور تک جا رہی ہے۔ لیکن کسی کو کیا معلوم کہ آج سے بائیس سال پہلے یہ آواز کتنی نحیف و نزار تھی۔ خلوص سے لبریز ۔ دِل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ـــــ!! یہ اس تحریک کے داعی سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی آواز تھی ـــــ!

کسی تحریک کو چلانا فی الحقیقت جان جوکھوں کا کام ہے، اور خصوصاً مایوس کن حالات، مخالف ماحول اور ناسازگار وقت میں ایک ایسی تحریک کا اجراء ـــــ جو اسلام کو اپنے پُورے عقیدے و نظام کے ساتھ برپا کرنے کے لیے کی جائے ـــــ محض رضائے الٰہی کی خاطر ـــــ جو بے غرض ہو ـــــ نفس کی ہر خواہش سے پاک ـــــ جس میں دنیاوی کوئی فائدہ نظر نہ آئے ـــــ بس " اجرِ آخرت " کا سہارا لے کر اُٹھنا اور بغیر کسی کمزوری کے اس کے لیے جدوجہد کرنا آسان کام نہیں ـــــ قدم قدم پر مخالفتیں، فتوے، قید و بند، خاندان، ماحول، معاشرہ، اقتدار، شیطان اور حزبِ شیطان سے جنگ، نفس سے محاربہ اور اس قسم کی سینکڑوں آزمائشیں راہِ حق کے ادنیٰ مطالبات ہیں۔

بہرحال جماعت اسلامی کیسے قائم ہوئی اور کن حالات میں اس کا آغاز کیا گیا؟ اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ۲۳ ستمبر کو ایک انٹرویو لیا گیا۔ ذیل میں اسی کو ایک مضمون کی شکل میں ترتیب دے رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس کے ذریعے ہم معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ فراہم کر رہے ہیں۔ جو شاید اس

انداز سے سامنے نہ آیا ہو۔ کیوں کہ اس کے راوی خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ مستند اور صحیح جوابات اور کون دے سکتا ہے۔

جماعت اسلامی کی باقاعدہ تشکیل سے پہلے تحریکِ اسلامی کے لیے جدوجہد کا خیال سب سے پہلے کب آیا، یہ خود مولانا کی زبانی سُنیے:

"مَیں نے اس کو ٹھیک اس کی واضح شکل میں تو تقریباً ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں سمجھا۔ ہاں اس سے پہلے ایک ریسرچ اکیڈیمی اور تربیت گاہ میرے پیشِ نظر تھی تاکہ اس کے ذریعے آدمی تیار کیے جائیں۔ کیوں کہ یہ کام ایسا ہے کہ خود آدمی تیار کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ویسے یہ بات کہ ایک باقاعدہ تحریک کی شکل میں آدمی منسلک کر کے تیار کیے جائیں اور اجتماعی جدوجہد برپا کی جائے، خاصی بعد میں پوری طرح واضح ہو کر میرے سامنے آئی۔"

لیکن یہ خیال کیوں پیدا ہوا، وہ کیا حالات تھے جن کی وجہ سے یہ احساس بیدار ہوا؟

"۱۹۲۴ء سے تقریباً ۱۹۳۷ء تک کے حالات بڑے مایوس کُن تھے۔ مسلمان شدید بحرانی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو تحریکِ خلافت ناکام ہو گئی تھی اور اس کے بعد ہی ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے، خود مسلمانوں میں ایسا انتشار پیدا ہو گیا تھا کہ ان کا کوئی حقیقی رہنما یا لیڈر ایسا نہ تھا جس پر وہ پوری طرح اعتماد کر سکیں۔ مسلمانوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ رہا تھا اور وہ آپس میں دست و گریباں تھے۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مایوس ہو گئے تھے۔ ان کے مضامین سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس تجربے نے انہیں مایوس کیا۔ حکیم اجمل خاں مرحوم بھی اُسی زمانے میں مایوس ہوئے۔"

"اس زمانے میں ایک دو سال تو ایسے گزرے کہ وہ میرے لیے بڑے پریشان کُن تھے۔ ظاہر بات ہے کہ میں اُس وقت بالکل نوجوان تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ

میں کوئی تحریک قائم کرسکتا ہوں۔ کیوں کہ صورتِ حال ظاہر تھی کہ جن لیڈروں پر ہمارا اعتماد تھا وہ سارے ناکام ہوتے نظر آرہے تھے اور نہ اُن کے پاس کوئی ایسا پیغام رہا تھا جس سے وہ قوم کو مطمئن کر سکتے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے؟"

"اس زمانے میں بے شمار فکری اور تہذیبی فتنے بھی اُبھرنے شروع ہوئے۔ خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد کوئی چار پانچ سال تو ہندو مسلم فسادات کی نذر ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں میں الحاد اور فسق و فجور نے جڑیں پکڑنی شروع کر دیں۔ اسلام سے انحراف برتا جانے لگا اور یہ دیکھتے دیکھتے ایک طوفان کی شکل اختیار کرنے لگا۔ "نگار"[1] بھی اُسی زمانے کی پیداوار ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے یہاں کی جو دینی درس گاہیں تھیں ان سے بھی بکثرت ایسے لوگ نکل رہے تھے جو اسلام سے ایک حد تک منحرف اور مایوس سے تھے اور نوبت بایں جا رسید کہ لوگ نماز پڑھتے ہوئے شرماتے تھے، خصوصاً ریل میں اور باغوں میں تو نماز پڑھ کر ایک شخص اپنے آپ کو نکّو بنواتا تھا۔"

"اس زمانے میں سوچتے سوچتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان حالات کے مقابلے میں کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ باقاعدہ کوشش کے بغیر اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی ممکن نہیں۔"

"گویا سب سے پہلے آپ نے فکری محاذ پر کام کرنے کا منصوبہ بنایا؟" مولانا سے سوال کیا گیا۔

"جی ہاں، اس وقت میرے ذہن میں یہی تھا کہ سب سے پہلے فکری میدان

---

[1] ماہنامہ "نگار" کا اجراء ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ ہوا۔ نیاز فتحپوری اس کے مدیر تھے۔ بعد میں مدیر اور رسالہ دونوں کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ آج کل اس کے ایڈیٹر فرمان فتحپوری اور عارف نیازی ہیں۔

میں کام کیا جائے۔ پھر کچھ آدمیوں کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے اور بالآخر کوئی اجتماعی جدوجہد کی جائے۔"

چنانچہ فکری میدان میں مولانا مودودیؒ نے پورے انہماک اور خلوص و جذبے کے ساتھ کام کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ نے اپنے آپ کو تیار کیا۔ دن رات مطالعہ کیا۔ غور و فکر سے کام لیا اور لائبریریوں کی لائبریریاں ہضم کیں۔ پھر مضامین لکھے اور ان کے ذریعے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ ان کی قوتِ عمل کو بیدار کیا اور انھیں ملک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ان کے انجام سے انھیں خبردار کیا۔ چنانچہ "الجہاد فی الاسلام"، "ترجمان القرآن" کے مضامین اور "سیاسی کش مکش" کے مقالات آج بھی اس علمی جہاد کے زندہ نقش ہیں۔

"فکری جدوجہد کے بعد میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ مجھے آگے بڑھ کر کچھ کرنا چاہیے۔ لیکن تھوڑی سی جھجک تھی کہ نہ معلوم میری آواز پر کوئی لبیک کہے گا یا نہیں۔ میں یہ تحریک چلا سکوں گا یا نہیں۔ لیکن پھر مَیں نے سوچا تو اِس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب کچھ تجربہ بتائے گا۔ اگر کوئی اور آدمی آگے بڑھ کر یہ کام کرنے والا نہیں ہے تو مجھے ہی اس کو کرنا چاہیے۔"

"آپ نے اِس سلسلے میں دُوسروں سے کس حد تک تعاون کے لیے درخواست کی اور اس کام پر اُکسایا؟" اگلا سوال کیا گیا۔

"اس سلسلے میں سارا انحصار میں نے ترجمان القرآن اور ان دعوتی اعلانات پر کیا جو اس پرچے میں شائع ہوتے تھے۔ جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان سے گفتگو کی۔ خطوط میں نے بہت کم لکھے۔ شائع شدہ تحریروں اور ملاقاتوں سے زیادہ کام لیا ــــ اس کام میں مَیں نے جلد بازی سے بالکل کام نہیں لیا۔ مثلاً کوئی بڑی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس میں کچھ لوگ بُلائے جائیں ــــ میں نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا ــــ مَیں تو بہت چھوٹے آغاز کا قائل ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے

کہ جو بھی اچھے اور قابلِ اعتماد آدمی مجھے مل سکیں ان کو سمیٹوں اور کام شروع کروں۔"

"جماعت کی تشکیل کے وقت آپ کو کتنے افراد مل سکے؟"

"پہلی مرتبہ تو جماعت کی تشکیل کے وقت تقریباً ۱۵۰ افراد نے ہماری دعوت پر لبیک کہی اور عملاً جماعت میں ۷۵ افراد آئے اور یہی ہماری اوّلین تعداد تھی۔"

"جماعت کے اِس آغاز پر آپ کا تاثر کیا تھا؟"

"مَیں اس وقت پُوری طرح سمجھ رہا تھا کہ اس سے زیادہ بہتر آغاز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ میں پکاروں گا تو ہزاروں آدمی میری آواز پر لبیک کہیں گے۔"

"کیا جماعت — آغاز سے اب تک جس رفتار سے آگے بڑھی ہے وہ قابلِ اطمینان ہے؟"

"جی ہاں! اس کام کی فطری تدریج یہی ہے۔ جس رفتار سے جماعت اسلامی نے قدم بڑھائے ہیں اگر اس سے زیادہ تیز رفتاری برتی جاتی تو ہم نہیں سنبھال سکتے تھے۔"

———— ⁂ ————

تحریکِ اسلامی کا مستقبل

ماہنامہ "چراغِ راہ"، کراچی نے نومبر ۱۹۶۳ء میں "تحریکِ اسلامی نمبر" شائع کیا تو اس میں "تحریکِ اسلامی کا مستقبل" کے موضوع پر مولانا مودودیؒ سے انٹرویو لیا گیا جس میں آپ سے مندرجہ ذیل سوالات دریافت کیے گئے:

(۱) آپ کی نگاہ میں آنے والے دَور میں تحریکِ اسلامی کو کن خاص مسائل سے سابقہ پیش آئے گا اور ان کا مقابلہ کس طرح ہو سکتا ہے؟

(۲) دعوت کی راہ میں اصل مشکلات کیا ہیں اور جماعت اسلامی ان کو کس طرح دُور کر رہی ہے؟ اور آئندہ اس کو کیا کرنا چاہیے؟

(۳) بین الاقوامی حالات کے کیا اثرات تحریکِ اسلامی پر پڑیں گے؟

(۴) اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمیں ابھی کیا کچھ کرنا ہے؟

جواب:

میں تحریکِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں بے حد پُر امید ہوں۔ حق و باطل کی جو قوتیں آج برسرِ پیکار ہیں، جب ہم ان کو دیکھتے ہیں اور ان کے حالات کا موازنہ کرتے ہیں، تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ حالات اسلام کی کامیابی اور سربلندی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ میں جن وجوہ کی بنا پر یہ بات کہتا ہوں وہ یہ ہیں:

۱- اسلام کے علاوہ جتنے بھی نظریات ہیں ان سب کو دورِ حاضر میں جانچ اور پرکھ کر دیکھا جا چکا ہے اور وہ سب ناکام رہے ہیں۔ باطل قوتوں کے پاس آج کوئی نظریہ باقی نہیں رہا ہے ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں فی الواقع لوگوں کے لیے کشش ہو۔ ہم اس بات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ انھیں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آنا پڑتا ہے۔ ان کے کھوکھلے پن کا اس سے واضح ثبوت اور کیا ہوگا۔

۲- اس ملک میں جتنے بھی گروہ اور جتنی بھی قوتیں موجود ہیں وہ ایک ایک کرکے آزمائش کے مقام پر آتی چلی جارہی ہیں، اور اپنی نااہلی اور نالائقی ثابت کرتی چلی جارہی ہیں۔ خواہ آپ سیاسی گروہوں کو لیں، خواہ دُوسرے طبقات کو، ہر ایک آزمائش کی کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں قوم ان میں سے ایک ایک سے مایوس ہوتی جارہی ہے اور ایک وقت آئے گا کہ وہ ان سے بالکل مایوس ہو جائے گی۔ اور قوم میں خود ہی کسی قابلِ اعتماد عنصر کے لیے پیاس پیدا ہوگی۔ بلکہ ان حضرات کی کارگزاریوں کی وجہ سے پیدا ہونی شروع بھی ہوگئی ہے۔ جیسے جیسے یہ پیاس بڑھے گی ـــــ اور اسے لازماً بڑھنا ہے ـــــ ویسے ہی ویسے اِن شاء اللہ تحریکِ اسلامی کے لیے مواقع پیدا ہوتے جائیں گے۔

۳- باطل کی قوتیں اگر متحد ہوتیں تو پھر شاید کچھ خطرناک ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ایک دُوسرے کا حریف اور دشمن بنادیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی طاقت کو توڑنے اور اس کے اعتماد کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ ان کی مخالفت میں بہت سا کام جو تعمیری قوتوں کو کرنا تھا یہ حضرات خود اپنے ہی ہاتھوں کر رہے ہیں۔ اس نے تحریکِ اسلامی کی قوت کو بڑھادیا ہے۔

۴- جن حالات سے آج ہمیں سابقہ پیش ہے اور جس سمت میں اس ملک کو لے جایا جارہا ہے وہ ہمارے لیے بے شمار مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ خصوصیت سے

معاشرے میں جو بگاڑ راہ پا رہا ہے اور جس تیزی سے بڑھ رہا ہے وہ انتہائی تشویشناک ہے۔ ہمارے پاس اس وقت وہ ذرائع موجود نہیں جن سے ہم اس کو روک سکیں۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اس بگاڑ کے باوجود تحریکِ اسلامی کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ ہم اس مفروضے پر تو کام کر نہیں رہے کہ شیطان کو معزول کر دیا جائے گا۔ اور ہمیں کھلی چھٹی مل جائے گی۔ یا تحریکِ اسلامی کے لیے کوئی ایسا مخصوص میدان ہے جہاں شیطان کا عمل دخل نہ ہو۔ ہم اس قسم کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ اور ان ہی حالات میں اپنے لیے راہ نکال رہے ہیں اور ان شاء اللہ اس میں کامیاب ہوں گے۔

جو لوگ حالات کے بگاڑ سے مایوس ہو جاتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ اس سے بدرجہا زیادہ خراب حالات کے باوجود اور انتہائی جبر و تشدد کے استعمال کے باوجود آج تک روس سے اسلام کو خارج نہیں کیا جا سکا۔ ترکی میں اسلام کو غیر موثر بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا؛ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ وہاں آج بھی اسلام کے ساتھ دلچسپی اسی طرح ہے۔ یہ اُن قوموں کا حال ہے جہاں دین سے انحراف اور معاشرتی بگاڑ کے خلاف کوئی جوابی چیز موجود نہ تھی، جہاں لوگوں کے لیے دُور دُور تک اُمید کی کوئی شعاع نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسلام سے وابستہ رہے اور کوئی طاقت اسلام کو مٹا نہ سکی۔ ہمارے ملک میں ایک مثبت جوابی تحریک موجود ہے۔ یہ مسلسل کام کر رہی ہے۔ لوگوں کو ایک سہارا نظر آتا ہے۔ اِس لیے بگاڑ کی رفتار خواہ کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو مجھے مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بلکہ جب خود اسلامی تحریک کی ترقی اور اس کے اثرات کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سر خُدا کے حضور شُکر سے جھک جاتے ہیں۔ میرے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی مایوسی کے جذبات نہیں پیدا

ہوتے۔ میں حالات کو ہر لحاظ سے اُمید افزا سمجھتا ہوں۔

۵۔ پھر مجھے اس بات پر مکمل یقین ہے کہ اگر کسی حق بات کے لیے موزوں طریقے پر کام کیا جائے اور کام کرنے والے بھی موزوں ہوں اور کام بھی حکمت و دانش مندی کے ساتھ کیا جائے تو ناکامی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ کام یابی ناگزیر ہے۔ حق کی فطرت میں کام یابی ہے۔ ضرورت جس اَمر کی ہے وہ موزوں طریقے پر صیح آدمیوں کے ذریعے اور حکمت و تدبر کے ساتھ کام کرنا ہے اور الحمدللہ یہ کام ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تحریکِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ پُرامید رہا ہوں اور آج بھی پُرامید ہوں۔ اِن شاء اللہ اسلام غالب ہو کر رہے گا۔

تحریکِ اسلامی اور مولانا مودودی

مَیں:- مولانا! ایک نازک سا سوال آپ سے پُوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یہاں تحریکِ اِسلامی کے مستقبل کی بات جب بھی چھڑتی ہے بات خود آپ کی ذات تک پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر سلامت رکھے لیکن بہرحال ہر شخص کے لیے ایک مدّت معیّن ہے۔ اس پہلو سے تحریک کے مستقبل کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

مولانا:- مَیں نے ہمیشہ اس بات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور جماعت کے پُورے کام میں اپنے ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں کہ اس کام کے ہونے کی اصل وجہ وہ نظریہ ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے نہ کہ کوئی شخص۔ اس نظریے نے ہمیشہ انسان پیدا کیے ہیں اور سینکڑوں اور ہزاروں انسان پیدا کیے ہیں۔ یہ نظریہ آئندہ بھی ایسے ہی اور اس سے بہتر انسان پیدا کر سکتا ہے اور اِن شاء اللہ کرے گا۔ مجھے اِس پہلو سے کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ میں مستقبل کے بارے میں بڑی اچھی اُمیدیں

رکھا ہوں ۔ جس اللہ نے آج اپنے کچھ بندوں کو اپنے دین کی خدمت کی کچھ توفیق بخشی ہے وہ آئندہ بھی کچھ دوسرے لوگوں سے یہ کام لیتا رہے گا۔

پھر یہ پہلو بھی آپ سامنے رکھیں کہ میں کام انفرادی طور پر نہیں کر رہا ہوں، ایک نظامِ جماعت کے ساتھ کر رہا ہوں ۔ اور میں ہوں یا نہ ہوں اِن شاء اللہ یہ نظامِ جماعت موجود ہوگا اور اسی طرح کام کرتا رہے گا ۔ میں دو بار خاصی لمبی لمبی مدت کے لیے جیل گیا لیکن آپ نے دیکھا کہ الحمدللہ میرے بغیر بھی یہ نظام کام کرتا رہا۔ پھر مایوس ہونے کی کیا وجہ ہے ۔

سب سے اہم چیز یہ یاد رکھیے کہ جو کام ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہو رہا ہے ۔ اگر اس کی مشیّت یہ ہے کہ یہ کام ہو، تو جب تک میں کام کر سکتا ہوں وہ مجھ سے یہ کام لے لے گا، اور جب میں نہ رہوں گا تو اپنے کسی اور بندے سے یہی کام لے لے گا ۔ اور اگر اللہ کی مشیّت یہ ہے کہ یہ کام نہ ہو تو میں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمیں اپنے خدا پر بھروسا ہے، اور اگر اسے یہ کام منظور ہے تو اِن شاء اللہ یہ ہو کر رہے گا ۔

تحریکی زندگی کے یادگار واقعات

> مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تحریکِ اسلامی کے داعی ہیں اور اُن کی زندگی میں یقیناً ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو اُن کی تحریکی زندگی پر اثرانداز ہوئے ہیں۔ لیکن مولانا مودودیؒ کی طبیعت میں ایک غیر معمولی ٹھہراؤ ہے۔ وہ کسی واقعے کا بہت زیادہ اثر قبول نہیں کرتے۔ اور ایک آدمی کے لیے ان کے چہرے سے اُن کے تاثرات کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ اور ان سے ان واقعات یا تاثرات کی تفصیل معلوم کرنا دشوار تر ہے۔ ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی نے نومبر ۱۹۶۳ء میں "تحریکِ اسلامی نمبر" شائع کیا تو تحریک کے نمایاں افراد سے مذکورہ عنوان کے تحت اِنٹرویو لیے گئے۔ مولانا مودودیؒ صاحب سے جو انٹرویو لیا گیا اُسے سید موسیٰ احسن نے مرتب کیا تھا۔

س: کیا آپ اپنی زندگی کے کچھ غیر معمولی اہمیت کے واقعات ہم کو بتائیں گے؟

ج: ڈائری لکھنے کا عادی نہیں اور ان باتوں کے متعلق بیٹھ کر سوچا نہیں کرتا۔ کوئی موقع ہوتا ہے تو کوئی بات آجاتی ہے۔ سلسلۂ بیان میں مناسبت رکھنے والا کوئی واقعہ زبان پر آجاتا ہے۔ لیکن میں نے نہ کبھی ان کی فہرست بنائی ہے اور نہ کبھی اس کے لیے سوچا ہی ہے۔ کبھی کبھار اتفاق سے کوئی غیر معمولی

بات پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر نہ تو میں کسی بات سے بہت زیادہ خوش ہونے والا ہوں اور نہ ہی زیادہ غم گین ہونے والا۔

س: کیا آپ پر کبھی ایسا بھی وقت آیا ہے کہ آپ کو کھانے کے لیے صرف رُوکھی سُوکھی روٹی ہی میسّر آئی ہو؟

ج: جی، ایسا تو نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔ لیکن ایک مرتبہ صرف یہ ہوا کہ خیال آیا کہ شاید آج فاقے کی نوبت آئے۔ لیکن اس کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ بھیج دیا۔ خُدا کا شکر ہے کہ آج تک اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ اس وجہ سے کہ چوں کہ مَیں برسوں تنہا رہا ہوں اور بسا اوقات میں خود ہی کھانا پکا لیا کرتا تھا۔ بلکہ کبھی تو اپنے کام میں انہماک کی وجہ سے اتنی بھی فرصت نہ ملتی تھی کہ کھانا تیار کر سکوں۔ اگر کھانے کا وقت آگیا تو مَیں نے کیلئے منگا لیے اور کھا لیے۔

س: آپ کس وقت زیادہ بیٹھ کر کام کرتے رہے ہیں اور کتنے گھنٹے؟

ج: میں ہر وقت کام کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ میں دیکھوں کہ دن کو فرصت ہی نہیں ملتی تو عموماً میں رات ہی کو کام کرتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں عشاء کی نماز سے فجر کی نماز تک مسلسل کام کرتا تھا۔ پھر دن میں بھی لوگ آتے رہتے تھے اور بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

س: یہ تحریکی کام اور ان حالات میں آپ آخر اپنی صحت کا کتنا خیال رکھتے ہیں؟

ج: صحت کی طرف سے مَیں ایک مدت تک بے پَروا رہا ہوں، بلکہ ایک زمانے میں تو مَیں یہ سمجھتے ہوئے کام کر رہا تھا کہ بہر حال مجھے اپنی طاقت لگا دینی ہے خواہ کچھ بھی اس کے نتائج ہوں۔ مَیں اُس زمانے میں تقریباً (Desperate) ہو کر کام کر رہا تھا۔ کوئی پروا نہ تھی کہ کیا (Strain) پڑ رہا ہے اور صحت پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک میں اسی طرح کام کرتا رہا۔ کوئی مددگار

نہ تھا، تنہا کام کر رہا تھا ۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ کام چلے یا نہ چلے اس کے لیے جو کچھ میں کر سکتا ہوں وہ تو کر ڈالوں ۔ بہر حال کوئی یقین تو تھا نہیں کہ ساتھی مل جائیں گے اور جس کام کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں اس میں کامیابی بھی ہوگی ۔

س : کیا آپ کو ساتھیوں کے ملنے اور تحریک کے بڑھنے سے کوئی خوشی ہوئی ہے ؟

ج : جی ہاں ! وہ تو ظاہر بات تھی کہ قدرتی طور پر ہونی چاہیے ۔

س : جب پہلی مرتبہ آپ کو جیل بھیجا گیا تو اُس وقت آپ کا کیا تاثر تھا ؟

ج : میں پہلے ہی سے سمجھ رہا تھا کہ یہ مرحلہ لازمی طور پر آنا چاہیے اور یہ میری توقعات کے خلاف بھی نہ تھا بلکہ میں اس کا متوقع تھا ۔ مجھے اس سے کبھی کوئی صدمہ نہیں ہوا ۔

س : پہلی مرتبہ جب آپ جیل گئے ہیں اور بیس ماہ تک وہاں رہے ہیں تو رہائی کے وقت آپ کا تاثر کیا تھا ؟

ج : اس موقعے پر کوئی خاص خوشی میں نے محسوس نہیں کی اور نہ کوئی غم بڑے اطمینان سے جیل میں بیٹھا کام کرتا رہا ۔ حکام ہر چھٹے مہینے اس کی توسیع کر دیتے تھے ۔ ایسا نہیں ہوا کہ میں دن گنتا رہا ہوں کہ بس اب رہائی کا زمانہ قریب آگیا ہے ۔ سمجھتا تھا کہ بھلا یہ کب چھوڑنے والے ہیں ۔ میں بالکل پہلے سے تیار رہتا تھا کہ اب یہ توسیع فرمائیں گے ۔ اس زمانے میں جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت تھی ان کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں ۔ اسی لیے میں توقع ہی نہیں رکھتا تھا کہ چھ مہینے کے بعد یہ توسیع نہیں فرمائیں گے ۔ میں ہر توسیع کو اپنی توقع کے مطابق وصول کرتا تھا اور اس کے بعد پھر اطمینان سے بیٹھ کر کام شروع کر دیتا ۔ مجھے رہائی کا کوئی شوق ذوق نہ تھا ۔

س : کیا آپ کو سزائے موت کی اُمید تھی ؟ جب سزائے موت کی خبر آپ کو ملی

اُس وقت آپ کا کیا تاثر تھا؟

ج: اصل میں یہ چیز کچھ مشتہر کرنے کی ہے نہیں۔ اس کے جواب میں جو کچھ مَیں آج کہوں گا اسے غلط معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ دراصل میں ایک مدت سے اس بات کا متمنی ہوں کہ موت آئے تو بعد کا مرحلہ بھی دیکھ لوں۔ اِس وجہ سے مجھے ایک تو یہ بڑا اطمینان ہوا کہ چلیے اب موت کے دروازے سے گزر کر عالمِ آخرت کو دیکھنے کا موقع ملے گا اور دوسرے یہ کہ مَیں اُس شخص کا شکر گزار ہوں گا، جو مجھے شہید کر دے تاکہ نجاتِ اُخروی یقینی ہو جائے۔ اِس وجہ سے مجھ پر ذرہ برابر بھی غم کی کیفیت طاری نہیں ہوئی بلکہ مَیں ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا تھا۔ البتہ مَیں یہ ضرور سمجھتا تھا کہ یہ حضرات شاید ہی مجھے پھانسی دینے کی ہمت کر سکیں۔ لیکن یہ بھی سوچتا تھا کہ ان لوگوں کا کیا بھروسا! مجھ سے نجات تو پانا ہی چاہتے ہیں اور میرا وجود ان کو سخت ناگوار ہے۔ ممکن ہے اِس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر یہ کارروائی کر گزریں۔ میری خواہش تھی کہ کاش یہ ایسا ہی کریں۔ اِسی وجہ سے مَیں پوری طرح مطمئن اور خوش تھا۔ [1]

---

[1] ۱۹۵۳ء میں مختلف مکاتیبِ فکر کے اکتیس سرکردہ علماء کے تاریخی اجتماع کراچی میں علماء نے بالاتفاق ایک بائیس نکاتی فارمولا حکومت کو پیش کر کے حکومت کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ تقریباً دو سال تک یہ کش مکش جاری رہی۔ آخر تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے ڈائرکٹ ایکشن شروع کرایا گیا۔ چند روز کی قتل و غارت گری کے بعد مارشل لاء لگا دیا گیا اور مولانا مودودیؒ اور اُن کے رفقاء گرفتار کر لیے گئے۔ فوجی عدالت نے مولانا کو موت کی سزا کا حکم سنایا۔ لیکن مسلمانانِ عالم کے دباؤ سے مجبور ہو کر پہلے سزائے موت عمر قید میں تبدیل کی گئی۔ بعد ازاں ۲۹ اپریل ۱۹۵۵ء کو ہائی کورٹ کے حکم کے ذریعے مولانا پچیس ماہ کی قید سے رہا ہوئے۔

س: کوئی خاص واقعہ آپ کی زندگی میں ایسا ہوا ہے جس نے آپ کو اس طرف موڑا؟

ج: مَیں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں کہ کوئی خاص واقعہ مجھے کسی طرف موڑ دے۔ میں سوچ سوچ کر غور و فکر کر کے کسی طرف بتدریج جاتا ہوں۔ صرف ایک خاص واقعہ تھا جس نے مجھے بہت زیادہ چونکا دیا:

۱۹۳۶ء میں حیدر آباد سے نو سال کے قیام کے بعد جب مَیں دہلی پہنچا تو محسوس کیا کہ اتنے عرصے میں مسلمانوں کی اسلام سے دُوری کی بڑی تیز رفتار رہی ہے۔ حیدر آباد میں صورتِ حال وہ نہیں تھی جو دہلی میں آکر محسوس ہوئی۔ مسلمان شرفاء کی ان خواتین کو کُھلم کُھلا بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھا جن کے متعلق میں یہ تصوّر نہیں کر سکتا تھا، اس چیز نے مجھے چونکایا۔ دہلی کے حالات کی بنا پر راتوں مجھے نیند نہ آتی کہ یہ کیا ہو گیا اور نو سال کے اندر اتنا بڑا تغیر؟ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ کانگریس کی وزارتیں تھیں۔ جب ۱۹۳۷ء میں میں واپس حیدر آباد جا رہا تھا تو میرے ڈبے میں ایک کانگریسی لیڈر بھی سفر کر رہے تھے۔ ان سے کچھ مسلمان بات کرنے لگے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ جیسے اب کانگریسی لیڈر ہی اس ملک کے حکمران ہیں اور مسلمان ان کی رعیّت۔ گویا یہ مانگنے والے ہیں اور وہ دینے والے۔ ان لوگوں کی ساری گفتگو میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ میرے سامنے پُورا نقشہ آگیا کہ اب مستقبل میں مسلمانوں کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اسی واقعے کے بعد میں نے "سیاسی کش مکش حصہ اوّل[1]" لکھی۔ حیدر آباد میں میں اخبارات کے ذریعے جن حالات کا ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکا تھا ان کو دیکھ کر اور چل پھر کر مَیں نے محسوس کیا۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھے اجتماعی جدوجہد کی تحریک کی۔

---

[1] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" حصّہ اوّل مُراد ہے۔

س : تحریکی زندگی میں سب سے زیادہ سخت دن آپ کے لیے کون سا تھا ؟

ج : ایسے متعدد مواقع آئے ہیں جب مجھے خاص تکلیف پہنچی ۔ مثلاً جماعت بننے کے تھوڑی ہی مدت کے بعد بعض حضرات جس دھوم دھام سے الگ ہوئے وہ میرے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ حالاں کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ تحریک اور جماعت کو ختم نہیں کر سکتے ۔ لیکن پھر بھی مجھے اس سے بڑی روحانی اذیت پہنچی ۔ البتہ ان کے بعد جو لوگ خلوص سے میرے ساتھ آئے ان پر مجھے زیادہ اطمینان اور بھروسا تھا۔

اِسی طرح لاہور میں جب پہلا مارشل لاء لگا تھا، اُس زمانے میں بھی جو اطلاعات مجھے جیل میں مل رہی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی وجہ سے نہ صرف تحریکِ اسلامی بلکہ بجائے خود دین اور اس کے تمام پہلوؤں پر خاص ضرب پڑتی ہے، ان دنوں خاصی اذیت محسوس کر رہا تھا لیکن میرے لیے کچھ کرنا ممکن نہ تھا ۔ اور پھر قریب کے زمانے میں جماعت میں ایک اور جو بحران کا دَور آیا ہے یہ بھی میرے لیے چند دنوں تک تو شدید پریشانی کا باعث رہا ۔ لیکن مجھے اطمینان تھا کہ جماعت اور اس تحریک کو اِن شاء اللہ کوئی خاص نقصان نہیں پہنچے گا ۔ چنانچہ بعد کے حالات نے اِس کی تصدیق کر دی ۔

رابطۂ اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی

نومبر ۱۹۶۳ء میں مولانا مودودیؒ رابطۂ عالمِ اسلامی کے چوتھے ششماہی اجلاس میں شرکت کے لیے مکّہ معظمہ تشریف لے گئے۔ رابطہ کا اجلاس یکم دسمبر سے شروع ہوا اور ۱۲؍ دسمبر تک مسلسل اجتماعات ہوتے رہے۔ رابطہ کے کُل تیرہ عام اجلاس ہوئے۔ رابطہ کی مجلس تاسیسی کے اراکین کی تعداد ستائیس ہے۔ اس اجلاس میں ہندوستان، الجزائر اور مراکش کے نمائندے بوجوہ شریک نہ ہوسکے۔ پاکستان، سعودی عرب، فلپائن، ملایا، سیلون، عراق، شام، اُردن، لبنان، سوڈان، سینی گال، موریطانیہ، افغانستان، فارموسا اور مرکزِ اسلامی جنیوا کے نمائندے شامل تھے۔ رابطہ کے اس اجلاس میں کئی اہم فیصلے ہوئے۔ مولانا مودودیؒ نے اس دوران مدینہ یونیورسٹی کی سپریم کونسل کے اجلاس میں بھی شرکت کی۔ تین ہفتے کے بعد مولانا مودودیؒ جب وطن واپس ہوئے تو جناب ممتاز لیاقت نمائندہ "شہاب" نے ایک مفصل انٹرویو لیا جو اس ہفت روزہ کی دو اشاعتوں (۲۹؍ دسمبر ۱۹۶۳ء اور ۵؍ جنوری ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔

رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں کیے گئے فیصلوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ رابطہ کا یہ اجلاس اپنے فیصلوں کی بنا پر دُور رس نتائج کا حامل ثابت ہوگا۔

آپ نے کہا کہ اِس اجلاس میں طے کیا گیا کہ :

۱- اِس وقت جو موتمرات اسلامی قائم ہیں ان میں وحدت و تعاون کی راہیں پیدا کرنے کے لیے کچھ ضروری تجاویز رابطہ کی طرف سے مرتب کی گئی ہیں اور انھیں موتمر عالم اسلامی بیت المقدس اور کراچی کے موتمر عالم اسلامی سے گفت و شنید کرنے کے بعد آخری شکل دی جائے گی۔

۲- رابطہ عالم اسلامی نے اپنے گزشتہ اجلاس میں قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں تراجم شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا فرض علّامہ محمد اسد کو تفویض کیا گیا تھا۔ ان کی پہلی جلد زیرِ طبع ہے اور عنقریب منظرِ عام پر آجائے گی۔ پُورے قرآن مجید کا ترجمہ اِن شاء اللہ تین جلدوں میں شائع ہوگا۔ اِسی طرح جاپانی زبان میں ترجمہ بھی رابطہ کی طرف سے کرایا جا رہا ہے۔ اس کی پہلی جلد طباعت کے لیے تیار ہے۔ اِس اجلاس میں نائیجریا کی یوروبا زبان میں قرآنِ پاک کا ترجمہ کرنے کا انتظام کر دیا گیا ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمام مصارف رابطۂ عالمِ اسلامی برداشت کرے گی۔

۳- افریقہ کے نوآزاد ممالک کے متعلق رابطہ نے فیصلہ کیا کہ تمام ملکوں کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں اور یہ معلوم کیا جائے کہ مسلمانوں کے حالات کیسے ہیں اور انھیں کس قسم کی مدد درکار ہے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اِن ممالک میں اشاعتِ اسلام کے لیے حسبِ ضرورت معلمین بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور اس سلسلہ میں سرِدست دس معلمین بھیجنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۴- رابطہ نے حج کے اجتماع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ایک مفصل پروگرام بنایا

ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ حج کے موقع پر مختلف ممالک سے جو اہلِ علم اور بااثر لوگ آتے ہیں ان کو جمع کر کے مجالس مذاکرہ منعقد کی جائیں، اور اس میں مختلف مسلمان ملکوں کے حالات و مسائل کا جائزہ لیا جائے۔ نیز ایسے وفود کا تقرر عمل میں لایا جائے جو مختلف ممالک سے آئے ہوئے حاجیوں کی قیام گاہوں پر جا کر ان سے تعارفِ باہمی کے مواقع پیدا کریں۔ یہ بھی طے ہوا کہ مختلف ممالک سے آنے والے حاجیوں کے لیے ان کی اپنی زبانوں میں ایسی تقریروں کا انتظام کیا جائے جو مسائلِ حج کے علاوہ دینی و اخلاقی اصلاح کے پہلوؤں پر حاوی ہوں۔ نیز دینی تعلیمات پر مشتمل لٹریچر بھی حاجیوں میں تقسیم کیا جائے۔ یہ لٹریچر خصوصیت سے انگریزی، فرانسیسی، انڈونیشی، اُردو، فارسی اور ترکی زبان میں شائع کیا جائے گا۔

۵۔ مذکورہ سالانہ مجالسِ مذاکرہ کے علاوہ ہر پانچ سال بعد مکہ معظمہ میں موتمر عالمِ اسلامی منعقد کی جایا کرے گی اور اس میں شمولیت کے لیے تمام مسلم ممالک کے نمائندوں کو دعوت دی جایا کرے گی۔ اس پنج سالہ موتمر کو رابطہ عالمِ اسلام کا انتخابی ادارہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ موتمر رابطہ کی مجلسِ تاسیسی کے ارکان کا انتخاب کرے گی اور رابطہ اس کے کیے گئے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذمّہ دار ہوگا۔

۶۔ اِس اجلاس میں رابطہ کے آئندہ کام کے لیے ایک مفصّل نقشۂ کار مرتب کیا گیا ہے جو چار بڑے بڑے شعبوں پر مشتمل ہے۔ ایک شعبہ تبلیغِ اسلام کا ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں میں لٹریچر اور مبلغین کے ذریعے اشاعتِ اسلام کرے گا۔ دوسرے شعبے کے ذمّے اسلام کے خلاف مستشرقین اور عیسائی مبلّغین کے حملے کا مقابلہ کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ تیسرا شعبہ دنیا کے جن حصّوں میں مسلمان جہالت اور اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں ان کو اُٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اِس سلسلے میں معلّمین بھی مہیّا کیے جائیں گے اور مختلف پسماندہ قوموں کی زبان میں دینی لٹریچر

بھی تیار کر کے شائع کروایا جائے گا۔ چوتھے دُنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان مظلوم اور اپنے حقوق سے محروم ہیں خواہ وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، ان کی حمایت کے لیے تمام ممکن تدابیر استعمال کی جائیں گی۔ مثلاً دنیا کو ان کی مظلومیت سے آگاہ کرنے کے لیے نشر و اشاعت کی جائے گی اور جو مسائل اقوامِ متحدہ میں لائے جا سکتے ہوں ان کی حمایت کے لیے مسلمان حکومتوں کو آمادہ کیا جائے گا۔

۷۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ پوپ کی آئندہ زیارتِ بیت المقدس کے موقع پر ایک وفد ان سے مل کر ان کے سامنے مسئلہ فلسطین کی تمام تفاصیل پیش کرے۔ کیوں کہ یہ سفر بظاہر بیت المقدس کو ایک بین الاقوامی شہر بنانے کی تمہید معلوم ہوتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ عملاً اسرائیل کے لیے بیت المقدس کا راستہ کھل جائے۔

۸۔ اریٹریا کے متعلق طے کیا گیا کہ مسلمان حکومتوں کو اس مسئلہ کو اقوامِ متحدہ میں اُٹھانے کے لیے آمادہ کیا جائے۔

۹۔ رابطہ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ جنرل فرانکو سے درخواست کی جائے کہ وہ قرطبہ کی جامع مسجد کو واگزار کرائیں اور کم از کم آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے اس کی اصلی حالت میں محفوظ کر دیں۔ نیز شاہ سعود سے درخواست کی گئی کہ وہ میڈرڈ میں ایک مسجد بنا دیں، جس کے لیے جنرل فرانکو کی حکومت اجازت دے چکی ہے۔

۱۰۔ ہسپانوی زبان میں اندلس کے اسلامی دَور کی تاریخ و ثقافت کے متعلق خاص خاص کتابوں کے ترجمے شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۱۔ نیز یہ طے ہوا کہ اشاعتِ اسلام کے لیے فلپائن، کوریا، سوڈان، نائیجیریا اور بعض دُوسرے ملکوں میں جو ادارے کام کر رہے ہیں اور مرکزِ اسلامی جنیوا کی مالی امداد کی جائے۔

مدینہ یونیورسٹی

مدینہ یونیورسٹی کی سپریم کونسل کے اجلاس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ مدینہ یونیورسٹی کو قائم ہوئے دو سال بیت چکے ہیں اور اس وقت سینتالیس ملکوں کے پانچ سو سے زائد طلبہ حکومت سعودی عرب کے خرچ پر زیرِ تعلیم ہیں۔ لیکن اس وقت تک جامعہ عارضی قواعد و ضوابط کے تحت کام کر رہا تھا۔ جامعہ مدینہ کا اجلاس ۱۴ دسمبر سے شروع ہوا جس کی صدارت وائس چانسلر جامعہ مدینہ عبدالعزیز بن باز نے کی۔

اس اجلاس میں میرے علاوہ مفتیٔ فلسطین امین الحسینی، سعود یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعزیز، مفتیٔ اُردن شیخ عبداللہ قلقیبی، پرنسپل شریعت کالج دمشق مولانا محمد المبارک شامی یونیورسٹی کے پروفیسر مصطفیٰ زرقہ، عراق کے سابق وزیر اوقات اور عراقی علمی اکیڈمی کے صدر محمد بہجت اثری، اور شیخ محمد محمود کے علاوہ مدینہ یونیورسٹی کے تین اساتذہ نے شرکت کی۔

موجودہ اجلاس میں مستقل قواعد و ضوابط کے تعین کے علاوہ جامعہ کے نصابِ تعلیم پر بھی نظرِثانی کی گئی۔ مولانا نے فرمایا کہ جب تک قواعد و ضوابط مرتب نہ ہو گئے میں نے اجلاس میں مسلسل شرکت کی۔ لیکن بعدازاں جب نصابِ تعلیم زیرِ غور تھا، میں اپنی ترامیم فُل اسکیپ کے سات صفحات پر مرتب کر کے نصاب کمیٹی کو دے کر واپس آگیا، کیوں کہ مجھے ملک سے باہر گئے کافی دن ہو گئے تھے۔

مولانا نے جامعہ مدینہ کے نصاب میں ترمیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ دو سال کے تجربے سے بعض کمیاں سامنے آئی ہیں اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر پسماندہ ممالک سے ایسے نوجوان حصولِ تعلیم کے لیے جامعہ میں آتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ عربی زبان سے شناسا نہیں ہوتے بلکہ دینی تعلیم سے بھی کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے، اس لیے

ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسے طلبہ کے لیے جو دینی تعلیم سے بخوبی روشناس نہیں، ایک تین سالہ کورس رکھا جائے اور ان طلباء کے لیے جو عربی زبان سے واقف نہیں، ایک سالہ نصاب مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک پرائمری اسکول کا اجراء ہوگیا ہے۔ نیز جامعہ سے پہلی سطح پر ایک ثانوی اسکول بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ جس میں ایسے طلبہ داخل کیے جائیں گے جن کی تعلیمی قابلیت جامعہ کی نہج کی نہیں۔

مولانا نے اپنی مرتب کردہ سفارشات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ گو میری سفارشات فل اسکیپ کے سات صفحات پر مشتمل ہیں لیکن ان کی منظوری یا نامنظوری نصاب کمیٹی کی صوابدید پر ہے جس کی مجھے بعد میں اطلاع مل جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنی سفارشات میں کہا ہے کہ دینی مضامین میں صحاح ستہ کو مکمل طور پر شامل کر لیا جائے۔ کیوں کہ اس سے قبل صرف ان کے چند اجزاء شامل نصاب ہیں۔ علاوہ ازیں میں نے انگریزی اور جنرل نالج کو بحیثیت لازمی مضامین کے اختیار کر لینے کی سفارش کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ طلبہ کو تحریر و تقریر کی خاص مشق کرائی جائے تاکہ وہ ہر دو طریقوں سے تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

انھوں نے کہا کہ میں نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ اسلامی اخلاق کے مضمون کے ساتھ ساتھ جدید فلسفۂ اخلاق کو بھی شاملِ نصاب کر لیا جائے۔ اور اجتماعیت کے بارے میں جہاں اسلامی نظریۂ اقتصاد، فلسفۂ تاریخ، تہذیب و تمدن پڑھایا جارہا ہے وہاں موجودہ مذاہب، سوشلزم، سرمایہ داری اور کمیونزم کو بھی بحیثیت جدید فلسفۂ اقتصادیات، جدید فلسفۂ تاریخ و تمدن کے اختیار کر لیا جائے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی میں ایسے شعبے کا انتظام کیا جائے جس میں مستشرقین اور غیر مسلم مصنفین و مبلغین کی ان غلط بیانیوں کا جو وہ مذہب، قرآن، حدیث اور رسول اللہ ؐ کے بارے میں کرتے ہیں، تجزیہ کیا جائے اور طلبہ کو حقیقتِ حال سے روشناس کرایا جائے۔ نیز مسلمانوں کے اندر انکارِ حدیث، قوم پرستی اور سوشلزم

کے جو خیالات پروان چڑھ رہے ہیں ان کا جائزہ لے کر طلبہ کو صحیح راستہ بتایا جائے۔

مولانا نے کہا کہ میں نے سفارش کی ہے کہ نصاب کی مجوزہ کُتب کے حصول کے لیے باقاعدہ اکیڈیمی قائم کی جائے جو نہ صرف بازار میں موجود کتابوں کو حاصل کرنے کا انتظام کرے بلکہ ان کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کرے جو اس وقت دستیاب نہیں ہوتیں۔

اصلاحِ معاشرہ کے لیے تجاویز

مارچ ۱۹۶۵ء کے ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ" لاہور میں اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں ملک کی اہم شخصیتوں کے انٹرویو جناب الطاف حسن قریشی کے قلم سے شائع ہوئے۔ مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کا یہ انٹرویو بھی ان میں شامل تھا جو بعد میں ہفت روزہ "ایشیا" لاہور میں ۵ رمارچ ۱۹۶۵ء کو شائع ہوا۔

"اخلاق حقیقت میں انسانیت کا اصل جوہر اور انسان اور حیوان کے درمیان وجۂ امتیاز ہے۔ دنیا اور آخرت میں انسان کی کام یابی کا دار و مدار اخلاق پر ہے۔ کوئی انسان اپنی انفرادی حیثیت میں اور کوئی انسانی گروہ اپنی اجتماعی حیثیت میں اخلاق کے بغیر کام یابی سے ہم کنار نہیں ہوسکتا۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو اپنے استحکام کے لیے کچھ بنیادی اخلاقیات کی ضرورت نہ ہو۔ کیا آپ کو امن میسر آسکتا ہے اگر آپ کے شہروں اور بستیوں میں انسانی زندگی کا احترام اور دوسروں کے حقوق کا پاس و لحاظ موجود نہ ہو؟ کیا آپ کا معاشرہ تباہی سے بچ سکتا ہے اگر اس میں ہر شخص قدرت پاکر اپنے حدود سے تجاوز کرنے اور دوسروں کی جان ومال اور آبرو پر دست درازی کرگزرنے کا خوگر ہو؟ کیا آپ کسی تہذیب کا تصور کر سکتے ہیں، اگر افراد اور گروہوں کے برتاؤ کو ضابطے میں رکھنے کے لیے کوئی معقول قانون موجود نہ ہو؟ یا موجود تو ہو مگر اس کی پابندی نہ کی جاتی ہو؟

کیا آپ کوئی مضبوط تمدنی نظام چلا سکتے ہیں اگر آپ کی معاشرت اور سیاست اور معیشت میں دیانت و امانت، عدل و انصاف، فرض شناسی اور راست بازی موجود نہ ہو؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو بھی بچا سکتے ہیں اگر آپ کے افراد میں خود غرضی پرورش پا رہی ہو جو ان کے دلوں میں اپنی ذات اور ذاتی مفاد سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑے؟

اخلاق کے بغیر اسلامی زندگی ممکن نہیں

ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ دیکھیں، تو اخلاق کی پستی کے ساتھ ہم سرے سے کسی اسلامی زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ مسلمان تو مسلمان بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کی ذات سے دنیا میں بھلائی قائم ہو اور برائی مٹے۔ بھلائی کو مٹانا اور برائی پھیلانا اور پھر اس کے ساتھ مسلمان بھی ہونا، یہ درحقیقت ایک کھلا ہوا تناقض ہے۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اس پر کسی معاملے میں اعتماد نہ کیا جا سکے۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی وہ نیکی سے بھاگے اور بدی کی طرف لپکے۔ حرام کھائے اور حرام طریقوں سے اپنی خواہشات پوری کرے، تو آخر اس کے مسلمان ہونے کا فائدہ کیا ہے؟ کسی مسلم معاشرے کی اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہو سکتی کہ وہ انصاف سے خالی اور ظلم سے لبریز ہوتا چلا جائے۔ اس میں روز بروز بھلائیاں دبتی اور برائیاں فروغ پاتی چلی جائیں۔ اور اس کے اندر دیانت و امانت اور شرافت کے لیے پھلنے پھولنے کے مواقع کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں۔ یہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والی حالت ہے۔ اگر کسی مسلم معاشرے کی یہ حالت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام کی روح سے خالی ہو چکا ہے۔ صرف اسلام کا نام ہی اس میں باقی رہ گیا ہے۔ اور یہ نام بھی اب صرف اس لیے لگا ہوا ہے کہ دنیا کو اس دینِ حق سے دور بھگائے۔

مسلمان اخلاقی زوال کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب اسے خُدا کی رضا اور آخرت میں فلاح مطلوب نہیں رہتی اور صرف دنیا اس کی مطلوب بن کر رہ جاتی ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی پستی کے ساتھ کوئی قوم دُنیا کی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکتی ۔ اِس پستی کے ساتھ تو آخرت بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور دنیا بھی ہاتھ نہیں آتی ۔

سب سے بڑھ کر دولت کی پیاس ہم کو دُنیا طلبی کی طرف لے جا رہی ہے ۔ مگر اس کے لیے ہم نے افراد اور طبقوں کی خود غرضی اور بد دیانتی کو وسیلہ بنایا ہے ۔ حالاں کہ اِس سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری معاشی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہے ۔

مجھے مشرق وسطیٰ کے متعدد ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے ۔ وہاں میں نے جب تاجروں سے کہا کہ آپ جو مال باہر کے بعض غیر مسلم ممالک سے منگاتے ہیں ، وہ آپ کے ایک بھائی مسلمان ملک پاکستان سے بھی مل سکتا ہے ۔ اسے چھوڑ کر آپ دُوسروں سے کیوں خریدتے ہیں ؟ تو اُن کا یہ جواب سُن کر میں شرم سے پانی پانی ہوگیا کہ ہم نے مجبوراً پاکستان سے مال منگانا بند کیا ہے ۔ وہاں سے نمونہ اچھّا دکھا کر فرمائش حاصل کی جاتی ہے اور پھر فرمائش کی تعمیل میں ردّی مال بھیج دیا جاتا ہے ۔

آپ فرمائیے ، کیا اِس بد دیانتی کے ساتھ ہم تجارت میں کوئی ترقی کر سکتے ہیں ؟ ہمارے کارخانے دار اور بڑے تاجر جس خود غرضی کے ساتھ بے تحاشا منافع خوری کر رہے ہیں ، اس سے ایک محدود طبقہ تو بلاشبہ فربہ ہوتا جا رہا ہے ، مگر قوم بحیثیت مجموعی تو لاغر ہی ہو رہی ہے ۔ یہ چیز آخر کار کب تک ہمیں اس طبقاتی کش مکش کی آگ میں جھُلسنے سے بچا سکے گی جس میں اسی طرح کی حماقتیں کرنے والے بہت سے دُوسرے ملک جھُلس چکے ہیں ۔ اور پھر اسی خود غرضی کی بدولت ہمارے کارکن طبقوں میں کام چوری اور اپنے فرض سے غفلت اور صرف اپنے حقوق کے لیے لڑنے کی جو بیماری پھیل رہی ہے ، کیا واقعی یہ وہی راستہ ہے جس سے ہم معاشی ترقی کی طرف پیش قدمی کر سکیں ؟

اصل طاقت

ہماری اصل طاقت وہ مادّی ذرائع نہیں ہیں جو خالق نے ہمیں عطا کیے ہیں، بلکہ وہ انسان ہیں جنھیں ان ذرائع سے کام لینا ہے۔ یہ انسان اگر بگڑ جائیں تو مادّی ذرائع ہمارے کس کام آسکتے ہیں۔ ان کے بگاڑ اور اس بگاڑ کے اثرات کو ہم محض حکومت اور قانون کی طاقت سے نہیں روک سکتے۔ کیوں کہ اس طاقت کے کارگر ہونے کا انحصار بھی ان انسانوں کی سیرت و کردار ہی پر ہے جو اس طاقت کو استعمال کریں۔ دُنیا میں کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا اگر اس کے نافذ کرنے والے خود اس کو توڑیں اور اسے اپنی بدکرداریوں کے لیے ہتھیار بنانے پر تُل جائیں۔ ہر پابندی جو آپ کسی خرابی کو روکنے کے لیے لگائیں گے ایک بددیانت نظم ونسق کے لیے وہ ناجائز فائدہ اُٹھانے کا ایک نیا دروازہ کھول دے گی اور اصلاح کے بجائے مزید خرابی کا موجب بن جائے گی۔ آپ کا قانون اپنی جگہ خواہ کتنا ہی معقول اور منصفانہ ہو، وہ معاشرے میں عدل قائم کرنے کا معجزہ نہیں دکھا سکتا اگر انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے ہی انصاف کا خون کرنے لگیں اور قانون کی گرفت میں لانے والی مشینری ہی ظلم پر کمربستہ ہوجائے۔ دُوسری طرف آپ دیکھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ موجودہ زمانے کی کلیت پسندی نے ہر ملک کے قدرتی ذرائع ووسائل کو بہت بڑی حد تک حکومت کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ کوئی قوم بھی براہِ راست ان سے انتفاع نہیں کرتی، بلکہ حکومت اس انتفاع کو منضبط کرتی ہے۔ اور حکومت کے فریضے کو اس کے کارکن ہی انجام دیتے ہیں۔ ان کارکنوں کے ایمان دار، فرض شناس اور بااُصول ہونے کی صورت میں خدا کے دیے ہوئے ذرائع ووسائل سے جتنا فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے اس کا عُشرِ عشیر بھی اس صورت میں نہیں اُٹھایا جاسکتا، جب ان کارکنوں کو رشوت، خیانت، کام چوری، خویش پروری

اور خود غرضی کی بیماریاں لگی ہوئی ہوں اور آئین وضابطے کا کوئی احترام ان کے اندر موجود نہ ہو۔ خود حکومت کی آمدنی بھی جو ٹیکسوں اور دوسرے ذرائع سے ہو سکتی ہے، بددیانت کارکنوں کی وجہ سے نہ وہ کبھی پوری طرح وصول ہوتی ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال ہی پوری طرح ہوتا ہے۔

جمہوریت اور اخلاق

یہ تو اس حالت کی بات ہے جب کہ آئین و قانون بجائے خود درست ہو اور کارفرما بھی صحیح قسم کے لوگ ہوں، صرف کارکن بگڑے ہوئے ہوں۔ لیکن جہاں آئین و قانون تک میں بکثرت بے انصافیاں اور صریح غیر معقول باتیں موجود ہوں اور کارفرما اخلاقی بگاڑ میں کارکنوں کے ساتھ نہ صرف برابر کے شریک ہوں، بلکہ ان سے خود غلط کام لیتے ہوں، وہاں بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اور حکومت اصلاح کے بجائے موجبِ فساد بن جاتی ہے۔ ہم نے کارفرماؤں اور قانون سازوں کے انتخاب کے لیے جمہوریت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ "جمہوریت" کے نام میں کوئی معجزہ نہیں ہے جو آپ سے آپ اس انتخاب کو صحیح بنا دے۔ جمہوریت خود اپنی کامیابی کے لیے چند اخلاقی اوصاف کی محتاج ہے۔ جو اگر موجود نہ ہوں تو وہ سرے سے چل ہی نہیں سکتی۔ اس کے لیے جو کم سے کم اوصاف مطلوب ہیں وہ یہ ہیں :

اوّلاً جس قوم میں جمہوریت رائج کی جا رہی ہے، اس کے اندر خود اپنے حقوق کا صحیح شعور اور ان کی حفاظت کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ وہ مجموعی حیثیت سے اتنی جرأت و ہمت رکھتی ہو کہ کسی استبداد کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دے اور اس کے افراد کی اکثریت کسی لالچ کی بنا پر اپنی رائے بیچنے یا خوف کی بنا پر اپنی آزاد مرضی کے خلاف رائے دینے یا کسی خود غرضی یا بے جا عصبیت کی بنا پر نااہل لوگوں کے حق میں رائے

دینے کے لیے تیار نہ ہو۔

ثانیاً، اس کے نظم ونسق کو چلانے والے کارکنوں اور اس کے دفاع کی خدمت انجام دینے والے سپاہیوں میں اتنی حب الوطنی، اتنی آئین پسندی اور خود جمہوریت کے تصور کے ساتھ اتنی وفاداری موجود ہو کہ وہ نہ تو جمہوریت کی جگہ کسی استبداد کو اپنے ملک پر مسلط کرنے کی سازش میں آلۂ کار بنیں اور نہ آئین و قانون کے خلاف کوئی ان کو استعمال کر سکے۔ انھیں ایمان داری کے ساتھ جمہوریت کے اس نظریے کا قائل ہونا چاہیے اور اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہیے کہ حکمرانی دراصل حکومت کے نمائندوں کا کام ہے۔ جنھیں قوم اپنی آزاد مرضی سے اپنا نمائندہ بنائے اور ملازمینِ حکومت کا کام یہ ہے کہ قوم جن لوگوں کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کرے، وہ ان کے ماتحت کام کریں۔ ان کے ضمیر میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ قوم سے انتخاب کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہ خود آمادہ ہوں اور نہ کوئی ان سے یہ خدمت لے سکے۔

ثالثاً، اس قوم کے بااثر لوگوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہونی چاہیے جو خود غرضی میں اتنے اندھے نہ ہو جائیں کہ اپنے اقتدار کا تخت بچھانے کے لیے خود اپنی قوم کو اور اپنے ملک کے کارکن طبقوں کو ضمیر فروشی، بزدلی اور بد دیانتی کی تربیت دینے پرتُل جائیں ان میں اگر اقتدار کی طلب بھی ہو تو بدرجۂ آخر وہ حدود آشنا ہونی چاہیے۔ وہ اقتدار کو خریدنے یا زبردستی کھسوٹ لینے کی بجائے خدمت اور حُسنِ عمل کے ذریعے سے قوم میں اپنا اعتماد پیدا کریں اور پھر عوام کی مرضی (یعنی آزاد مرضی) سے اگر وہ ان کو حاصل ہو جائے تو برسرِ اقتدار آئیں۔

یہ تین شرطیں جہاں نہ پائی جاتی ہوں وہاں درحقیقت کوئی جمہوریت نہ قائم ہو سکتی ہے، نہ چل سکتی ہے۔ آزادی اور جمہوریت کا بوجھ مضبوط ستون اور شہتیر ہی سنبھال سکتے ہیں۔ بودے اور گھُن کھائے ہوئے ستونوں اور شہتیروں پر یہ بوجھ جہاں بھی لادا جائے گا

زمین بوس ہو جائے گا۔ نام جمہوریت کا ہوگا مگر استبداد کارفرما ہوگا۔ ناجائز ذرائع سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ کبھی نیک نیت نہیں ہو سکتے۔ وہ قانون سازی اور کارفرمائی، دونوں میں حق و انصاف کے بجائے اپنی اغراض کو بالاتر رکھیں گے۔ ایسی صورت میں سرے سے نہ قانون کا احترام باقی رہ سکتا ہے اور نہ حکومت کی طاقت بگاڑنے کے بجائے اصلاح کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

بُنیادوں کا گرنا

سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوئی تھی وہی سرے سے منہدم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ خُدا اور رسولؐ، قرآن اور آخرت پر ایمان وہ اوّلین چیز ہے جس پر ایک مسلمان فرد اور قوم کے اخلاق کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ مگر ہمارا نظامِ تعلیم، طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول میں اس بنیاد کو مضبوط کرنا تو درکنار، اسے قائم رکھنا بھی درکنار، روز بروز اُسے کمزور سے کمزور کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کے برعکس ایک لادینی تہذیب کے تصورات، اقدار اور طور طریقوں کی برتری کا نقش دِلوں میں بٹھا رہا ہے۔ کسی کو محسوس نہیں ہوتا کہ یہ حرکت کرکے ہم دراصل خود اپنی خودی کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔

پھر دُوسری چیز حرام و حلال کی وہ تمیز تھی جس کے بقا و استحکام پر ہمارے اخلاق کے بقا و استحکام کا انحصار تھا۔ مگر ہم اسے بچانے اور سنبھالنے کے بجائے اس کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارا پورا معاشی نظام سُود پر چل رہا ہے جسے ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام نے اس کو حرام کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں شراب نوشی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ حالاں کہ دنیا کی قوموں میں مسلمانوں کا یہ امتیازی وصف تھا کہ ان کے معاشرے نے شراب کا سدِّ باب کرنے میں سب سے بڑھ کر کامیابی حاصل

کی ہے۔ ہمارے ہاں جنسی بداخلاقی بھی روزافزوں ہے۔ اور ہم مغرب کی تقلید میں عریانی، بے حیائی، اختلاط مردوزن، فحش لٹریچر، فحش فلموں اور فحش گانوں کے ذریعے اس کو فروغ دیتے چلے جارہے ہیں، حالاں کہ مسلم معاشرہ کبھی اس لحاظ سے بھی دنیا کے تمام معاشروں سے بلند اخلاق کا حامل تھا۔ ان شدید حرمتوں کو توڑ دینے کے بعد اس کا آخر کیا امکان ہے کہ ہمارے عوام اور خواص میں سرے سے کوئی تمیزِ حرام و حلال باقی رہ جائے اور وہ رشوت، خیانت، غبن، غصب، چوری اور ایسے ہی دوسرے افعال سے اجتناب کریں۔

تیسری اہم چیز وہ قدریں ہیں جو ہم کو اخلاق کی بلندی پر قائم رکھنے کے لیے اپنے دین سے اور اپنی ملی روایات سے ملی تھیں۔ حق پسندی و حق شناسی، عدل و انصاف، دیانت و امانت، راست بازی، قناعت، حیا، عفت، مروّت اور سب سے بڑھ کر تقویٰ اور احسان وہ چیزیں تھیں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اصل میں قابلِ قدر ہونی چاہیے تھیں، مگر ہم نے ان کی جگہ خوش حالی، شان دار زندگی، چودھراہٹ، غلبہ و اقتدار اور عیش کو قابلِ قدر ٹھہرالیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کسی ذریعے سے میسر ہو۔

اخلاقی اصلاح کیسے ہو؟

اب آپ پوچھیں گے کہ اخلاقی پستی کے اِس گڑھے میں گرنے سے اور اس کے تباہ کن نتائج سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟ میں عرض کروں گا کہ یہ سوال آپ خلا میں نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایک خاص ملک اور ایک خاص قوم میں کر رہے ہیں جس کا ایک خاص مزاج صدیوں کی روایات سے بنا ہوا ہے، اور ایسی حالت میں کر رہے ہیں کہ ایک مدّتِ دراز سے آپ کے لیے مادّی ترقی اور معیارِ زندگی کی بلندی کا سوال سب سے زیادہ اہم اور اخلاق کا سوال سب سے زیادہ غیر اہم بنا رہا ہے۔ حتیٰ کہ تعمیرِ اخلاق کے لیے اجتماعی کوشش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ہے۔

اِس حالت میں سب سے پہلے تو اس ضرورت کا احساس پیدا ہونا چاہیے اور یہ احساس عوام سے بڑھ کر خواص اور ملک کے کارفرماؤں میں ہونا چاہیے۔ جب تک وہ یہ نہ مانیں گے کہ اخلاق کے بغیر ہمارے لیے کسی ترقی کا، بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے بقا کا بھی امکان نہیں ہے، اس وقت تک قومی پیمانے پر تعمیرِ اخلاق کے لیے کچھ نہ کیا جا سکے گا۔ انفرادی کوششیں تو خدا کے فضل سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے افراد سے کبھی خالی نہیں رہا ہے جنھوں نے اس کے لیے اپنی حد تک سعی نہ کی ہو۔ مگران کا کوئی نتیجہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا تھا کہ زوال کی رفتار اتنی تیز نہ ہوسکی جتنی کہ اس کے بغیر ہوتی۔ قوم کا اخلاق بنانا بہرحال قومی پیمانے پر کوشش چاہتا ہے، اور وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ ملک کے کارفرماؤں کو اس کی ضرورت کا اور اس کے نہ ہونے کے تباہ کُن نتائج کا احساس ہو۔

احساسِ ضرورت کے بعد یہ جاننا اور سمجھنا بھی ناگزیر ہے کہ تعمیرِ اخلاق کسی بنیادی فلسفے اور کسی نقشۂ تعمیر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ آپ صرف اخلاق اخلاق کی رٹ لگا کر اور محض سطحی طور پر چند اخلاقیات کا اشتہار دے کر تو کوئی قومی اخلاق نہیں بنا سکتے۔ آپ کو لامحالہ ایک اساسی فلسفہ درکار ہے جس کے لحاظ سے آپ خیر و شر کا امتیاز اور اخلاقی اقدار کا تعین کریں۔ اور آپ کے سامنے کوئی نقشہ ہونا چاہیے جس کے مطابق آپ سیرت و کردار کی بنیاد اُٹھائیں۔ انسان بنانے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کیسے انسان بنانا چاہتے ہیں اور یہ جاننا چاہیے کہ اِس خاص قسم کے انسان کس طرح بن سکتے ہیں۔

درآمد کیا ہوا فلسفۂ اخلاق

تیسری بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ آپ کسی قوم میں باہر سے کوئی فلسفہ اور نقشہ لا کر تعمیرِ اخلاق نہیں کر سکتے۔ تعمیر اگر ممکن ہے تو اسی فلسفے اور نقشے پر ممکن ہے جو اس خاص

قوم کے مزاج اور اس کی روایات میں پہلے سے اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات مسلمانوں کے معاملے میں بہت اہم ہے۔ یہ کوئی وحشی یا نو دولتی قوم نہیں ہے جس کا کوئی ماضی نہ ہو، جس کا اپنا نظریۂ حیات اور فلسفۂ اخلاق نہ ہو، جو اب نئے سرے سے قومی زندگی کا آغاز کر رہی ہو۔ ایسی قوم میں تو کوئی فلسفہ کہیں سے درآمد کر کے لایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن مسلمان صدہا برس سے اپنے کچھ عقاید رکھتے ہیں، کوئی معیارِ خیر و شر رکھتے ہیں، کچھ اخلاقی اقدار رکھتے ہیں۔ اور اپنے اس سرمائے پر آج اس گئی گزری حالت میں بھی ان کو فخر ہے۔ ان کی تاریخ نے ان کو انسانیت کے کچھ نمونے دیئے ہیں جنھیں وہ سیرت و کردار کی بلند ترین مثالیں سمجھتے ہیں اور وہی ان کی نگاہ میں معیارِ کمال ہیں۔

آپ کوئی بیرونی فلسفہ، کچھ نئی اقدار اور کچھ نئے معیاروں کے ساتھ یہاں تعمیرِ اخلاق کرنا چاہیں گے تو آپ کو ایک مدت دراز تک اپنی ساری قوتیں ان پرانی بنیادوں کو منہدم کرنے اور نئی بنیادیں رکھنے میں صرف کرنی پڑیں گی۔ یہ کوششیں اس قوم کے رہے سہے اخلاق کا بھی ستیاناس کر دیں گی۔ اس تخریب سے اگر یہ کسی نہ کسی طرح جی بچی، تو نئے اخلاق کی تعمیر کر لیجیے گا۔ ایک صدی کے بعد شاید اس تعمیر کے نتائج سامنے آنے شروع ہو سکیں۔ لیکن اگر اسلام اور اس کی روایات کی بنیاد پر آپ تعمیرِ اخلاق کرنا چاہیں تو کل ہی سے یہ کام شروع ہو سکتا ہے۔ اور ہر نیا آنے والا دن اس کے اثرات و نتائج سامنے لا سکتا ہے، بشرطیکہ آپ تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب کا کام جان بوجھ کر نہ کرتے رہیں۔

وسیع تصور

اسلام کی بنیادوں پر تعمیرِ اخلاق کے تصور کو کسی محدود معنی میں نہ لیجیے۔ اس کے لیے آپ کو اپنا پورا نظامِ تعلیم، اپنے نصاب اور طریقوں اور ماحول سمیت بدلنا ہوگا۔ اس کے لیے افکار بنانے والے تمام ذرائع (ریڈیو، سینما، ٹیلی ویژن، صحافت، لٹریچر وغیرہ)

صحیح اور مناسب طریقے سے استعمال کرنے ہوں گے اور ان کے غلط استعمال کو روکنا ہوگا ۔اس کے لیے منتظمین حکومت اور دفاعی خدمات کی تربیت کرنے والے اداروں کے طرزِ تربیت میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔اس کے لیے قوانین کی اصلاح بھی کرنی ہوگی اور پوری انتظامی پالیسی میں بھی تغیر کرنا ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے لیے ہمارے کارفرماؤں کو اپنی نیتوں اور ارادوں اور طور طریقوں اور انتخابات جیتنے، اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار پر قابض رہنے کے ذرائع و وسائل کی اصلاح بھی کرنی ہوگی۔ یہ درحقیقت کوئی آسان کام نہیں ہے بڑا دشوار کام ہے جس پر طبیعتیں بمشکل اس وقت ہی آمادہ ہوسکتی ہیں جب عام و خاص سب کو یہ محسوس ہو جائے کہ قوم اگر ڈوبی تو یہاں کوئی تیرنے والا نہ رہ سکے گا۔ (بشکریہ اُردو ڈائجسٹ)

کیا پاکستان میں سزائے موت منسُوخ ہونی چاہیے

بعض جرائم کے سلسلے میں جو سزائے موت دی جاتی ہے جدید دَور میں اس کی افادیت بھی زیرِ بحث آئی ہے۔ ملک کے موقر ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور کے نمائندہ خصوصی عنایت اللہ نے اس اہم مسئلہ پر مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں کے اِنٹر دیو لیے، جو سیّارہ ڈائجسٹ کے سال نامہ اگست ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئے۔ اس سلسلے کا پہلا انٹرویو مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کا ہے، جس کا متن حسبِ ذیل ہے۔

عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مولانا میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ "کیا پاکستان میں سزائے موت منسُوخ ہونی چاہیے؟" آپ نے فرمایا:

"یہ تو وہی بات ہوئی جیسے ہم سوچنے بیٹھ جائیں کہ آیا شراب حلال ہے یا حرام؟"

آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"جب قرآن میں صاف الفاظ میں حکم آگیا ہے کہ قتل کی سزا موت ہے تو ایک مسلمان کے ذہن میں سوال ہی کیوں پیدا ہو کہ قتل کی سزا موت ہونی چاہیے؟ کیا

آپ خُدا کے حکم کو چیلنج کرنا چاہتے ہیں؟"

میرے دوسرے سوالات کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

"اسلام نے قتل کی سزا کے سلسلے میں مصالحت اور سمجھوتے کی گنجائش رکھ دی ہے جو ہمارے ہاں کے موجودہ قانون (جو اسلامی نہیں ہے) میں ناپید ہے۔ اسلامی قانون میں مقتول کے ورثاء کو حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو خون معاف کر دیں یا خون بہا لے لیں۔ لیکن اگر قاتل کو مقتول کے ورثاء معاف کریں نہ اس سے خون بہا قبول کریں تو اِس صورت میں قتلِ عمد کے جرم کی سزا لازماً موت ہی ہے۔ اسلامی قانون اور ہمارے ملک کے موجودہ انگریزی قانون میں ایک فرق ہے (جو بعض حالتوں میں تخریبی ثابت ہوتا ہے) وہ یہ کہ اسلامی قانون میں خون کے دعوٰی کا اصل حق مقتول کے اولیاء کو حاصل ہے اور وہ مقتول سے مصالحت کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کے موجودہ قانون میں مدعی حکومت ہوتی ہے اور مقتول کے وارث کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ قانونی نظام میں اوّل تو قاتل کے بَری ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ کیوں کہ حکومت کی مشینری میں اس قدر کل پُرزے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی ڈھیلا ہو جاتا ہے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے سمجھوتے کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے قتل کے معاملات میں انتقام در انتقام کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے جو کسی طرح روکے نہیں رُکتا۔"

دیہی معاشرے کی اصلاح کے متعلق آپ نے فرمایا:

"یہ ایک طویل بحث ہے۔ اس مسئلے میں کوئی اُلجھاؤ تو پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معاشرت میں چند ایسے عناصر کام کر رہے ہیں جن کے محرک ان کے وجود کو زندہ و پائندہ رکھنا چاہتے ہیں، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ قتل کی وارداتیں تھم نہ جائیں۔ ہمارے ہاں قتل اور انتقامی قتل کا لامتناہی سلسلہ چل رہا ہے

جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری عدالتوں سے قتل کے اکثر مجرم بَری ہو جاتے ہیں یا کم سے کم سزا پاکر باہر آجاتے ہیں۔ انھیں زندہ گھومتا پھرتا دیکھ کر مقتول کے پسماندگان اشتعال یا انتقامی جذبے کے تحت انھیں قتل کر دیتے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ پشتوں تک چلتا ہے۔ مجرموں کی بریّت کی وجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ عنصر تخریبی ہے کہ مجرم بَری بھی ہو سکتے ہیں۔ قتل کے خونی ڈرامے سے اگر استغاثے کی کمزوریوں اور جھوٹے گواہوں کے کردار کو نکال دیا جائے اور سمجھوتے کا دروازہ کھول دیا جائے تو بریّت کے امکانات بھی ختم ہو سکتے ہیں اور انتقامی قتلوں کا سلسلہ بھی تھم سکتا ہے۔ اسلام نے قاتل کے روپوش ہو جانے یا قتل کا سُراغ نہ مل سکنے کے امکان کو یوں ختم کر دیا ہے کہ جس بستی میں قتل ہو جائے اور قاتل کا سُراغ نہ ملے تو ساری بستی سے اجتماعی تاوان وصول کر لیا جاتا ہے۔ قتل کے اصل مجرم کو تلاش کرنے کا یہ کامیاب ترین طریقہ ہے۔ جہاں تک دیہی یا شہری معاشرت کی اصلاح کا تعلق ہے یہ تو کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ قرآنی فکر و نظر کی ترویج کے بغیر اصلاح ناممکن ہے۔ اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ آپ نے معاشرے میں قرآنی فکر و نظر کا کہاں تک عمل دخل رہنے دیا ہے۔ اگر نہیں رہنے دیا تو پھر اصلاح کی بات ہی نہ کیجیے۔"

مولوی عبدالحق اور مولانا مودودی

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی پانچویں برسی پر انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کے رسالہ ماہنامہ "قومی زبان" کا ۱۶ اگست ۱۹۶۶ء میں بابائے اُردو نمبر شائع ہوا۔ "بزمِ عبدالحق" کے ضمن میں غلام حسین اظہر کے قلم سے "مودودی برادران ــــ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا ابوالخیر مودودیؒ" کے عنوان کے تحت ایک انٹرویو شائع ہوا۔ مولانا مودودی صاحبؒ سے متعلق انٹرویو درج ذیل ہے۔

مولانا مودودیؒ ہمارے ملک کی ان شخصیتوں میں سے ہیں جن کے پاس فرصت کے لمحات بہت کم ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مولانا کے لیے اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے، مولوی عبدالحق صاحب کے بارے میں گفتگو کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوگا، لیکن مولانا نے میری گزارش سُن کر فرمایا کہ ایک دو روز کے بعد، شام کو آجائیے۔ شام کے وقت مولانا کو ملاقاتی گھیرے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے جس روز میں حاضر ہوا کوئی ملاقاتی نہ تھا۔ حسبِ معمول لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں لیکن مولانا موجود نہ تھے، مَیں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد مولانا تشریف لے آئے اور السلام علیکم کہنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے انھیں متوجہ پاکر مولوی عبدالحق صاحب کے بارے میں یہ سوال کیا :

"مولانا! آپ نے "برگِ گل[1]" بابائے اُردو نمبر اگست ۶۳ء میں شائع شدہ ایک خط میں یہ لکھا تھا:

"میں اورنگ آباد میں مدرسہ فرقانیہ میں جب متعلم تھا تو مولوی عبدالحق صاحب اُس وقت انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ اُس زمانہ میں اُن کی جو تقریریں سُنی تھیں اُن کا اثر اب تک دل و دماغ پر ہے۔"

کیا آپ وضاحت فرمائیں گے کہ ان کی تقریروں میں سے کس بات نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟"

اُنھوں نے فرمایا:

"اس وقت تو کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب میں تیرہ چودہ برس کا تھا۔ بہرحال جیسا اثر ایک طالبِ علم پر انسپکٹر کی تقاریر کا ہوا کرتا ہے میرے اُوپر بھی تھا۔ کوئی خاص بات یاد نہیں۔"

مولانا نے مجھے وہ پیغام دکھلانے کو بھی فرمایا۔ اس سوال کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ذاتی حالات کے بارے میں مولانا کی معلومات زیادہ نہیں، اس لیے میں نے مولوی صاحب کے نظریات کے بارے میں مولانا کی رائے دریافت کی:

"مولانا! کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا میلان الحاد کی طرف تھا؟"

مولانا نے بڑے بچے تُلے اور دھیمے انداز میں فرمایا: "محض سُنی سُنائی باتوں سے میں کیسے حکم لگا سکتا ہوں۔ مولوی صاحب کے آزادانہ نظریات تو تھے لیکن ان کے اندر دینی غیرت بھی تھی اور یہ ان کے بہت سے مضامین سے ثابت ہوتا ہے۔"

---

[1] اُردو کالج کراچی کے مجلّے کا نام ہے۔

"مولانا! مولوی صاحب نے اُردو کی جو خدمت سرانجام دی اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

"ان کی خدمات بہت زیادہ قابلِ قدر ہیں، انھوں نے اس سلسلے میں جو خدمت سرانجام دی وہ نوجوانوں کے لیے نمونہ ہے۔"

"مولوی صاحب کے اسلوب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"مولوی صاحب اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ مقدمات لکھنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ مقدمات کی وجہ سے تو وہ "مقدمہ باز" مشہور ہو گئے تھے۔ اُردو زبان کے بلند پایہ اہلِ قلم میں ان کا شمار ہے۔"

مولوی صاحب کے نظریات کے بارے میں ان سوالات کے بعد مَیں نے اُردو کے بارے میں چند سوالات کیے:

"مولانا! آپ کی دانست میں اُردو کی راہ میں کون سی مشکلات حائل ہیں؟"

"اصل مشکل تو یہی ہے کہ جن لوگوں کو انگریز اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گیا ہے وہ کسی حال میں انگریزی کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ جس قدر کوشش ہو سکے اپنی اولاد کو بھی یہی زبان سکھاتے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا انگریزی ہے۔ بہت سے لوگ خواب میں بڑبڑاتے بھی انگریزی میں ہیں۔"

"مولانا! یہ کہنا کہاں تک دُرست ہے کہ اُردو میں علمی سرمائے کی کمی کی وجہ سے اسے ذریعۂ تعلیم بنانا مشکل ہے۔"

"ہم انگریزوں سے پہلے بھی دنیا کے کام چلاتے تھے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد کیا مجبوری لاحق ہو گئی ہے۔ علمی سرمایہ آسمان سے نہیں اُترا کرتا، علمی سرمایہ عوام بناتے ہیں۔ جاپانی زبان میں کون سا علمی سرمایہ تھا۔ یہودی، عبرانی زبان کو زندہ کر رہے ہیں۔ عبرانی زبان ہی ان کا ذریعۂ تعلیم ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اُردو بولنے والوں میں قومی

حمیّت کی کمی ہے۔ جن کے اندر قومی حمیّت تھی انھوں نے اپنی زبان میں علمی سرمایہ فراہم کیا ہے، بے حمیت لوگ دوسروں کے سرمائے پر نظر رکھتے ہیں۔ اپنا سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔"

کچھ دوسرے ملاقاتی بھی آگئے تھے۔ اس لیے میں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور رخصت چاہی۔

عالمِ اسلام اور اشتراکیت کا چیلنج

ادارۂ معارف اسلامی کراچی کے مجلّہ "چراغِ راہ" کی سوشلزم کے موضوع پر دسمبر ۱۹۶۷ء میں ایک خصوصی اشاعت منظرِ عام پر آئی۔ اس کے چھٹے حصّے میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے مختلف اہم مفکرین کو لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ موضوع بحث تھا "آپ کی نگاہ میں عالمِ اسلامی کے لیے اشتراکیت کا حقیقی چیلنج کیا ہے اور اس کا مقابلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟" مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب نے جو جواب دیا وہ حسبِ ذیل ہے:

میرے نزدیک اشتراکیت کوئی مستقل بالذات تہذیب نہیں ہے بلکہ اسی مغربی تہذیب کا ایک شاخسانہ ہے جو یورپ میں کلیسا سے بغاوت کے بعد خدا اور رسالت سے آزاد ہوکر زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے اُٹھی تھی۔ یہ تہذیب پچھلی چند صدیوں کے دوران میں لادینیت کی بنیاد پر بہت سے مسلکوں کو جنم دے چکی ہے جن میں بظاہر بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور بارہا ان مسلکوں کے درمیان ایسے سخت تصادم ہوئے ہیں کہ سطحی نظر رکھنے والے ان سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھتے ہیں کہ فی الواقع ان کے اندر کچھ بڑے بنیادی اختلافات ہیں۔ لیکن درحقیقت سرمایہ داری، فسطائیت، اشتراکیت وغیرہ کے تمام اختلافات فروعی نوعیت کے ہیں۔ اصل تہذیبی نظریہ ان

سب کے درمیان مشترک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا ہو یا نہ ہو، بہرحال انسان نہ اس کی اطاعت (ارادی وشعوری اطاعت) کا مکلّف ہے نہ اس کی طرف سے کسی رہنمائی کا محتاج ہے، نہ اس کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے اور نہ موجودہ زندگی کے بعد کوئی زندگی ہے، جس میں انسان کے دنیوی اعمال کا کوئی نتیجہ نکلنے والا ہو۔ انسان قطعی خود مختار ہے، اپنی زندگی کا راستہ اسے خود اپنے علم، تجربات اور مصالح کی روشنی میں تجویز کرنا ہے اور زندگی کا مقصود اسی حیاتِ دُنیا کی خوش حالی ہے۔

یہی وہ اصل چیلنج ہے جو اسلام کو قدیم جاہلیت کی طرح جدید جاہلیت بھی صدیوں سے دے رہی ہے اور اس کے مقابلے کا طریقہ بعینہٖ وہی ہے جو قدیم جاہلیت کے مقابلے میں قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری کامیابی کے ساتھ استعمال کرکے ہمیں دکھایا ہے۔ ہم جب تک اس تہذیب کی جڑ پر حملہ نہ کریں گے اس کو شکست نہ دے سکیں گے۔ اس کی فکری بنیادوں کی حقیقی غلطی وگمراہی کو نظرانداز کرکے اس کے شاخسانوں میں سے کسی ایک شاخسانے کے تجویز کردہ نظامِ حیات کو مستقلاً زیرِ بحث لانا اور پھر اس کے بھی صرف ظاہری پروگرام پر گفتگو کرکے اس کے حُسن وقبح کا فیصلہ کرنا ہمیں کبھی کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا بلکہ اس طرح بحث میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ اس کی بنیادی ضلالت سے غافل ہوکر ہم اس کے بعض اجزاء کو ترک اور بعض اجزاء کو قبول کرنے کی غلطی میں مبتلا ہوجائیں اور یہاں تک کہہ گزریں کہ "خدا۔جمع اشتراکیت مساوی اسلام"۔

مغربی تہذیب کا پیدا کردہ ہر نظام درحقیقت خدا سے کُفر اور بغاوت ہے۔ اس کا کوئی جُز قابلِ بحث نہیں ہے بلکہ کل کا کل غلط ہے۔ انسان سرے سے خود مختار ہے ہی نہیں کہ اسے اپنے لیے زندگی کا راستہ خود تجویز کر لینے کا کوئی حق ہو اور خُدا کی

راہ نمائی (یعنی بذریعہ رسالت اور بشکل شریعت رہنمائی) کے سوا انسان کے لیے کوئی راہ ہدایت کی راہ نہیں ہے کہ اس کے یا اس کے کسی جزو کے صحیح ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو۔ زندگی کا صحیح راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ ہم خواہ بیسویں صدی میں ہوں یا چالیسویں صدی میں، جس وقت بھی ہم کو زندگی کے مسائل و معاملات درپیش ہوں گے ان کو حل کرنے کے لیے ہم کتابُ اللہ اور سُنتِ رسُولؐ سے ہدایت اخذ کریں گے نہ کہ امریکہ یا روس یا چین یا کسی اَور سے۔ کتاب و سُنّت رسولؐ سے اخذ کردہ ہدایت کی بنا پر جو نظام اور پروگرام بنے گا اس کا کوئی جُز اگر اپنی ظاہری شکل میں ان باغیانہ نظاموں میں سے کسی کے کسی جُزو کے ساتھ مماثلت بھی رکھتا ہو تو دونوں کے مزاج اور ان کی رُوح اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج اور ثمرات میں کوئی مماثلت نہ ہوگی، کیوں کہ کسی مجموعی نظام کے ہر جزو کا مزاج وہی ہوتا ہے جو مجموعے کا مزاج ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے ہدایت کے لیے کتاب و سُنّت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے انسان کے اپنے گھڑے ہوئے نظاموں میں سے کسی کی طرف رجوع کیا اور اس کی کوئی ایسی چیز چھانٹ کر لے آئے جس کی ظاہری شکل کے خلاف کتاب و سُنّت سے کوئی دلیل بھی نہ لائی جا سکتی ہو پھر بھی چوں کہ اس جزو کا اخذ و اقتباس تقلیدِ جاہلیت کی بنا پر ہوگا اس لیے اس کا مزاج قطعی طور پر اسلام کے مزاج سے مغائر ہوگا اور یہ بے جوڑ پیوند کبھی اسلامی زندگی میں ٹھیک نہ بیٹھ سکے گا۔

———— ٭ ————

چند اہم مسائل

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا یہ انٹرویو ۱۹۶۸ء میں دمشق (شام) کے عربی ماہنامہ "المسلمون" کے نمائندے نے لیا تھا۔ اس کا ترجمہ جناب عارف کاشمیری نے کیا تھا جو ادارہ معارف اسلامی کراچی کے مجلّہ "چراغِ راہ" کے شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔

مغربی تہذیب اور مسلمان

س: آپ کے خیال میں مغربی تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کو کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے؟

ج: صحیح اندازِ فکر رکھنے والے مسلمان ہمیشہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو چیزیں اسلامی تعلیمات اور معیار کے مطابق ہوں خواہ وہ کسی بھی تہذیب سے تعلق رکھتی ہوں انھیں اختیار کیا جائے اور جو چیزیں اسلامی تعلیمات اور اُصولوں سے مطابقت نہ رکھتی ہوں انھیں رد کر دیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی انسانی تہذیب اس درجہ غیر صحت مندانہ عناصر کا مجموعہ ہوتی ہے کہ اسے بالکلیہ رد کر دیا جائے۔ صحت مند عناصر کے ساتھ ہمیشہ بعض غیر صحت مند چیزیں بھی ہوا کرتی ہیں۔

وہ چیزیں جو ہمیں مغرب سے لینی چاہئیں، ان میں سائنسی علم (Scientific Knowledge) اور زندگی کے عملی مسائل سے اس کا انطباق ہے اور ان کو میں

بنی نوع انسان کا مشترکہ ورثہ خیال کرتا ہوں۔ مجھے اس امر کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان اچھی چیزوں سے استفادہ کیوں نہ کیا جائے۔ بلکہ میرے خیال میں دوسروں سے اچھی باتیں لینے میں جھجک، کا انداز خود ہمارے لیے انتہائی طور پر مضرت رساں ہوگا۔ لیکن جہاں تک مغرب کا عالمی اندازِ فکر، ان کا انسان کے بارے میں نقطۂ نظر ان کا فلسفۂ زندگی اور ان کے اخلاقی اقدار کا تعلق ہے، ہمیں نہ تو ان کی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ ہمارے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول ہو سکتی ہیں۔ اسلام نے اِس سلسلے میں ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر، ارفع اور اعلیٰ ہے اور اگر مغرب کے عوام عقلِ سلیم سے عاری ہو کر نہیں بلکہ بے لاگ طریقے پر سوچیں اور غور کریں تو اسلام نے اس سلسلے میں بنی نوعِ انسان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس سے بڑا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

سائنسی ترقی اور مذہب

س: اگر مغرب نے جو علم اور سائنسی ترقی میں ہم سے بہت آگے بڑھ چکا ہے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی خاطر مذہب کو ترک کر دیا ہے تو کیا ہمارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم بھی اس سے سبق حاصل کریں اور مذہب کے بارے میں وہی انداز اختیار کریں جو مغرب نے اختیار کیا ہے؟

ج: یہ سوال اس مفروضے پر مبنی ہے کہ اہلِ مغرب اپنی سائنسی ترقی کے لحاظ سے اور عقلی لحاظ سے اس درجہ مکمل ہو چکے ہیں کہ اس نے انھیں معصوم بنا دیا ہے۔ مگر یہ تو ایسی چیز ہے جس کے بارے میں خود اہلِ مغرب بھی دعویٰ نہیں کرتے۔ دوسری طرف مغرب میں بڑھتا ہوا نظریاتی رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ انسانیت اور اخلاق و اقدار کے دائرے میں وہ اس حد تک ترقی نہیں کر پائے جتنی ترقی

انھوں نے مادّی سائنس میں کی ہے، بلکہ اس سلسلے میں انھیں تنزّل کا شکار ہونا پڑا ہے۔ اور مغربی مفکّرین دن بدن ان بنیادوں کے بارے میں شکوک وشبہات اور بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں جن سے مغربی تہذیب کا خمیر اُٹھایا گیا تھا۔ اور وہ خود اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ زیادہ ہی غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز بھی ہے جسے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ مغرب کی مذہب کی معروف مخالفت ان مخصوص تاریخی حالات کا نتیجہ ہے، جو یورپ میں اُس وقت پائے جاتے تھے۔ جب علم اور سائنس کے احیاء کے رجحانات، انتہائی ترقی یافتہ مسلم اسپین سے ربط وتعلق کی وجہ سے بڑھ رہے تھے، اس موقع پر اخلاقی لحاظ سے پست پادریوں کا طبقہ آزاد خیالی کی رَو کو روکنے کے لیے میدان میں آگیا اور راستی کی تلاش میں مشکلات کھڑی کردیں۔ پادریوں کے اس انحطاط پذیر طبقے نے ان صحت مندانہ تخیلات اور رجحانات کو دبانے کے لیے انتہائی ظلم وتشدّد کی راہ اختیار کی۔ اس مقصد کے لیے مذہبی عدالتیں قائم کی گئیں اور ان عدالتوں نے ان عظیم سائنس دانوں اور مفکّروں کو زندہ جلا دینے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی جو عقل وشعور اور چشم روشن سے دنیا کے مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ فطری طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے بھی آزاد خیالی اور روشن خیالی کی روش اختیار کی انھوں نے ان مذہبی عدالتوں کے ظلم وتشدّد کے خلاف ضد میں آکر یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ نہ صرف بدعنوان پادریوں کا طبقہ اور عیسائیت بلکہ خود مذہب بھی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رویہ مذہبی پیشواؤں کی استبدادیت کے خلاف جذباتی ردِّ عمل تھا۔ چنانچہ مذہبی پیشواؤں کے طبقے نے اس وقت مذہب کے خلاف اہلِ مغرب میں سخت ناراضی اور عدم اطمینان

کی کیفیت پیدا کر دی۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تمام جدید نظریات میں لادینیت کی رُوح سرایت کیے ہوئے ہے لیکن اگر کبھی اہلِ مغرب نے ٹھنڈے دل کے ساتھ اس مسئلے پر غور کیا ہوتا تو انھیں بآسانی معلوم ہو جاتا کہ سائنس اور مذہب میں بنیادی طور پر کوئی تصادم نہیں ہے۔ دنیا کے بارے میں مذہبی نقطۂ نظر اور اس کی اخلاقی اقدار اور سائنس کے دریافت کردہ حقائق جنھیں میں سائنسی نظریات سے قطعاً مختلف تصوّر کرتا ہوں، یہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ مختلف ہیں۔ سائنسی حقائق سائنسی نظریات سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں تک نظریات کا تعلق ہے ان میں قیاسات اور استدلال کے عناصر کچھ اس انداز سے در آئے ہیں کہ نتائج کی صحت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج تک کسی ایک بھی ایسی سائنسی تحقیق یا دریافت نے، جسے صحیح معنوں میں سائنسی تحقیق یا دریافت کہا جا سکے، مذہبی تعلیمات کی سچّائیوں کو مجروح نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس اور مذہب کے دائرہ ہائے کار مختلف ہیں۔ کیوں کہ سائنس ایسے ذرائع و وسائل سے محروم ہے جن کی مدد سے وہ مابعد الطبیعاتی اشیاء کو تجربے اور مشاہدے پر پرکھ سکے۔ پس خالص سائنسی نقطۂ نظر سے سائنس مذہب کی تعبیرِ کائنات سے متعلق غیر جانب دارانہ رویّے کی حامل ہے۔ نہ تو سائنسی طریق سے اس کی تائید کی جا سکتی ہے اور نہ ہی تردید۔ لیکن ہوا یہ کہ اہلِ مغرب نے مذہب کے خلاف اپنے جذباتی تعصب کی بنا پر اور سائنس کی خیرہ کُن ترقیوں سے مسحور ہو کر یہ سمجھ لیا کہ اب مذہب کی کوئی ضرورت نہیں رہی اور یہ کہ سائنس اب پوری طرح مذہب کی جگہ لے چکی ہے۔ یہ ابھی حال ہی کی بات ہے کہ اہلِ مغرب کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ یُورپ اور

امریکہ کے ذہین اور پڑھے لکھے افراد اس طرزِ فکر پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

مغرب کے مذہب دشمن رجحان کے تاریخی پس منظر کا یہ مختصر جائزہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ رجحان بعض مخصوص تاریخی حالات کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہمارے اپنے تاریخی تجربات اس سے قطعاً مختلف ہیں۔ ہماری پوری تاریخ میں سائنسی ترقی کے خلاف کبھی بھی کوئی مذہبی عدالت نہیں بٹھائی گئی بلکہ اس کے بجائے سائنسی ترقی کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی جاتی رہی ہے۔ اور اگر اس وقت ہم سائنس اور دیگر علوم میں دوسری اقوام سے بہت پیچھے ہیں تو اسلام قطعاً اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس کے اصل ذمہ دار تو مسلمان ہیں جو اسلام سے دوری کی بنا پر زندگی کے ہر شعبے میں تنزل کا شکار ہوئے ہیں۔ حالاں کہ انہی مسلمانوں نے ایک وقت میں سائنس میں دوسری تمام اقوام سے زیادہ ترقی کی تھی اور ان رجحانات کو پروان چڑھایا جن کی بدولت یورپ میں سائنس نے ترقی کی۔ وہ یورپ جو اُس زمانے میں جہالت اور زندگی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے شان دار ثقافتی کارناموں کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس زمانے میں آج کی نسبت دین ہماری زندگیوں میں اجتماعی اور انفرادی دونوں لحاظ سے زیادہ رچا بسا ہوا تھا۔

اگر ان حقائق کو ذہن میں رکھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ مغرب کی اندھی نقالی ہی ہمیں یہ رائے قائم کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے کہ ترقی کی طرف گامزن ہونے کے لیے مذہب کو ترک کر دینا چاہیے۔

دَورِ جدید اور مذہب

س : آج کل یہ بات اکثر دُہرائی جاتی ہے کہ ہمارا دَور مذہب کا نہیں سائنس کا دَور ہے اور یہ اندھے عقیدے کا نہیں بلکہ عقلیت کا دَور ہے ۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ۔

ج : یہ بات اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب مذہب اندھے عقیدے اور یقین کا ہم معنی ہوتا اور اگر دنیا میں واقعی کوئی ایسا مذہب موجود ہے تو وہ کسی بھی دَور میں قابلِ قبول نہیں ہونا چاہیے ۔ لیکن اسلام کے بارے میں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ نہ کبھی اندھے عقیدے اور یقین کے ساتھ ہم معنی تھا اور نہ اب ہے ۔ قرآن خود انسان کی عقل و شعور کو اپیل کرتا ہے اور اُسے عقلی سُوجھ بُوجھ کی دعوت دیتا ہے ۔ اسلام ہمیشہ اپنے ماننے والوں کا اپنی تعلیمات کی سچائی کے بارے میں دلائل کے ساتھ مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو گلو گیر لہجے میں چیخ چیخ کر یہ کہتے ہیں کہ ان کا زمانہ سائنس اور عقلیت کا زمانہ ہے تو انھوں نے خود متعدد چیزیں کسی سائنسی ثبوت کے بغیر ہی قبول کر رکھی ہیں ۔ مثال کے طور پر خدا کا موجود نہ ہونا اور آخرت ۔

کیا مذہب افیون ہے ؟

س : کمیونزم ایک بھوکے شخص کو روٹی دینے کا وعدہ کرتا ہے جب کہ اسلام اس سے صرف جنّت کے حصول کا وعدہ کرتا ہے ۔ اگر ایسا ہے تو آپ کے خیال میں کیا مذہب وہ افیون نہیں ہے جو سرمایہ دار مظلوم عوام کو اپنے حقوق کی

جدوجہد سے روکنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور مشکوک جنّت کے بہانے انہیں بہتر معاشی مستقبل کو قربان کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

ج: آپ نے سوال میں جو دو باتیں کہی ہیں وہ دونوں صحیح نہیں ہیں۔ کیمونزم روٹی کا وعدہ نہیں کرتا۔ یہ روٹی کا وعدہ انسانی آزادی کی قیمت پر کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ نہ صرف جنّت کا وعدہ کرتا ہے، بلکہ یہ اس دُنیا میں بھی اچھی زندگی اور آخرت میں بھی بہتر زندگی کا وعدہ کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ انسانی آزادی کو چھیننے کے بجائے اس کی حفاظت ضروری خیال کرتا ہے۔ اس طرح آپ کی اس دلیل کی بنیاد ہی معدوم ہوجاتی ہے۔

تاہم اگر ٹھیک طور پر ان دونوں میں سے کسی کو افیون کہا جا سکتا ہے تو وہ خود کیمونزم ہی ہے۔ کیوں کہ یہ کیمونزم ہی ہے جو اس دُنیاوی جنّت کے وعدے پر بھوک کو اس حد تک اُچھالتا ہے کہ مظلوم اور بھوکے عوام کیمونسٹ نظام کے بدلے رضامندی کے ساتھ اپنی آزادی کی قربانی دینے کے تیار ہوجاتے ہیں۔

کیمونزم کی مخالفت

س: وہ کیا وجوہ ہیں جن کی وجہ سے آپ (دوسرے ممالک میں تحریکِ اسلامی کے رہنماؤں کی طرح) سرمایہ دارانہ نظام کی مسلّمہ مذمّت کے باوجود کیمونزم کی اس شدّت کے ساتھ مخالفت کررہے ہیں؟ کیا آپ کی یہ مخالفت مذہبی بنیادوں کے علاوہ کچھ اور بنیادیں بھی رکھتی ہے۔

ج: اگر مذہبی بنیادوں سے آپ کی مُراد یہ ہے کہ ہم کیمونزم کی مخالفت اس حقیقت کی وجہ سے کررہے ہیں کہ ہم مذہب کے ماننے والے ہیں اور کیمونزم مذہب کی مخالفت کرتا ہے، تو میں کہوں گا کہ ہم مذہب کے علاوہ دوسری وجوہ کی

بنا، پر بھی کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم کمیونزم کی مخالفت اس وجہ سے بھی کرتے ہیں کہ کمیونسٹ نظام کے قیام میں ظلم وستم اور جبرواستبداد کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے قائم رکھنے کے لیے آئینی آمریت لازمی شرط ہوتی ہے۔ ہم کمیونزم کی مخالفت اس بنا پر بھی کرتے ہیں کہ کمیونزم جو نظام قائم کرتا ہے اس میں انفرادی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں، اور کمیونسٹ نظام میں تنقید کرنے، اصلاحات کی دستوری کوشش اور حکومت کی جمہوری تبدیلی کی قطعاً کوئی آزادی نہیں ہوتی۔ لیکن چوں کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ تمام چیزیں مذہبی لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہیں اور اگر فقط مذہب کو اس وسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم کمیونزم کی خالص مذہبی بنیادوں پر مخالفت کرتے ہیں۔

مغربی بلاک کا کردار

س: کیا آپ کی کمیونزم کی مخالفت سے بین الاقوامی سیاست میں مغربی بلاک کی حمایت نہیں ہوتی۔ کیا آپ مغربی بلاک کو صرف اس وجہ سے مستحکم ومضبوط کرنا پسند کریں گے کہ یہ بھی کمیونزم دشمن ہے۔ حالاں کہ یہ بلاک کمزور خصوصاً اسلامی ممالک کے خلاف اپنے جارحانہ اور شرمناک سامراجی کردار کی وجہ سے کافی بدنام ہے۔

ج: ہم مغربی بلاک اور اس کے سامراجی پالیسیوں کے اتنے ہی مخالف ہیں جس قدر کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں۔ جب ہم کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں تو ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم بالواسطہ طور پر مغربی بلاک کو مستحکم کر رہے ہیں۔ حالاں کہ اگر یہ منطق صحیح تسلیم کی جائے تو ہماری مغربی بلاک کی مخالفت کو بھی بالواسطہ طور پر کمیونزم کی حمایت تسلیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں

ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک شخص بیک وقت دو اشخاص کی مخالفت کرتا ہے جو خود بھی ایک دُوسرے کے مخالف ہوں، تو کیا ایک شخص کی ان میں سے ایک کی مخالفت دوسرے کی حمایت تصوّر کی جائے گی؟ لیکن ان خطوط پر سوچنا قطعی صحیح نہیں ہے۔

اِسلامی ریاست کے غیر مُسلم شہری

س: تمام اسلامی ممالک میں ایک اچھی خاصی تعداد میں غیر مسلم اقلیت آباد ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام سے وہ خوف زدہ ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے بڑی دشواریاں اور مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو مطمئن رکھا جا سکتا ہے؟

ج: مَیں دنیا میں کسی ایسے ملک سے واقف نہیں ہوں جو نسلی یا نظریاتی بنیادوں پر قائم ہو اور جہاں اقلیت نہ پائی جاتی ہو۔ اور اگر کسی قومی یا نظریاتی ریاست کا وجود کسی ایک قوم کے ساتھ مشروط کر دیا جائے جو ایک ہی قومیت اور نظریۂ حیات رکھنے والی ہو تو یہ اعتراض دُنیا کی تقریباً تمام ریاستوں پر یکساں چسپاں ہو گا۔ لیکن میں نے کسی کو اس بنیاد پر کوئی اعتراض کرتے ہوئے نہیں سُنا۔ اس صورتِ حال میں ایسے ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، غیر مسلم اقلیتوں کی موجودگی کو بہانہ بنا کر، اسلامی ریاست کے قیام کے خلاف ہی یہ شور و غوغا آخر کیوں کیا جاتا ہے؟

مَیں یہ بھی کہوں گا کہ کسی خاص طرز کی ریاست کا قیام اقلیت کے اطمینان سے مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ آپ امریکہ کے نیگرو (سیاہ فام باشندوں) کے پاس چلے جائیے اور ان سے پُوچھیے کہ وہ کس حد تک مطمئن ہیں؟ آپ روس

چلے جائیے اور وہاں غیر کمیونسٹوں سے دریافت کیجیے کہ وہ ان حالات سے کس حد تک مطمئن ہیں جو اس وقت روس میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے میری قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ ہم اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے اس طرح کا سلوک روا رکھیں گے جس طرح امریکہ میں نیگروں سے اور روس میں غیر کمیونسٹوں سے روا رکھا جاتا ہے، میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک کی واضح اکثریت کسی خاص طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہو تو صرف اقلیت کی غیر اطمینان صورتِ حال کوئی معقول بنیاد نہیں بن سکتی کہ خاص طرز کی حکومت کے قیام کے خیال ہی کو ترک کر دیا جائے۔

جہاں تک مسلمانوں کا غیر مسلم اقلیت کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے۔ تاریخ میں اس حقیقت کے ناقابلِ انکار شواہد موجود ہیں کہ ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ ایسا سلوک جس کی مثال دوسری اقوام کی تاریخ میں نہیں ملتی اور ہم مستقبل میں بھی غیر مسلم اقلیت کے ساتھ ایسا ہی فیاضانہ سلوک روا رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اِس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں کا یہ فیاضانہ سلوک محض کسی خاص وجہ سے نہیں رہا ہے بلکہ یہ ان کے مذہب اسلام کی واضح تعلیمات کا نتیجہ بھی ہے۔ اس لیے غیر مسلموں کے بارے میں مسلمانوں کے اس فیاضانہ اور منصفانہ رُجحان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی اس بات کی حاجت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا جائے جو شریعتِ اسلامیہ نے انھیں دیے ہیں۔ ویسے یہ بات ہمارے عقیدہ و مسلک کے بھی منافی ہوگی۔ اس طرح ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کو اکثریت کے رحم و کرم پر بھی

نہیں چھوڑ دیا گیا۔ ان کے حقوق کو باقاعدہ متعین کر دیا گیا ہے اور انھیں خدا اور اس کے رسولؐ کی ضمانت بھی حاصل ہے، اس لیے کوئی بھی ان کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس وقت میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں تفصیل سے وہ حقوق بتاؤں جو ایک اسلامی ریاست میں اسلامی شریعت نے غیر مسلموں کو دیے ہیں۔ میں صرف ایک بات پر زور دوں گا اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے غیر مسلم اقلیتوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے نجی معاملات کو اپنے پرسنل لاء کے مطابق طے کریں اور یہ بات قانون اور فقہ کی تاریخ میں بہت بڑا کارنامہ ہے۔

غلبۂ اسلام کے امکانات

س: مسلم ممالک میں مستقبل قریب میں اسلام کے ایک نظریۂ حیات کی حیثیت سے غالب آنے کے کیا امکانات ہیں؟

ج: اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے اگرچہ اسے بظاہر آسان بھی سمجھا جانا چاہیے۔ مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ یہ سوال آخر کیوں کیا جا رہا ہے کہ اسلام کے ایک نظریۂ حیات کی حیثیت سے مستقبل قریب میں ان علاقوں میں غالب آنے کے کتنے امکانات ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں جب کہ وہ خود اپنی منزل کے تعین میں آزاد بھی ہیں۔ ایک شخص آسانی سے یہ جواب دے سکتا ہے کہ جس دن وہ غیر ملکی تسلّط سے آزاد ہوتے ہیں اسلام سربلند ہو جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوتا۔ برطانوی سامراج کے تسلّط سے ہمیں جو سب سے بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے وہ یہ ہے کہ اس تسلّط نے ہمارے ممالک میں ایک ایسے مخصوص طبقے کو جنم دیا ہے جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں، جو نسلی

لحاظ سے بھی مسلمان ہیں، جو ہمارے ہی گوشت پوست کا حصّہ ہیں اور جن کی رگوں میں ہمارے ہی آباؤ اجداد کا خون دوڑ رہا ہے، لیکن جو بدقسمتی سے طرزِ فکر اور طریقِ رہائش میں مکمل طور پر غیر ملکی ہیں اور ہم سے بے گانے ہیں۔ غیر ملکی تسلّط کے دوران یہی لوگ تھے جنھیں غیر ملکی طاقتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کرتی تھیں اور یہی طبقہ تھا جن پر غیر ملکی سامراجی اعتماد کرتے تھے اور جب ان غیر ملکی سامراجیوں کو حالات سے مجبور ہو کر ہمارے وطن کو خدا حافظ کہنا پڑا تو وہ اسی طبقے کو اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے۔ اس وقت تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں عملی طور پر یہی مخصوص اور قلیل طبقہ ہے جس کے ہاتھوں میں ملک کی سیاسی اور معاشی اقتدار کی باگیں ہیں اور جو سیاسی اور معاشی لحاظ سے پورے ملک کو کنٹرول کرتا ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف عوام کی وہ اکثریت ہے جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ اسلام کو مانتی ہے، اسلام کو اپنے نظریۂ حیات کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اور عملی طور پر اس نظریے کو نافذ دیکھنا چاہتی ہے! اس مقصد کی خاطر اس نے آزادی کے حصول کے لیے صرف اس بنا پر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں کہ آزادی کے بعد اسلام کو سربلند اور عملی طور پر نافذ کیا جائے گا۔ دوسری طرف ہم ہی میں سے ایک مختصر سا گروہ ہے جو عوام کی اکثریت سے بالکل مختلف نظریات رکھتا ہے اور جس کا زندگی کے ہر شعبے پر کنٹرول ہے۔ یہ ہے وہ صورتِ حال جس کی وجہ سے مسلمان ممالک میں شدید داخلی کشمکش رونما ہو چکی ہے اور کوئی بھی یہ پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ اس صورتِ حال کا خاتمہ کب ہوگا۔ تاہم جب تک یہ صورتِ حال جاری رہے گی اور جب تک یہ کشمکش بپا رہے گی کہ عوام اور حکمران وسیع نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ایک

دُوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں، اس وقت تک مسلم ممالک ترقی کی جانب قدم نہیں بڑھا سکتے اور جتنی جلدی یہ کشمکش اختتام کو پہنچے گی اتنا ہی بہتر ہوگا۔ کیوں کہ یہ کشمکش جس قدر طول کھینچے گی اُسی قدر مسلم ممالک کو ہر لحاظ سے کمزور ہی کرتی رہے گی۔

اِسلامی تحریکات کا مستقبل

س: دنیا کی بڑی طاقتوں کے اشارے پر حال ہی میں عالمِ اسلام میں تحریکاتِ اسلامی کو دبانے اور انہیں بہ جبر ختم کرنے کی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا اس سے اسلام پسند طبقوں میں اسلام کے بارے میں مایوسی کی لہر نہیں دَوڑ جائے گی یا انہیں مایوسانہ رویّہ اختیار کرنے کی ٹھوس وجہِ جواز نہیں مل جائے گی۔

ج: وہ لوگ جو اسلام سے واقعی محبّت کرتے ہیں اور جو اس کے حق ہونے پر عقلی لحاظ سے بھی مطمئن ہیں اور اس کے سچّا ہونے پر ایمان بھی رکھتے ہیں وہ کبھی اس صورتِ حال سے گھبرا کر دل نہیں چھوڑ سکتے اور مایوس ہوکر نہیں بیٹھ سکتے۔ ایسے لوگ اسلام کی سربلندی کے لیے جدّوجہد کو اپنے آخری سانس تک جاری رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس خیال سے قطع نظر کہ اِس دُنیا میں ان کی جدوجہد کامیاب ہوگی یا ناکام۔ اور اگر اس دنیا میں ظاہری طور پر انھیں ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑے تو وہ حقیقت میں اسے ناکامی نہیں سمجھتے، کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے اور یہی ان کا مقصد ہے۔ اس لحاظ سے ناکامی ان مخلص، فرض شناس اسلام کے مجاہدوں کی نہیں ہے۔ اصل رُسوائی اور ناکامی ان لوگوں کی ہے جو مسلمان ہونے کے دعوے کے باوجود اسلام پسندوں کی راہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں شکست دینے کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ یہی لوگ ہیں جو دُنیا و آخرت دونوں میں خُدا کے عذاب

کے مستحق ہیں۔ اس عذاب کے آنے میں ہو سکتا ہے تاخیر ہو جائے، لیکن جب خُدا کسی شخص پر اپنا عذاب مسلط کرتا ہے تو یہ پُوری دنیا کے لیے تنبیہہ اور وارننگ کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاہم مجھے کامل یقین ہے اور مجھے اپنے اس ایقان پر اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ کل سُورج طلوع ہوگا اور اگرچہ مَیں اس یقین کُلّی کے لیے دلائل دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ انشاءاللہ اسلام کی طاقتیں بالآخر فتح مند و کامران ہوں گی۔

مَولانا مودودی نسلی تعصب کا حل پیش کرتے ہیں

۲۳ ر اگست ۱۹۶۸ء سے ۲۹ ر دسمبر ۱۹۶۸ء تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ علاج کی غرض سے لندن میں مقیم رہے۔ برطانوی لیبر پارٹیؒ کے ترجمان روزنامہ "سَن" (Sun) کے نامہ نگار ایلن ہال (Allan Hall) نے مولانا موصوف سے یہ انٹرویو لیا جو اس اخبار میں ۱۳ ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ جناب حفیظ الرحمٰن احسن نے کیا جو ہفت روزہ "آئین" میں ۸ ر جنوری ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا۔ واضح رہے کہ لیبر پارٹی کی حکومت تارکینِ وطن کے مقامی آبادی میں مکمل انضمام (Integration) کی حامی ہے اور اس کا یہی نقطۂ نظر اس اخبار کے نامہ نگار کی زبانِ قلم سے بھی بیان ہوا ہے۔ تاہم انٹرویو نگار نے مولانا مودودیؒ کے موقف کو بھی پوری دیانت داری سے پیش کیا ہے ـــــ یاد رہے کہ یہ انٹرویو مولانا مودودی صاحبؒ کے لندن ہلٹن کے اس خطاب سے پیشتر لیا گیا تھا جس میں مولانا مودودی صاحب نے برطانیہ میں مقیم تارکینِ وطن کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ـــــ (Multicultural society) کی تجویز پیش فرمائی تھی۔

یہاں انگلستان میں ایک بڑی زوردار اور جرأت مندانہ تحریک اپنی پوری قوت کے ساتھ چل رہی ہے جس کا مقصد ترکِ وطن کر کے آنے والے باشندوں کو

مقامی آبادی میں جذب کرنا ہے۔

ایک خوفناک جنگ ہے

بے شک یہ ایک خوفناک جنگ ہے (کیوں کہ ایک دُوسری متبادل تحریک غیر ملکیوں کے بالکلیہ اخراج کی علم بردار ہے)، نسلی تعصب کی کارفرمائی عروج پر ہے۔ ہر چند کہ یہ تعصب کوئی ناقابلِ تسخیر چیز نہیں ہے۔ لیکن انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہ قابلِ تسخیر ہوتے ہوتے بھی بعض دوسری غیر معمولی قوتوں پر ہمیشہ غالب آتا رہا ہے۔

تب کیا یہ زیادہ بہتر اور مفید نہ ہوگا کہ ہم پہلے اس بات کا تعین کرلیں کہ اس اِنضمام (Integration) سے ہماری مراد کیا ہے جس کے لیے یہاں جنگ لڑی جارہی ہے۔ کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ ترکِ وطن کر کے یہاں آتے ہیں اور یہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان کو اس حیثیت سے یہاں جذب کرلیا جائے کہ وہ اس ملک کے طرزِ زندگی، روایات اور اقدار کو بھی اپنالیں اور "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے مصداق یہیں کے ہوکر رہ جائیں؟

بے شک بہت سے لوگوں کے نزدیک اس کا مفہوم یہی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ ایک دن یہ چیز ممکن ہوکر رہے گی جیسا کہ ویسٹ انڈیز کے تارکینِ وطن کے سلسلے میں یہ ہو بھی چکا ہے، یہ آزاد منش اور بے فکرے لوگ بنیادی مغربی روایات کو پوری طرح اختیار کر چکے ہیں۔

لیکن کیا یہ چیز ایشیائی قوموں سے تعلق رکھنے والے گروہوں کے بارے میں بھی ممکن تسلیم کی جاسکتی ہے جو لندن کے مرکزی علاقوں مثلاً برمنگھم اور بریڈ فورڈ میں مقیم ہیں اور جو اپنے ساتھ ایک مختلف ثقافت، مختلف روایات اور مختلف اقدار لے کر آئے ہیں؟

اِس سوال کا ایک واضح جواب

ان لوگوں کا طرزِ عمل کیا ہوگا اور ان کا مستقبل

Their future is unequivocally expressed for them this week by the great Muslim teacher Abul A'ala Maududi, who is visiting London.

He demands no Surrender of the Islamic tradition and culture to Westernisation.

He demands that of Muslims in his own native Pakistan, and he demands it also of Muslims in this country.

یہاں کیا ہے؟ ــــ اس سوال کا ایک بڑا قطعیُ القراحت جواب اس ہفتے اسلامی تعلیمات کے ایک عظیم معلّم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی زبان سے سامنے آیا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو اسلام کے ایک بہت بڑے مفکّر ہیں، آج کل لندن میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔

مولانا مودودی کا مطالبہ مسلمانوں سے یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں اِسلامی روایات اور تہذیب وثقافت سے کسی قیمت پر بھی دست بردار نہ ہوں۔ اپنے وطن پاکستان کے مسلمانوں سے بھی اور یہاں انگلستان میں مقیم مسلمانوں سے بھی ان کا مطالبہ ایک ہی ہے۔

اِسلامی روایات اور ثقافت سے دست بردار نہ ہونے کا مفہوم عملی زندگی میں یہ ہوگا کہ مسلمان خواتین پردے کی پابندی کریں اور ان کا دائرۂ عمل گھر تک محدود رہے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مذہبی فرائض کی سختی سے بجا آوری کریں تاکہ وہ اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی کے غلط اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

مولانا مودودی اِس مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں

المختصر یہاں غیر ملکیوں کا مکمل انضمام ایک ناممکن الحصُول چیز ہے۔ اس کے بجائے مولانا مودودی "مکمل باہمی تعاون اور رَوا داری" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ ایک مختلف چیز ہے۔

مولانا مودودی بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن وہ اپنے اس حل کے سلسلے میں غیر معمولی حد تک پُراعتماد اور پُرسکون ہیں — وہ برّ صغیر پاک و ہند کی ایک برگزیدہ مذہبی شخصیت ہیں اور انتہا درجے کی دھیمی، پُرسکون اور اُستوار طبیعت کے مالک انسان ہیں۔ چہرے پر خوب صورت سفید داڑھی اور اسلامی لباس کے ساتھ ان کی شخصیت اور زیادہ باوقار نظر آتی ہے — وہ بڑی صاف گوئی سے کہتے ہیں کہ:

"یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اپنے لوگوں کو اس رواداری اور وسیعُ الظرفی کی تعلیم دیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ بہت سی نسلوں پر مشتمل سوسائٹی کو قبول کریں بلکہ مختلف ثقافتوں کی علم بردار قوموں پر مشتمل سوسائٹی (Multicultural Society) کی تشکیل کو بھی تسلیم کریں۔"

کیا یہ ممکن ہے؟

اِس نامکمل دُنیا میں یہ ایک ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ مقامی آبادی میں تعصّب کو غذا بیرونی ثقافتوں کے مختلف مظاہر مثلاً لباس اور اُن کے دوسرے رُسوم و رواج وغیرہ سے ملتی ہے — لیکن مولانا مودودی کا نقطۂ نظر اس معاملے میں بالکل واضح طور پر دوٹوک اور غیر مصالحانہ ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

"بلاشبہ تعصب ماحول پر بُری طرح چھایا ہوا ہے لیکن لوگوں کے لباس وغیرہ تو سطحی چیزیں ہیں، اصل تعصب جس کا تدارک کرنے کی ضرورت ہے وہ اس سطح کے نیچے، خیالات و افکار میں پایا جاتا ہے۔ برطانوی باشندے بھی تو آخر ہمارے ملک میں آکر رہے تھے لیکن ہم نے تو انھیں کبھی مقامی معاشرے میں جذب ہو جانے کے لیے نہیں کہا تھا اور نہ ہم نے ان سے کبھی اپنے مقامی لباس پہننے کا مطالبہ کیا تھا— موجودہ دور میں یہ بات کچھ ضروری نہیں رہی ہے کہ لوگ اپنے ملکوں کے اندر ہی محدود رہیں اور اُن سے باہر نہ نکلیں، لیکن جو بات میں یہاں کے مسلمانوں سے کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس ملک میں اخلاص اور فرض شناسی کے جذبے کے ساتھ کام کریں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مخلص اور سچے پیرو بنیں۔ یہاں کے لوگوں کے سامنے ایک اچھا نمونہ پیش کریں۔ اور یہ بات خاص طور سے سامنے رکھیں کہ وہ یہاں کسی قیمت پر بھی اپنی اسلامی تہذیبی روایات سے انحراف نہیں کریں گے۔"

صاف گو انسان

مولانا مودودی برطانیہ میں مقیم مسلمان آبادی پر اسلام کی مضبوط گرفت میں نہایت کامل یقین رکھتے ہیں، اور یہ بات یقینی طور پر درست ہے کہ مولانا مودودی کی تعلیمات کو یہاں وسیع قبولیت اور حمایت حاصل ہے —— ہیتھرو ائیرپورٹ (لندن) پر مولانا کو خوش آمدید کہنے والا مجمع دو ہزار افراد پر مشتمل تھا، اور اب ان کے اعزاز میں اتوار کے روز ہلٹن ہوٹل میں ایک عظیم الشان دعوتِ استقبالیہ دی جارہی ہے

۔ہلٹن میں اس روز یقیناً شراب کا کوئی دَور نہیں چلے گا کیوں کہ سچے مسلمان شراب نہیں پیتے ۔

اُن کا مشن اسلامی تہذیب کا احیاء ہے

مولانا مودودی پاکستان کی ایک ممتاز اور سربرآوردہ شخصیت ہیں ۔ وہ حزبِ مخالف کے سب سے زیادہ صاف گو اور بے لاگ ترجمان کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے پیروکار اسلام کے موضوع پر اُن کی تصنیف کردہ کُتب سے فکری غذا حاصل کرتے ہیں۔ اِن تصانیف کی تعداد کم از کم ساٹھ تک پہنچتی ہے ۔

ان کے دعوتی پلیٹ فارم کی تشکیل کا ملّا دینِ اسلام سے ہوئی ہے ۔
ان کی دعوت کے نکتے یہ ہیں :
قرآنی ہدایات کے مطابق جمہوریت کی بحالی اور
متجدّدانہ افکار سے کسی طرح کی مصالحت کیے بغیر خاص اسلامی نظریۂ حیات کا اِحیاء ۔

—— مختصراً یہ کہ پاکستان سے مغربی تہذیب کے اثرات وتسلط کا مکمل خاتمہ ۔

مولانا مودودی اسلامی روایات کا اِحیاء چاہتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ : "ہم مسلمانوں کے لباس کو کسی کے لیے لازم قرار نہیں دیتے لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ کسی انسان کو مہذّب بننے کے لیے مغربی لباس کے پہننے کی ضرورت نہیں ہے ۔"

مولانا مودودی اپنے اس مشن کی راہ میں قید و بند کے مرحلوں سے بھی گزُرے ہیں ۔ انھیں خاصے عرصے تک پاکستان کی جیلوں میں نظر بند رہنا پڑا ہے ، اور ایک موقعے پر توانھیں واقعۃً موت کی سزا بھی سُنائی گئی تھی ۔

"اِس طرح کی صورتِ حال کے تدارک کے لیے آپ کیا کہنا یا کرنا پسند کریں گے؟" میں نے مولانا سے ایک سوال کیا۔

اُن کا جواب یہ تھا:

"یہ ایک ایسا سوال ہے جو آپ کو میرے ملک کے اصحابِ اقتدار سے کرنا چاہیے — میں اس بارے میں لاعلم ہوں، کیوں کہ مجھے ہمیشہ بغیر مقدمہ چلائے نظر بند کیا گیا اور کبھی کسی باقاعدہ عدالت میں مجھے پیش نہیں کیا گیا۔"

اپنی پینسٹھ سال عمر کے اس مرحلے پر مولانا مودودی کسی درجے میں بھی "انقلابی" نظر نہیں آتے۔ وہ ایک مشفق، نکتہ سنج، طبّاع اور کریمُ النفس بزرگ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مہمان نواز بھی۔ اُنھوں نے مجھے چائے سے نوازا۔ (چائے دانی پر ٹی کوزی دیکھنے کا اتفاق مجھے کئی برسوں کے بعد ہوا)۔ مولانا نے خود چائے نہیں پی۔ سال کے اِس حصے میں مسلمان آج کل دن کے وقت روزہ رکھتے ہیں۔

مولانا کو دیکھ کر دل میں عزّت و احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں —— ہلٹن ہوٹل میں اُن کے خیالات کو یقیناً توجہ کے ساتھ سُنا جائے گا۔

("Sun" ۱۲؍ دسمبر ۱۹۶۸ء)

مُجلّۃ الغُربا کا سوال نامہ اور اُس کا جواب

لندن سے ایک رسالہ عربی زبان میں مُجلّۃ الغربا، کے نام سے نکلتا ہے جسے ان عرب طلبا، نے جاری کیا ہے جو برطانیہ میں مقیم ہیں اور اپنی دُوسری مصروفیتوں کے ساتھ اسلام کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ اِس رسالے نے مولانا مودودیؒ سے ان کے زمانۂ قیامِ لندن میں چند سوالات کیے تھے جن کا جواب انھوں نے وہیں دے دیا تھا۔ ذیل میں یہ سوال نامہ اور اس کے جوابات درج کیے جارہے ہیں۔ یہ انٹرویو ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور کے شمارہ فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

سوال نامہ

۱۔ الغُربا، اسلام پسند طلبہ کا مجلّہ ہے اور برطانیہ سے عربی زبان میں نکلتا ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ قارئینِ مُجلّہ کو جماعتِ اسلامی پاکستان کے حالات سے مختصراً آگاہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی مسلمانوں کے اندر مختلف مذہبی تصوّرات پائے جاتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی نے اختلافِ مذاہب کے مسئلے کو کس طرح حل کیا ہے؟

۳۔ موجودہ حالات میں وہ کون سا اہم ترین میدانِ کار ہے جس پر اسلامی تحریک کو

اپنی تمام تر کوششیں مرکوز کردینی چاہییں ؟ کیا سیاسی میدان ؟ تعلیمی میدان ؟ یا کوئی اور میدان ؟

۴- اسلامی تحریک کی ایک متحدہ عالمی قیادت قائم کرنے پر مدت سے سوچ بچار ہو رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

۵- عالمِ اسلام اِس وقت جن حالات سے گزر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اِن حالات میں اُمورِ ذیل کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے ؟

(الف) مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کا انعقاد ،

(ب) مشترکہ اسلامی منڈی کا قیام ،

(ج) بین الاقوامی اسلامی نیوز ایجنسی کا اجراء ۔

۶- اِسلامی تحریکیں اس وقت جگہ جگہ حکومتوں کے جبر و تشدد کی فضا میں سانس لے رہی ہیں، چنانچہ آپ کی نظر میں وہ کون سا مناسب ترین رویّہ ہے جو اسلامی تحریکوں کو ان حکومتوں کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے ؟

۷- آپ کی رائے میں اسلامی تحریک کو مغربی ممالک میں کس اہم پہلو پر زیادہ زور دینا چاہیے ؟

۸- مغرب میں کام کرنے والے داعیانِ اسلام کے لیے آپ کے مشورے کیا ہیں ؟

۹- دو حرفی سوال ہے کہ بیت المقدس کی واگزاری کا صحیح راستہ کیا ہے ؟

۱۰- آپ کے قلم نے اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ کے متعدد گوشوں پر وافر لٹریچر فراہم کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے موضوع پر آپ کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی۔ کیا آپ اس موضوع پر لکھنے کا اِرادہ رکھتے ہیں ؟

۱۱- عہدِ حاضر کے اسلامی مفکّر ہونے کی حیثیت سے کیا آپ نے اپنے دَور میں

اِسلامی نظریے کے اندر کوئی تبدیلی یا ترقی محسوس کی ہے ؟

۱۲- اِسلامی مفکّرین نے موجودہ صدی میں ، بلکہ کسی حدتک گزشتہ صدی میں بھی متعدد مغربی اصطلاحیں استعمال کی ہیں ۔مثلاً ڈیموکریسی، نیشنلزم ، وطنیت، پارلیمنٹ، دستور، سوشلزم وغیرہ ۔یہ اصطلاحیں ماضی قریب کے زمانے تک برابر استعمال ہوتی رہی ہیں ۔لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اسلامی مفکّرین ان اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں ، بلکہ اسلامی نظام کی تشریح میں ان اصطلاحوں کو اختیار کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کا رجحان ہی نہیں بلکہ اصرار ہے کہ خالص اسلامی اصطلاحات کو استعمال کرنا چاہیے جو قرآنِ کریم اور سُنّتِ رسول ؐ سے ماخوذ ہوں ۔کیا آپ اپنے تجربات اور اسلامی احساسات کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ ہماری آئندہ نسلوں میں ایسے اسلامی مفکّرین پیدا ہوں گے جو ہر اُس چیز کو کُلّیۃً رد کر دیں گے جو قرآن و سنّت سے خارج ہوگی ، اور اسلامی شریعت ، احکامِ قرآن اور دیگر اسلامی معاملات کے بارے میں کسی بحث و جدال کو برداشت نہیں کریں گے ، بلکہ اُن تمام چیزوں کو اُسی طرح اصل حالت میں اختیار کریں گے جس طرح دعوتِ اسلامی کے آغاز میں ان کو اختیار کیا گیا تھا ؟

۱۳- دُنیائے اسلام میں بیشتر لوگ اِس خیال کا اظہار کر رہے ہیں کہ ظہورِ مہدی (جس کی بشارت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دی ہے) سے پہلے جس قسم کے حالات کی خبر دی گئی ہے وہ اِس زمانے میں رونما ہو چکے ہیں ۔آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

۱۴- مسلم اور اسلامی کے درمیان کیا فرق ہے ؟ کیا ان دونوں لفظوں کا استعمال دُرست ہے ؟

جواب

۱۔ مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ برطانیہ میں آپ لوگ مجلۃ الغرباء کے نام سے ایک عربی پرچہ شائع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی کوششوں میں برکت دے اور آپ اس پرچے کے ذریعے سے طلبہ میں اسلامی رُوح بیدار کرنے اور بیدار رکھنے کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔

جماعت اسلامی کے متعلق تمام ضروری معلومات آپ کو جماعت کے ایک ممتاز کارکن پروفیسر غلام اعظم صاحب (جنرل سکریٹری جماعت اسلامی مشرقی پاکستان) کی ایک تازہ کتاب سے حاصل ہوسکتی ہیں جو حال میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے[1]۔ اس کا ایک نسخہ اس جواب کے ساتھ آپ کو مہیا کیا جارہا ہے۔

۲۔ پاکستان میں اس وقت تین ہی فقہی مذاہب ہیں۔ ایک حنفی، دوسرے اہلِ حدیث، تیسرے شیعہ امامیہ۔ ان تینوں مذاہب کے علماء نے ۱۹۵۱ء میں باہم اتفاق سے یہ بات طے کرلی تھی کہ ملکی قانون (Law of the Land) اکثریت کے مسلک پر مبنی ہوگا۔ اور ہر فقہی مذہب کے پیروؤں کو یہ حق دیا جائے گا کہ ان کے شخصی معاملات ان کے اپنے پرسنل لاء کے مطابق طے کیے جائیں۔ رہے مختلف مذاہب کے اعتقادی اختلافات، تو نہ وہ دُور کیے جاسکتے ہیں، نہ اُن کو دُور کرنا ضروری ہے۔ صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہر گروہ اپنے عقیدے پر قائم رہے اور سب ایک دوسرے کے ساتھ رَوا داری

---

[1] کتاب کا نام ہے: A Guide to the Islamic Movement

برتیں۔ اس کے لیے جماعت ملک میں مسلسل کوشش کر رہی ہے۔

۳۔ اِسلامی تحریک کے لیے ساری دُنیا میں کوئی ایک لگا بندھا طریق کار نہیں ہوسکتا۔ مختلف ممالک کے حالات مختلف ہیں، اور ہر جگہ کام کرنے والوں کو اپنے حالات کے مطابق ایک طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔ البتہ جو چیز مشترک رہے گی وہ اُصول اور مقصد ہے جس کا منبع قرآن وسنّت ہے اور وہی تحریک اسلامی کے تمام کارکنوں کو ایک وحدت میں منسلک کرتا ہے۔ جو گروہ جس ملک اور معاشرے میں اس تحریک کے لیے کام کرنے اُٹھے، اس کا یہ فرض ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنّت کی تعلیمات کا پُورا اتباع کرے، اور اقامتِ دین کو اپنا مقصود بنا کر اپنی تمام مساعی اس پر مرکوز رکھے۔ اس کے بعد اپنی تحریک کے لیے عملی پروگرام طے کرنا ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا کام ہے، اور ان میں اتنی حکمت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی قوت، ذرائع اور حالات کے لحاظ سے اقامتِ دین کے لیے مناسب ترین طریقِ کار تجویز کریں۔

۴۔ جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں، ان میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دُنیا کے تمام ممالک کے لیے اسلامی تحریک کی کوئی ایک مرکزی قیادت قائم ہو سکے۔ بلکہ اس وقت کے بین الاقوامی حالات تو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان کوئی مراسلت اور تبادلۂ خیالات ہو سکے، یا ہم وقتاً فوقتاً کوئی مشترک کانفرنس کر سکیں۔ سردست زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے تبادلے کر کے ایک دوسرے کے حالات و خیالات سے واقف ہوتے رہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو حج کے اجتماع سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔

۵۔ عالمِ اسلام کو اس وقت نہ صرف ان تینوں امور کی ضرورت ہے، بلکہ اس کے

علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو مسلم ممالک کو باہم مل کر کرنے چاہییں۔ دو سال پہلے میں نے اس کے متعلق ۱۲ نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا۔ لیکن اس طرح کی تجویزیں اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتیں جب تک مسلمان ملکوں کی حکومتیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں جو اسلام کے رشتے کی بنا پر باہم متفق و متحد ہونے کے لیے تیار ہوں۔ سردست تو وہ "رجعت پسند" اور "ترقی پسند" کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں آئے دن انقلابات برپا کرنے سے ان کو فرصت نہیں مل رہی ہے۔

۶۔ میرے نزدیک یہ طے کرنا ہر ملک کی اسلامی تحریک کے کارکنوں اور قائدین کا کام ہے کہ جس قسم کا ظلم و استبداد اُن پر مسلط ہے اس کے مقابلے میں وہ کس طرح کام کریں۔ ہر ملک میں اس کی صورتیں اور کیفیتیں اتنی مختلف ہیں کہ سب کے لیے کوئی ایک طریقِ عمل تجویز کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو چیز میں ان سب کے لیے ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کو خفیہ تحریکات اور مسلح انقلاب کی کوششوں سے قطعی باز رہنا چاہیے اور ہر طرح کے خطرات و نقصانات برداشت کر کے بھی علانیہ پُرامن اعلائے کلمۃ الحق کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں ان کو قید و بند سے دوچار ہونا پڑے یا پھانسی کے تختے پر چڑھ جانے کی نوبت آجائے۔

۷۔ مغربی ممالک میں جو لوگ اسلامی تحریک کا کام کریں ان کو چاہیے کہ پہلے عملاً اپنی زندگی کو ٹھیک اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور مغربی سوسائٹی کے اندر اپنی امتیازی شان نمایاں کریں۔ اہلِ مغرب کے ساتھ اخلاق، اعمال اور طرزِ زندگی میں ہم رنگ ہو جانے کے بعد ان کی تحریک کے مؤثر ہونے کے امکانات آدھے سے زیادہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دُوسری چیز یہ ہے کہ ان کو

اہلِ مغرب کی تہذیب اور ان کے مذہب اور ان کے فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر ایسے حکیمانہ طریقے سے تنقید اور تبلیغ کرنی چاہیے جس سے مغربی ممالک کے سنجیدہ طبقے اسلام کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ آپ کا کم سے کم ہدف یہ ہونا چاہیے کہ جس مغربی ملک میں بھی آپ ہوں وہاں کے کم از کم دو چار اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیں اور ان کو اسلامی تحریک کے لیے عملاً کام کرنے پر آمادہ کر دیں۔ اس کے بعد یہ اُن کا کام ہو گا کہ اپنے ملک میں دعوتِ اسلامی کے کام کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

۸۔ سوال نمبر ۸ کا جواب اوپر آ چکا ہے۔ میرے نزدیک کسی مغربی ملک میں کام کرنے والے داعی اسلام کو مشرقی ممالک میں کام کرنے والوں سے بھی بڑھ کر اسلامی احکام کا سخت متبع ہونا چاہیے۔

۹۔ بیتُ المَقدِس کی واپسی کا کوئی امکان میرے نزدیک اُس وقت تک نہیں ہے جب تک فلسطین کے گرد و پیش کی عرب ریاستیں اپنی اُس روش کو چھوڑ نہ دیں جس کی وجہ سے انھوں نے ۱۹۴۸ء سے اب تک پے در پے یہودیوں سے شکستیں کھائی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ بیت المقدس کسی سیاسی تصفیے کے ذریعے سے اب مسلمانوں کے قبضے میں واپس نہیں آ سکتا۔ اس کے لیے لامحالہ لڑنا ہو گا اور اتنی طاقت سے لڑنا ہو گا کہ اسرائیل کو پُوری شکست دی جا سکے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شام، عراق، مصر اور اُردن میں اِس وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں جنگ کا نتیجہ بیت المقدس کی واپسی کے بجائے رہے سہے کچھ مزید علاقے کھو دینے کی صُورت میں رُونما ہو گا۔ رہے دوسرے اسلامی ممالک، تو وہ اسرائیل کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے جب تک وہ عرب ملک اُن کا تعاون حاصل کرنے کے لیے تیار نہ ہوں جن کی سرحدیں اسرائیل سے

ملتی ہیں۔

۱۰ ۔ مَیں ایک مدّت سے یہ تمنّا رکھتا ہوں کہ سیرتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی کتاب لکھوں، مگر مجھے ابھی تک اِس کا موقع نہیں مل سکا ہے ۔ سرِدست میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر آج کل مَیں لکھ رہا ہوں اُس میں قرآن اور سیرت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اُن حالات کی تفصیل بیان کرتا جاؤں جن میں قرآن مجید کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کی تکمیل کے بعد اگر مجھے اتنی مہلت اور طاقت دی کہ میں سیرتِ پاک پر بھی کوئی مستقل کتاب لکھ سکوں تو میرے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔

۱۱ ۔ مَیں نے پچھلے ۴۰ سال میں فکرِ اسلامی کے اندر مسلسل ایک تغیّر محسوس کیا ہے، اور الحمدللہ کہ وہ بہتری کی طرف ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ واضح شکل میں اسلامی تصوّرات دُنیا کے سامنے آرہے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں مغربی مستشرقین کے شاگردوں نے بھی پہلے سے پُرفریب اور بظاہر علمی طریقے اختیار کرکے اسلام اور اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر ہر مرحلے پر اُن کی سرکوبی کی جاتی رہی ہے اور کم از کم مسلمان آبادیوں پر وہ اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ مسلمان بالعموم اب اسلام کو اتنی صاف شکل میں جان اور پہچان رہے ہیں کہ ان کو یہ مشرقی مستغربین دھوکا نہیں دے سکتے۔

۱۲ ۔ موجودہ زمانے کے لوگوں کو بات سمجھانے کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال تو ناگزیر ہے، لیکن ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اصطلاحوں سے پرہیز اولیٰ ہے، بلکہ اجتناب واجب ہے، مثلاً اشتراکیت۔ اور بعض کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ان کے اسلامی مفہوم اور مغربی مفہوم کا فرق پُوری طرح واضح کردیا جائے، مثلاً جمہوریت، یا دستوریت یا پارلیمنٹری سسٹم۔ اور بعض

کو سرے سے کوئی اسلامی مفہوم دیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً نیشنلزم۔

۱۳۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں ارشاد فرمائی ہیں ان میں سے کسی کے ظہور کی تاریخ بھی نہیں بتائی گئی ہے۔ بلکہ صرف اُن حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اِس طرح کے بیانات کی بنا پر قطعیت کے ساتھ کسی وقت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس پیشین گوئی کا ظہور ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جن حالات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کریں کہ یہ فلاں پیشین گوئی کے ظہور کا وقت ہے، ان کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط ہو۔ ویسے تو ظہورِ قیامت کی علامات بھی اب بڑی حد تک دُنیا میں پائی جاتی ہیں، لیکن قطعیّت کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کے برپا ہونے کا وقت آگیا ہے۔

۱۴۔ مُسلم اور اسلامی میں ایک لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ مُسلم حقیقت میں کہتے ہی اس کو ہیں جو اسلام کا متبع ہو۔ لیکن ایک دُوسرے لحاظ سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مسلم ہر اُس گروہ یا شخص کو کہا جا سکتا ہے جو دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہو، خواہ وہ عملاً اسلام کی پیروی نہ کر رہا ہو۔ اور اس کے برعکس اسلامی صرف وہی چیز ہے جو ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق ہو۔ مثلاً ایک مُسلم حکومت ہر اُس حکومت کو کہا جا سکتا ہے جس کے حکمران مسلمان ہوں، لیکن اسلامی حکومت صرف اُسی کو کہا جا سکتا ہے جو اپنے دستور، قوانین اور انتظامی پالیسی کے اعتبار سے پُوری طرح اسلام پر قائم ہو۔

ڈاکٹر کا نشتر یا ڈاکو کا خنجر

۱۹۶۹ء میں ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" کراچی نے اپنے قارئین کو پاکستانی سیاسی رہنماؤں کے خیالات سے واقف کرانے کے لیے انٹرویوز کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ تیسرا انٹرویو ہے جو "اخبارِ جہاں" کے نمائندے جناب مجیب الرحمٰن شامی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ سے لیا اور مذکورہ ہفت روزہ میں ۲ر اپریل ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا۔ یہ انٹرویو متعدد اخبارات و رسائل کے علاوہ کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔

"اگر میری موت کا وقت آگیا ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی، لیکن اگر میری زندگی پُوری نہیں ہوئی تو یہ لوگ خواہ اُلٹے لٹک جائیں مجھے پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے ـــــ رحم کی اپیل تو میری جوتی کی نوک بھی نہیں کرے گی۔"

سولہ برس گزرنے کے باوجود ان الفاظ کی چمک دمک میں کوئی بھی کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ الفاظ ایسے ہی چمکتے رہیں گے۔ جب کبھی دنیا کے مردانِ ہمت و عزیمت کا تذکرہ لکھا جائے گا، مولانا مودودیؒ کا ذکر بھی اس میں ضرور آئے گا، اور یہ الفاظ جو ان کی زبان سے ۱۹۵۳ء میں ادا ہوئے، ہر دور میں، ہر زمانے میں، ہر معاشرے میں لوگوں کے اندر خدا کے لیے جان قربان کرنے، راہِ حق میں سر کٹانے اور

باطل کے آگے کسی طور پر بھی نہ جھکنے کا ولولہ پیدا کرتے رہیں گے ـــــ مولانا مودودیؒ نے موت کے خوف سے عوامی مفادات سے غداری نہیں کی تھی، اس لیے ۱۹۵۳ء میں انھیں اُلٹا لٹکانے والے خود اُلٹے لٹک گئے ـــــ وہ آج بھی ہم سب میں موجود ہیں اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔

وہ ایک انقلابی مفکر، بااُصول سیاست دان، بلند پایہ عالمِ دین، اسلامی حکومت کے داعی اور بین الاسلامی اتحاد کے نقیب ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں سب سے پہلے صحت مند حزبِ اختلاف کو منظم کیا اور اسلامی دستور کے مطالبے کی مہم چلائی ـــــ لادینی قوتوں کی طرف سے علماء میں انتشار اور فرقہ بندی کا ذکر کرکے ہمیشہ اسلامی دستور کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جاتی تھی۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء میں کراچی میں علماء کنونیشن طلب کیا۔ مختلف مکاتیبِ فکر سے تعلق رکھنے والے پچاس علماء نے ۳۳ مشترکہ نکات پیش کیے اور یوں اسلامی دستور کی مخالفت کرنے والوں کا مُنہ بند ہوگیا ـــــ مولانا نے اُصولوں پر کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا، اسی جُرم کی پاداش میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

آئینی اور قانونی حدود میں رہ کر جدوجہد کرنے کی انھوں نے مثال قائم کی ہے۔ نومبر ۱۹۶۳ء میں جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع میں گولی چلی، ایک نوجوان کا خون بہا، لیکن اس کے چہرے پر خوف و ہراس کی کوئی علامت نہ تھی، لوگ ان کی جانب بڑھے، انھیں بٹھانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے کہا:

"مَیں ہی بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا۔"

جلسہ ہوتا رہا، مولانا تقریر کرتے رہے، وہ کھڑے رہے ـــــ آمریت کے سامنے استبدادیت کے سامنے جب سب بیٹھے ہوئے تھے تب بھی وہ جمہوریت کا عَلم تھامے کھڑے تھے ـــــ حتیٰ کہ پُوری قوم کھڑی ہوگئی ـــــ مولانا بھی کھڑے

رہے، اپنے اُصولوں پر قائم رہے۔ اُنھوں نے سچ ہی کہا تھا: "میں ہی بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا"۔ لیکن ایک دن جب گھڑی کی سوئیاں چار پر پہنچیں تو یہی کھڑا ہوا شخص میرے سامنے بیٹھا تھا اور میں اس کے حضور کھڑا — میں بھی بیٹھ گیا — سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا نے کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان سے جو کچھ ارشاد فرمایا اسے ان صفحات پر ملاحظہ کیجیے کہ یہ ایک اُجلے ذہن کی اُجلی اُجلی باتیں ہیں۔

اوّلین مسئلہ

پاکستان کے مسلمانوں کے ایمان کو مضبوط بنانا اور اخلاق کو دُرست کرنا ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہے، ان کی مضبوطی اور درستی کے بغیر کوئی اصلاحی اسکیم بھی کامیاب نہیں ہوسکتی، خواہ وہ کاغذ پر کتنی ہی شان دار کیوں نہ نظر آئے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک ملک بنانے والی طاقت اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔ دونوں حصّوں میں اسلام کے خلاف تحریکیں جتنا زور پکڑیں گی اتنے ہی یہ ایک دُوسرے سے علیحدہ ہوتے چلے جائیں گے۔ صرف اسلامی رشتہ ہی ان کو جوڑ کر رکھ سکتا ہے۔

معاشی مسائل

آج کل صرف معاشی مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انتہاپسندی کی ایک تحریک چل رہی ہے۔ یہ طرزِ فکر انسان کو بحیثیت مجموعی سمجھنے کی کوشش نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے مسائل میں سے ایک مسئلہ معاشی بھی ہے، جس کا بہت گہرا تعلق دُوسرے مسائل کے ساتھ ہے۔ اسلام کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو بحیثیت مجموعی سامنے رکھتا ہے، اس کی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں

متوازن نظام پیش کرتا ہے۔ اگر محض معاشرتی مسائل کو لے کر باقی مسائل کو ان کے گرد گھمایا جائے تو بحیثیت مجموعی توازن خراب ہو جائے گا۔ یہ چیز لوگوں کے ذہن نشین ہونی چاہیے۔

سوشلزم، سرمایہ داری اور اسلام

سرمایہ داری کا اصل دشمن اسلام ہے، کوئی دوسرا نظام اس کا اصل دشمن نہیں ہے۔ اِسلام ہی نے وہ تدابیر بتائی ہیں جن سے اس کی جڑ کٹتی ہے ــــ سوشلزم اگر اس کے مسائل کو حل کرتا ہے تو اس طرح کہ بہت سے سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں لاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تمام ذرائع زندگی دے کر عام انسانوں کو اس سے زیادہ بے بس کر دیتا ہے جتنا کہ نظامِ سرمایہ داری کرتا ہے۔ سوشلزم کا مزا جن قوموں نے چکھ لیا ہے وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ جن قوموں نے اس کا مزا نہیں چکھا وہ حلوہ سمجھ کر اسے کھانے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہماری قوم جس کے پاس اپنا ایک بہترین نظام موجود ہے صرف اس کو عمل میں لانے کی کسر باقی ہے۔ سوشلزم کے خوش نما پھندے میں اپنی گردن دینے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچ لے کہ پھر وہ اس پھندے سے نجات پا بھی سکے گی یا نہیں ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اسے اس پھندے میں اپنی گردن دینے کی ضرورت کیا ہے؟ جب کہ اسے اسلام نے ایسا نظام دیا ہے جس سے فرد کی آزادی پُوری طرح محفوظ بھی رہتی ہے اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ظلم سے نجات بھی مِل سکتی ہے۔

آمریت اور سرمایہ داری

ہماری نظر میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کی اصل پُشت پناہ آمریت ہے جو

بیوروکریسی اور سیٹھوکریسی کے گٹھ جوڑ سے اس ملک پر مسلط ہوئی ۔ جب تک صحیح جمہوری نظام قائم نہ ہو، اس ظلم سے ملک کو نجات نہیں دلائی جا سکتی ۔ کوئی بہتر سے بہتر معاشی نظام بھی کاغذ پر پیش کرنے سے صُورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس پر عمل کرنے کے لیے عادلانہ سیاسی نظام موجود نہ ہو ۔ اِسی لیے پہلے ہم ایسے نظام کو وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہیں ۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہمارا اوّلین کام اپنا منشور پیش کرنا ہوگا جس میں ہم بتائیں گے کہ اس ملک کی زندگی کے ہر پہلو میں ہم کیا اصلاحات چاہتے ہیں ۔ انہی میں سے ایک پہلو معاشی بھی ہے ۔ صرف معاشی اصلاحات کبھی کام یاب نہیں ہو سکتیں جب تک اخلاقی، تعلیمی، معاشرتی اور قانونی اصلاحات بھی نافذ نہ کی جائیں ۔ ان سارے پہلوؤں کی اصلاح کے بعد ہی معاشی زندگی میں اصلاح ممکن ہوگی ۔

میں ان لوگوں میں شامل ہونے کو تیار نہیں جو محض نعروں کا فریب دے کر لوگوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں ۔ ہماری قوم مدّت سے نعروں کا فریب کھاتی چلی آ رہی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی اگر اُس کی آنکھیں نہ کُھلیں تو کچھ دن اور فریب کھا کر ان شاء اللہ کُھل جائیں گی ۔

دولت کا سمٹاؤ

پاکستان میں بیس گھرانوں کے اندر دولت کا سمٹاؤ حرام خوری کے بغیر ممکن نہیں تھا ۔ یہ دولت ان ذرائع سے سمٹی ہے جو اسلام کی رُو سے ناجائز ہیں ۔ غریبوں کے غم خواروں کے پاس بھی دولت کا سمٹاؤ حرام خوری کا ہی نتیجہ ہے ۔ اسلامی حکومت پہلا کام یہ کرے گی کہ ان تمام ذرائع کو حرام کر دے جن سے دولت کا ارتکاز ہوتا ہو ۔ اسلام کے پاس سمٹی ہوئی دولت کو پھیلانے کے ذرائع موجود ہیں ۔ ہم ایک ایک شخص کے بارے میں تحقیق کریں گے ۔ حضرت عمرؓ کے دَور میں بھی ان لوگوں سے باقاعدہ

پُوچھ گچھ کی جاتی تھی جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت جمع ہو جاتی تھی ۔ آج بھی اسلامی حکومت اسی مثال کی پیروی کرے گی ۔ ہر وہ دولت اور جائداد جس کی آمد کا جائز ذریعہ ثابت نہ ہو سکے اس کے ناجائز مالکوں سے واپس لی جائے گی ۔ لیکن جو کچھ ہوگا قانون اور ضابطے کے مطابق ہوگا ۔

"اِسلام کا نشتر ڈاکٹر کا نشتر ہے ڈاکو کا خنجر نہیں ۔ اب جو لوگ ڈاکٹر کے نشتر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں انھیں ڈاکو کے خنجر کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔"

اِسلام مقدار کے لحاظ سے نہیں ذرائع کے لحاظ سے دولت کی حد مقرر کرتا ہے ۔ حلال ذرائع سے جتنا چاہے کمائیے مگر حرام ذرائع سے ایک پیسہ بھی کمانے کی اجازت نہیں دی جائے گی ۔

موجودہ جاگیرداریاں

اِمپیریل گزیٹر آف انڈیا میں تمام جاگیرداروں اور ان کی خدمات کی تفصیل موجود ہے ۔ اِسلام کا دستور یہ ہے کہ کسی شخص کو زمین کا عطیہ دیے جانے کا حق صرف عادل حکومت کو حاصل ہے اور وہ بھی معاشرے کی جائز خدمات کے صلے میں ۔ اسلامی حکومت کوئی عطیہ ایک سے چھین کر دُوسرے کو دینے کی مجاز نہیں ۔ وہ اپنی ملک عطیۃً دے سکتی ہے ۔ اس کے علاوہ حدِ اعتدال سے زائد عطیہ دینے کا حق بھی اسے حاصل نہیں ۔ ان اُصولوں کے مطابق ان تمام جاگیرداریوں کے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے جو اس وقت موجود ہیں ۔ اسلامی حکومت سابق بے انصافیوں کو قابو میں لانے کے لیے عارضی طور پر ملکیتِ زمین کی کوئی حد مقرر کر سکتی ہے ۔

قومیانے کا مسئلہ

کسی صنعت کو قومی ملکیت قرار دینا نہ حرام ہے اور نہ ہی فرض۔ اگر کوئی خاص صنعت ایسی ہے جس کے متعلق تحقیق اور غور و بحث کر کے یہ سمجھا جائے کہ اسے نجی طریقے سے چلانے سے خرابی پیدا ہوتی ہے تو اسے قومیایا جا سکتا ہے۔ جہاں ضروری ہو وہاں یہ اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کا فیصلہ کرنا کہ کون سی صنعت کو قومیایا جائے اور کون سی کو نہیں، کسی جماعت کا نہیں بلکہ عوامی نمائندوں پر مشتمل پارلیمان کا کام ہے۔ قومیانے کے ساتھ بیوروکریسی کا مسئلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جسے مدِنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس وقت بیوروکریسی کا جو کردار ہے وہ ظاہر ہے۔ ساری قوم اس کے خلاف چیخ اُٹھی ہے۔ اگر صنعتی زندگی کا نظم و نسق بھی بیوروکریسی کے ہاتھ میں چلا جائے تو نتائج کا اندازہ کر لیجیے۔ اس وقت واپڈا قومی ملکیت میں ہے، اس کا حشر دیکھ لیجیے۔

سوشلزم اور ارتکازِ زر

یہ کہنا صحیح نہیں کہ سوشلزم اور اسلام دونوں میں دولت کا ارتکاز نہیں ہوتا۔ سوشلزم میں تو ایسا ہوتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ صرف اور صرف اسلام میں ہی ارتکازِ زر نہیں ہوتا۔ سوشلزم ریاست کے ہاتھ میں سب کچھ دے دیتا ہے کسی ایسی جگہ جہاں صنعت، تجارت اور حکومت یک جا ہو جائے وہاں ظلم کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔

چین اور رُوس کو چیلنج

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ مختلف وفود اشتراکی ممالک کے دورے کو جاتے ہیں یہ "کنڈکٹڈ ٹورز" ہوتے ہیں جو ان ممالک کے ذمہ دار دکھانا چاہتے ہیں دکھاتے ہیں،

جو سنانا چاہتے ہیں سناتے ہیں، جو بتانا چاہتے ہیں بتاتے ہیں، اور ہمارے ہاں کے "سادہ لوح" اس پر یقین کر کے واپس آ کر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ رُوس اور چین میں تو شہد اور دُودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ مَیں دُنیا کے تمام اشتراکی ممالک کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے اپنے ممالک کا دَورہ کرنے کی اجازت دیں، جو مَیں دیکھنا چاہوں مجھے دکھائیں، جو مَیں پوچھنا چاہوں مجھے بتائیں، جہاں میں جانا چاہوں مجھے جانے دیں۔ اگر مَیں نے ان کے قول و فعل کو یکساں پایا، اگر میں نے وہاں حریتِ فکر کے مظاہر دیکھے، اگر میں نے وہاں آزادی اور جمہوریت کا دَور دَورہ دیکھا، اگر مَیں نے وہاں مزدوروں اور محنت کشوں کو خوش حال اور مطمئن دیکھا، اگر مسلمانوں کا الگ مذہبی تشخص وہاں موجود ہوا اور اگر وہاں سے طبقاتی تقسیم بالکل مٹ چکی ہوئی تو مَیں وہیں اشتراکیت کا کلمہ پڑھ لوں گا اور واپس آ کر سوشلزم کی تبلیغ کروں گا۔

سوشلسٹ حضرات دُوسرے ممالک میں کچھ اور کہتے ہیں اور اپنے ہاں کچھ اور کرتے ہیں۔ دوسری جگہ تو وہ آزادیٔ تحریر و تقریر کا پرچار کرتے ہیں، اپنے ہاں لوگوں کی زبانیں بند کر دیتے ہیں، مخالفت میں کوئی آواز اُٹھنے نہیں دیتے۔ دوسرے ممالک میں مزدوروں کے حقوق کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، ان کے لیے ہڑتال کا حق بحال کرانا چاہتے ہیں۔ مگر دنیا کے کسی سوشلسٹ ملک میں مزدوروں کو ہڑتال کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا یہ ایک کھُلا ہوا تضاد اور دھوکا نہیں ہے؟

سوشلزم اور کمیونزم

کمیونزم وہ انتہائی مقصود ہے جو سوشلزم کے ذریعے حاصل کیا جانا بیان کیا جاتا ہے، لیکن یہ کہیں حاصل نہیں ہوا۔ غیر طبقاتی معاشرہ (Class Less Society) کہیں بھی وجود میں نہیں آ سکی۔ اس منزل تک کوئی بھی سوشلسٹ ملک نہیں پہنچا۔ اس طرح سوشلزم خود اپنے ہی طے کردہ نصب العین کے حصُول میں بھی ناکام ہو گیا ہے۔

سوشلزم اور معاشرتی انصاف

ہمارے ہاں اکثر افراد اپنے دین سے جاہل اور استعمار کی تہذیبی و فکری تاخت سے بُری طرح مغلوب ہیں۔ اس لیے ہر وہ نعرہ جو دنیا کے غالب کیمپوں سے بلند ہوتا ہے، اس کی صدائے بازگشت فوراً ہی یہاں سے بلند ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں انقلابِ فرانس کے اُٹھائے ہوئے افکار کا زور تھا، مسلمان ملکوں میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ انہی افکار کا موقع بے موقع اظہار کرے اور انہی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ یہ دَور جب گزر گیا تو ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی سمتِ قبلہ بھی تبدیل ہونے لگی اور نیا دَور آتے ہی معاشرتی انصاف اور اشتراکیت کے نعرے بلند کرنے والے ہمارے درمیان پیدا ہونے لگے۔ یہاں تک بھی بات قابلِ صبر تھی لیکن غضب یہ ہے کہ:

> ایک گروہ ہمارے اندر ایسا بھی اُٹھ رہا ہے جو اپنے قبلے کی ہر تبدیلی کے ساتھ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اپنا قبلہ تبدیل کرے۔ گویا اسلام کے بغیر یہ بے چارے جی نہیں سکتے۔ اس کا ان کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ جس کی پیروی کرکے یہ ترقی کرنا چاہتے ہیں "اسی کی" پیروی سے اسلام بھی مشرف ہو جائے اور دین رجعی ہونے کے الزام سے بچ جائے۔

اسی بنا پر پہلے کوشش کی جاتی تھی کہ حریتِ فرد اور فراخدلی اور سرمایہ داری اور بے دین جمہوریت کے مغربی تصورات کو عین اسلامی ثابت کیا جائے اور اسی بنا پر اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں بھی اشتراکی تصور کی عدالت اجتماعیہ یا معاشرتی انصاف موجود ہے۔ جو لوگ "اسلام میں عدالتِ اجتماعیہ موجود ہے" نعرہ لگاتے ہیں

وہ بالکل ایک غلط بات کہتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ "اسلام ہی میں عدالتِ اجتماعیہ ہے۔"

اسلام وہ دینِ حق ہے جو خالقِ کائنات اور ربِّ کائنات نے انسان کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے اور انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ طے کرنا کہ ان کے لیے کیا چیز عدل ہے اور کیا عدل نہیں ہے انسانوں کے خالق و ربِّ کائنات ہی کا کام ہے۔ اور دوسرا کوئی نہ اس کا مجاز ہے کہ عدل و انصاف کو ظلم کا معیار تجویز کرے اور نہ کسی میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ حقیقی عدل قائم کر سکے۔

آخر اس چیز کو کون صاحبِ عقل اجتماعی عدل سے تعبیر کر سکتا ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص بیٹھ کر اپنا ایک اجتماعی فلسفہ تصنیف کریں، پھر حکومت کے غیر محدود اختیارات سے کام لے کر اس فلسفے کو ایک پورے ملک کے رہنے والے کروڑوں افراد پر زبردستی مسلّط کر دیں۔ لوگوں کے اموال ضبط کریں، زمینوں پر قبضہ کریں، پورے ملک کو ایک ایسے جیل خانے میں تبدیل کر دیں جس میں تنقید، فریاد، شکایت، استغاثے اور عدالتی انصاف کا ہر دروازہ لوگوں کے لیے مسدود ہو، ملک کے اندر کوئی جماعت نہ ہو، کوئی تنظیم نہ ہو، کوئی پلیٹ فارم نہ ہو جس پر لوگ زبان کھول سکیں، کوئی پریس نہ ہو جس میں لوگ اظہارِ خیال کر سکیں اور کوئی عدالت نہ ہو جس کا دروازہ انصاف کے لیے کھٹکھٹا سکیں۔ جاسوسی نظام اتنے بڑے پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ ہر آدمی دوسرے سے ڈرنے لگے کہ کہیں یہ جاسوس نہ ہو۔ حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی ایک آدمی زبان کھولتے ہوئے چاروں طرف دیکھ لے کہ کوئی کان اس کی بات سننے اور کوئی زبان اسے حکومت تک پہنچانے کے لیے کہیں پاس ہی موجود نہ ہو۔ پھر جمہوریت کا فریب دینے کے لیے انتخابات کرائے جائیں، مگر پوری کوشش کی جائے کہ اس فلسفے کو تصنیف کرنے والوں سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص ان انتخابات میں حصہ نہ لے سکے اور نہ کوئی ایسا شخص ان میں دخیل ہو سکے جو

خود اپنی کوئی رائے بھی رکھتا ہو اور اپنا ضمیر فروخت کرنے والا بھی نہ ہو۔ سوشلزم جہاں بھی گیا ہے اس نے یہی حالات پیدا کیے ہیں اور یہی فضا طاری کی ہے۔ کیا اس کو معاشرتی انصاف کہتے ہیں؟ کیا اسی کا نام عدل اجتماعی ہے؟

اسلام اور جمہوریت

اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں۔ جمہوریت اس طرزِ حکومت کا نام ہے، جو لوگوں کی مرضی سے بنتی ہے، لوگوں کی مرضی سے بدلتی ہے اور لوگوں کی رائے کے مطابق چلتی ہے۔ یہی اسلامی طرزِ حکومت بھی ہے۔ مغربی جمہوریت سے ہماری جمہوری اقدار مختلف ہیں۔ کیوں کہ مغربی جمہوریت بے قید ہوتی ہے، عوام کی رائے حلال کو حرام کر سکتی ہے، جیساکہ برطانیہ میں ہو رہا ہے یا ہوا ہے ـــــ اسلامی جمہوریت قرآن اور سنّت کے احکام سے محدود ہوتی ہے۔ پوری قوم بھی چاہے تو ان حدود سے باہر جاکر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ـــــ اس کے برعکس سوشلزم پورے فلسفۂ زندگی کا نام ہے۔ اس کا اپنا عقیدہ، اپنا فلسفہ اور اپنا اخلاق ہے، اسے اسلام کے ساتھ کسی صورت بھی ملایا نہیں جاسکتا۔

خارجہ پالیسی

پاکستان نظریاتی ریاست ہے اور اس کی ملکی اور بین الاقوامی پالیسی لازماً اس کے اختیار کردہ نظریۂ حیات پر قائم اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہونی چاہیے۔ ہمارے نظریۂ حیات کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ہم دنیا میں حق اور انصاف کے علم بردار ہوں، ظلم اور زیادتی کے مخالف ہوں، راست بازی سے خود کام لیں اور دوسروں کو اس پر آمادہ کریں۔ عہد و پیمان کے خود پابند رہیں اور دوسروں کو پاسِ عہد کی تلقین کریں۔

ہم سامراجیت اور استعماری نظام کو بین الاقوامی انصاف کے خلاف اور ان بنیادی

اسباب میں سے ایک اہم سبب سمجھتے ہیں، جن کی وجہ سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے۔ یہ سامراج خواہ مشرقی ہو یا مغربی، بہرحال قابلِ مذمت ہے۔ ہم اس کے خاتمے کے لیے اپنی انتہائی کوشش کریں گے اور ہماری تائید و حمایت ہمیشہ ان مظلوم قوموں کے ساتھ ہو گی جو ان بلاؤں کا شکار ہوں۔

ہمارے خیال میں ہمیں کسی بلاک سے وابستہ نہ ہونا چاہیے نہ کسی بلاک سے اپنے تعلقات خراب کرنے چاہییں۔ ہمیں پاکستان کے مفاد کو ملحوظ رکھ کر تمام طاقتوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے چاہییں۔ لیکن دوستی کے معنی کسی ملک کی گود میں جا بیٹھنا نہیں ہے۔ ان کی تہذیب اور نظریات کی درآمد کی اجازت کسی طور نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں آزاد، خودمختار اور خود اپنا نظریہ رکھنے والی قوم کی حیثیت سے اپنے تعلقات دوسری قوموں سے قائم کرنے چاہییں۔ ہم دُوسروں سے مدد لیتے ہیں، دُوسرے بھی ہماری مدد کے محتاج ہیں۔ ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ ہم ہاتھ پھیلانے والے نہیں ہیں۔

اِسلامی نظام کا قیام

جمہُوریت بحال ہوتے ہی اسلامی نظام کی منزل قریب سمجھیے۔ ہماری قوم مسلمان ہے، لامحالہ وہ اسلامی نظام ہی چاہے گی۔ دُوسرا نظام لانے والے خواہ اُلٹے لٹک جائیں خواہ جتنا سر چاہیں پٹخ لیں —— یہاں اِن شاء اللہ اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔

طلبہ کا اضطراب

نوجوانوں میں اضطراب پیدا کرنے کا اصل سبب ہمارا نظامِ تعلیم ہے، اسے بدلے بغیر چارہ نہیں۔ یہ بحران اسی بات کا آئینہ دار ہے۔ پُورے نظامِ تعلیم کو اسلامی اصولوں

کی روشنی میں از سرِ نو ترتیب دینا ناگزیر ہے۔ ہمیں ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو ایک نئی آزاد مسلم مملکت کے لیے موزوں کارکن، کارفرما اور شہری تیار کرے اور ایک ترقی پذیر ملک کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات پوری کر سکے۔

تصیح

ناظمِ نشر و اشاعت جناب صفدر علی چوہدری نے "اخبارِ جہاں" اور ہفت روزہ "ایشیا" میں شائع ہونے والے اِس انٹرویو کے بعض مندرجات کی تصیح کے لیے ایک خط مدیر ایشیا کو لکھا جو اس میں ۴ را پریل ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا۔ یہ خط حسبِ ذیل ہے:

مکرمی جناب! ایشیا، مورخہ ۲۸ رمارچ ۱۹۶۹ء میں مولانا محترم کا وہ انٹرویو پڑھا جو آپ نے اخبارِ جہاں سے نقل فرمایا ہے۔ اخبارِ جہاں کے نمائندے نے دو تین واقعاتی غلطیاں کی ہیں جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اوّلاً ۱۹۴۹ء میں مولانا محترم نے علماء کا کراچی میں کوئی کنونشن طلب نہیں کیا تھا۔ کراچی میں ۱۹۵۱ء میں ممتاز علماء کرام کا ایک تاریخی اجلاس ہوا تھا جس میں مولانا مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس کے نتیجے میں اسلامی دستور کے ۲۲ (۳۳ نہیں) اصولی نکات منظور ہوئے۔

علاوہ ازیں روس اور چین کو چیلنج کرنے کے متعلق انٹرویو کا حصّہ بھی اخبارِ جہاں میں دُرست رپورٹ نہیں ہوا ہے۔ اخبارِ جہاں کے انٹرویو نگار نے لکھا ہے کہ مولانا نے فرمایا:

"مَیں اشتراکی ممالک کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے ممالک کا دَورہ کرنے کی اجازت دیں، جو مَیں دیکھنا چاہوں مجھے دکھائیں، جو مَیں

پوچھنا چاہوں مجھے بتائیں، جہاں میں جانا چاہوں مجھے جانے دیں۔ اگر میں نے ان کے قول و فعل کو یکساں پایا، اگر میں نے وہاں حریتِ فکر کے مظاہر دیکھے، اگر میں نے وہاں آزادی اور جمہوریت کا دَور دَورہ دیکھا، اگر میں نے مزدوروں اور محنت کشوں کو خُوش حال اور مطمئن دیکھا، اگر مسلمانوں کا الگ مذہبی تشخص وہاں موجود ہوا اور اگر وہاں سے طبقاتی تقسیم بالکل مٹ چکی ہوئی تو میں وہیں اشتراکیت کا کلمہ پڑھ لوں گا اور واپس آکر سوشلزم کی تبلیغ کروں گا۔"

میں اس انٹرویو کے وقت خود موجود تھا، مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ حسبِ ذیل ہے:

"مولانا نے اشتراکی حکومتوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اور باہر کی دنیا کے درمیان آہنی پردے ہٹادیں اور ایسا ممکن ہو کہ جو کوئی بھی چاہے وہ بلا روک ٹوک ان ممالک کا دَورہ کر سکے۔ جو کچھ وہ دیکھنا چاہے وہ دیکھ سکے، جو کچھ جاننا چاہے جان سکے، جو کچھ پوچھنا چاہے پوچھ سکے، اور جب دُنیا کے غیر اشتراکی ممالک کے افراد ان کے قول و فعل کو یکساں پائیں گے، حریتِ فکر کے مظاہر دیکھیں گے، مزدوروں اور محنت کشوں کو مطمئن و خوش حال پائیں گے تو یقیناً اشتراکیت کے قائل ہوکر اس کے مبلّغ بن جائیں گے۔"

مُسلمان اُمّتِ وسط ہیں

جناب شورش کاشمیری نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب سے ۳۱ سوالات پر مشتمل ایک مبسُوط انٹرویو لیا۔ مولانا کے بلند پایہ خیالات اور شورش کے معجز نما قلم نے اس انٹرویو کو ایک علمی وادبی شاہ کار بنا دیا ہے۔ یہ انٹرویو پہلے پہل ہفت روزہ "چٹان" لاہور مورخہ ۱۴؍اپریل ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ جناب کوکب صدیقی مدیر "CRITERION" کراچی نے کیا جو "Guide Lines in the conflict of ideologies" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اِنٹرویو سے پہلے جناب شورش نے لکھا:

"علّامہ اقبال نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا تھا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر نہیں کہ ہم یورپ کی تقلید میں کہاں تک آگے بڑھ سکتے ہیں، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ ہم کہاں تک اس کے فکری غلبے سے نجات پا سکتے ہیں ـــــ مزید فرمایا کہ مشرق میں مسلمانوں کی ذہنی قیادت اس شخص کے ہاتھ میں ہوگی جو یورپ میں علمی قیادت کو چیلنج کر سکتا ہو اور جرأت سے یہ کہہ سکے کہ انسانی مصائب کی بوقلمونیوں کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے اسلام ـــــ مولانا مودودیؒ بلاشبہ اسلام کے ایک

عظیم اسکالر ہیں۔ انھوں نے یورپی نظریات کے سحر پر بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ بحث کی اور ان خیالات کے طلسم کو توڑا ہے جو نئی پود کے ذہن کو مسخر کر چکے ہیں۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یورپ کے عالمانہ زعم کا تار و پود بکھیرا اور نئی پود کو فکر و نظر کی گمراہیوں سے اُٹھا کر صراطِ مستقیم کی دعوت دی ہے۔"

س ۱۱: ملک میں آمریت کے خلاف عوامی تحریک کی جو شکلیں پچھلے دنوں پیدا ہوئیں ان سے آپ کُلاً یا جزءاً متفق ہیں؟ آپ کے نزدیک ان کا کون سا حصہ اصلح اور کون سا غیر اصلح ہے؟

ج: ملک میں آمریت کے خلاف تحریکِ جمہوریت کے تحت جو عوامی جد و جہد شروع کی گئی تھی وہ بالکل صحیح طریقوں سے جاری تھی۔ اگست ۱۹۶۸ء کے آخر میں جب مَیں علاج کے لیے ملک سے باہر گیا اُس وقت مجھے پُورا اطمینان تھا کہ تحریک بالکل آئینی، جمہوری اور شائستہ طریقوں سے چل رہی ہے۔ بعد میں میرے پیچھے جو حالات پیش آئے اُن کے متعلق مَیں نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک ٹھیک کس وقت اس میں غلط رنگ داخل ہونا شروع ہوا۔ دسمبر ۶۸ء کے آخر میں انگلستان سے واپس آکر مَیں نے دیکھا کہ تحریکِ جمہوریت اور اس کے ساتھ شامل ہونے والی جماعتیں جن کو ملا کر جمہوری مجلسِ عمل بنائی گئی تھی، تحریک کو پُرامن آئینی طریقوں سے جاری رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن کچھ دوسرے لوگ اس کو زبردستی تشدّد کے راستے پر دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی دُوسرا حصہ غیر اصلح تھا۔ اس کو میں غیر اصلح اس وجہ سے کہتا ہوں کہ جو لوگ اس تحریک کو تشدد کی راہ پر دھکیلنا چاہتے تھے ان میں سے ایک گروہ کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے لیے تحریک کو کُچل دینے کا بہانہ فراہم ہو اور دُوسرے

لوگوں کا مقصد وہ تھا جسے میں آپ کے دُوسرے سوال کے جواب میں بیان کروں گا۔

س ۲۱: کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ تحریک سے فائدہ اُٹھا کر کمیونسٹوں کی واضح اقلیت نے عوام الناس بالخصوص نئی پود کے دل و دماغ میں اپنی مخصوص اصطلاحات اور مخصوص نعرے ثبت کرنے کے علاوہ اس ڈھنگ کے ہنگامے برپا کرنے کی کوشش کی جو کمیونسٹوں کا ہمیشہ غیر کمیونسٹ ملکوں میں شعار رہا ہے؟

ج: آپ کے پہلے سوال کے جواب میں میں نے جس دُوسرے گروہ کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے کہ اس کے اندر کمیونسٹ اور فاشسٹ دونوں قسم کے رجحانات رکھنے والے لوگ شامل تھے اور ان کا مُدّعا یہ تھا کہ پُرامن تحریک کو ایک خونی انقلاب کے راستے پر دھکیل دیا جائے۔ پُرامن تحریک دراصل جمہوریت بحال کرنے کے لیے چل رہی تھی، اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ تحریک اسی طریقے پر کام کرتی رہی تو آخر کار جمہوریت قائم ہو جائے گی جو ان کے مقصد کے خلاف ہے۔

خونی انقلاب کے ذریعے کبھی جمہوریت قائم نہیں ہوا کرتی۔ اس کے نتیجے میں یا تو فاشزم قائم ہوتا ہے یا کمیونزم یا پھر ملک انارکی کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتا ہے۔

س ۲۲: کمیونسٹوں کا شعار ہے کہ جہاں جہاں اقلیت میں ہوں وہاں دائیں بازو کی مختلف جماعتوں میں گھس کر اپنی طاقت کے اظہار و اندازہ کے لیے نہ صرف عوامی خلفشار اور سیاسی انتشار کی پالیسی اختیار کرتے بلکہ اس قوم کے معتقدات میں سے کسی ایک جز کو چھیڑ کر اپنی طاقت کا اندازہ کرتے اور اپنے نظریے کی بالادستی کو بہ لطائف الحیل قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید کی بے حرمتی کے واقعے پر اُنھوں نے مسلمانوں کے احتجاج کو اوّلاً ختم کرنا اور ثانیاً ہلکا کرنا چاہا۔ اس قسم کے واقعات میں ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ:

۱۔ قومی اور مذہبی عصبیت کا اندازہ کریں۔

ب : اندازہ لگائیں کہ اس قوم کی دین کے بارے میں گرفت کیا ہے؟

ج : ان کے بالمقابل جماعتوں کی طاقت (مدافعتی و مزاحمتی) کس قدر ہے؟

د : عوام میں اس کا ردِ عمل کیا ہے؟

ہ : کن کن حربوں سے اس ردِ عمل کا تدارک کیا جاسکتا ہے؟

ج : آپ نے اپنے سوال میں دائیں بازو کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ دائیں اور بائیں کی اصطلاحات مغرب سے آئی ہیں اور ہم اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ اسلام کے حامیوں کا تعلق بائیں بازو کے مقابلے میں دائیں بازو سے ہے۔ دائیں بازو کا لفظ اصطلاحاً سرمایہ داری اور جاگیرداری کے حامیوں، مفاد یافتہ طبقوں اور سابق نظام کو بحال رکھنے کے خواہش مندوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مسلمان جو اس ملک میں اسلام کے نظریے کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے طالب ہیں، اُمّتِ وَسَط ہیں۔ جن کی نگاہ میں دایاں بازو بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا بایاں بازو۔ اسلام کی صراطِ مستقیم اعتدال اور حق پرستی کی راہ ہے۔ جو نہ دائیں جانب جھکاؤ رکھتی ہے نہ بائیں جانب۔ مسلمان کا مقام دنیا میں ایک جج (عادل و منصف) کا مقام ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ تحریکِ جمہوریت میں ایسے لوگ بھی شامل ہوگئے تھے جو واقعی دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اکثریت ان کی نہ تھی۔ اکثریت ان عام مسلمانوں کی تھی۔ جو یہاں اسلام کو نافذ دیکھنا چاہتے ہیں اور جنھوں نے اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈال کر اس ملک کو نظریۂ اسلام کے لیے حاصل کیا تھا۔

اشتراکی اور فاشسٹ عناصر نے یہ محسوس کیا کہ اگر تحریکِ جمہوریت کے ذریعے یہاں ایک جمہوری نظام قائم ہوگیا تو وہ لامحالہ دیر یا سویر اسلامی نظام کی شکل اختیار کرے گا۔ اس لیے انھوں نے پہلے مرحلے میں تحریک کو تشدد کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی اور دوسرے مرحلے میں جب انھوں نے یہ دیکھا کہ حکومت

تحریک جمہوریت کے رہنماؤں سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے اور عنقریب یہاں جمہوریت بحال ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں تو انھوں نے کھُلم کھُلا اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے کام شروع کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں ان کی پیدا کردہ صورتِ حال سارے ملک کے سامنے آگئی ہے، جہاں انھوں نے سارے صوبے میں انتہائی درندگی کے ساتھ مار دھاڑ، قتل و غارت اور لاقانونیت پھیلا دی تھی۔ یہ وہ آئیڈیل صورتِ حالات ہے جو کسی ملک میں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں ہوتی ہے۔

مغربی پاکستان میں چوں کہ ان کو اندیشہ تھا کہ اسلام کی حامی طاقتوں کی گرفت بہت مضبوط ہے اس لیے انھوں نے یہاں براہِ راست اسلام اور سوشلزم کے تصادم سے اپنے کام کی ابتدا کی۔ اور آپ کا یہ اندازہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کی بے حرمتی کے ارتکاب سے وہ یہ اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ یہاں میدان ان کے لیے کس حد تک سازگار ہے اور مدافعت و مزاحمت کی طاقت کتنی ہے۔ ان کے اس فعل کی مثال بالکل وہی ہے جیسے رات کے وقت چور کسی کے گھر میں پتھر پھینک کر یہ اندازہ کرتے ہیں کہ گھر والے جاگ رہے ہیں یا بے خبر سو رہے ہیں۔ اس حرکت کا پہلا ردِ عمل دیکھ کر انھوں نے جو مختلف حربے عوام کے ذہن میں اُلجھاؤ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے وہ سب کے سامنے ہیں۔ ملتان میں انھوں نے فوراً ایک جھوٹا واقعہ قرآن مجید کی بے حرمتی کا گھڑا، لیکن بہت جلدی اس فریب کا بھانڈا پھُوٹ گیا۔ پھر بھاشانی صاحب پر حملے کا افسانہ تصنیف کیا گیا تاکہ اپنے تشدد کے لیے دُوسروں پر تشدد کا الزام عائد کر کے وجہ جواز پیدا کی جائے لیکن اس کا بھانڈا بھی اب پھوٹ چکا ہے۔ کیوں کہ جن جماعتوں پر انھوں نے اس حملے کا الزام لگایا تھا ان کا کوئی فرد بھی اس واقعے میں ملوّث نہ پایا گیا۔ اُن کے اِن حربوں میں جو چیز سب سے

زیادہ مددگار ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ پہلے دس سال کی آمریت کی عنایت سے پریس اور خبر رساں ایجنسیوں اور ریڈیو پر ایک بڑی حد تک سُرخ عناصر کا قبضہ ہو چکا ہے جس کی بدولت وہ ہر جھوٹ پھیلانے اور ہر سچ کو چھپانے پر قادر ہے۔

س ۴۲: ظاہر ہے کہ دو گروہ یہاں تشدّد پر یقین رکھتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سوشلزم کو اس کی معنویت کے ساتھ لانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ:

۱۔ یہ دونوں واقعی ہم آہنگ ہیں یا دونوں میں مقاصد و عزائم کے اعتبار سے فاصلہ ہے؟

۲۔ کیا ان میں سے ایک پارٹی واقعی سوشلزم چاہتی ہے یا ان کے سامنے فردِ واحد کا اقتدار ہے؟ اور کیا یہ صحیح ہے کہ "اسلام ہمارا دین ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے" کے دل فریب نعرے سے وہ نئی پود کے ذہنی ویرانے کو فکری سراب کے حوالے کر رہی ہے؟

۳۔ کیا یہ سہ قسمی نعرہ اسلامی تعلیمات کی وحدت کے منافی نہیں؟

۴۔ آپ کے خیال میں یہ پارٹی واقعی اس سوشلزم کی داعی ہے جس کا بانی کارل مارکس اور عملی رہنما لینن، اسٹالن یا ماؤ ہیں؟ یا اس کے سہ رنگے سوشلزم میں کوئی اور فلسفہ مُضمر ہے؟ جواب اثبات میں ہے تو وہ فلسفہ کیا ہے؟

۵۔ کیا سوشلزم اور اسلام واقعی دو متضاد نظریے ہیں؟ کیا سوشلزم کے اقتصادی نظریے کو اسلام کے منافی قرار دیا جا سکتا ہے؟

۶۔ اگر یہ متضاد نظریے ہیں تو آپ کے نزدیک سرمایہ داری کی ان مضرتوں کا حل کیا ہے جن سے پوری سوسائٹی ہراساں اور نالاں ہونے کے علاوہ اس کے بندھنوں کو توڑنے کی کوشش میں عقیدوں سے بھی برگشتہ ہوتی جا رہی ہے؟

۷۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی اشتراکیت سے لے کر سرمایہ داری کے اس عروج تک معاشرہ انسانی استحصالِ محنت کے علاوہ نظامِ زر کی بے کراں

خرابیوں کا شکار چلا آرہا ہے اور اسی کا نتیجہ نئی نسل کے ذہنوں کا اشتعال ہے ؟

۸۔ آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ سوشلزم کے ہمنوا سب کے سب مادی (Mate-rialist) اور دہریے (Atheist) نہیں ہیں بلکہ نئی تعلیم نے اپنے سانچے میں ڈھال کر جس نسل کو اپنی خاص اصطلاحوں، ترکیبوں اور نظریوں کے ساتھ جنم دیا ہے وہ نظام زر یعنی سرمایہ داری (Capitalism) کے خلاف اپنی برگشتگی اور جدو جہد کو مخصوص و معیّن کرنے کے لیے سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرتی ہے ؟ گویا اس کے نزدیک سوشلزم کا تصوّر دہریت یا مادیّت کا تصوّر نہیں بلکہ سرمایہ داری نظام کی مضرتوں اور خرابیوں کو محو کر دینے کا نام ہے۔ بالفاظِ دیگر دولت کی منصفانہ تقسیم، استحصالِ محنت کا خاتمہ اور امتیازات کی بیخ کنی۔

۹۔ کیا اسلام دولت کی منصفانہ تقسیم، استحصالِ محنت کے خاتمے اور نظامِ زر کے امتیازات کی تنسیخ کو تسلیم کرتا ہے ؟

۱۰۔ اسلام میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کا جواز ہے ؟ ہے تو کس حد تک ہے؟ اور نہیں تو سوشلزم سے اس کا ٹکراؤ کہاں ہوتا ہے ؟

۱۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت ان احکام کو منسوخ کر سکتی ہے جو اعتقادات و عبادات کے درجے میں نہیں آتے۔ لیکن ان سے کسی قوم، ملک یا ریاست میں طبقاتی فساد یا اجتماعی خلل پیدا ہوتا ہے ؟

۱۲۔ اگر اسلام میں سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی جنگ نہیں تو سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی امتیاز کہاں ہے ؟ اور اس کا جواز کیوں کر پیدا کیا جا سکتا ہے ؟

۱۳۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ طبقاتی نظام نے کئی صدیوں کی تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کو سخت قسم کی مصیبتوں سے دوچار کیا ہے ؟ پھر اس طبقاتی نظام کو منسوخ، معطل اور برباد کر دینے میں عیب کیا ہے ؟

۱۴۔ سوشلزم کا مقصد اگر یہ ہو کہ :

ا۔ دولت کی تقسیم منصفانہ ہو،

ب۔ انسانوں کو زندگی بسر کرنے کی تمام ضرورتیں مہیا کی جائیں اور ریاست یہ راہنیں فراہم کرنے کی ذمہ داری ہو،

ج۔ ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت میں ہوں ،

تو یہ مقصد اسلام سے کہاں متصادم ہوتا ہے ؟

۱۵۔ جس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کیا جارہا ہے وہ تمام تر سرمایہ داری کی عصری شکلوں سے پیدا ہوا ہے۔ فی الجملہ سرمایہ و محنت کے استحصال کا مسئلہ صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے۔ جاگیرداری کے زمانے میں یہ احساس عوامی نہیں بلکہ خاص ذہنوں میں ایک تاریخی احساس کے طور پر تھا۔ جاگیرداری کے خلاف جو احساس اُبھرا، اصلاً یورپ کی سرمایہ داری کے خلاف ایشیائی قوموں کی سیاسی بیداری سے اُبھرا۔ نتیجۃً "زمینیں کاشت کاروں کی ملکیت ہیں" کا نعرہ بھی وضع ہوگیا۔ اس نعرے یا موقف سے اسلام کے کس حصّے کی نفی ہوتی ہے ؟

ج : اس سوال کا جواب میں شق وار دوں گا، کیوں کہ اس کو آپ نے ۱۵ شقوں میں بیان فرمایا ہے :

۱۔ ان دونوں گروہوں میں سے ایک تو صاف صاف اشتراکی انقلاب کا خواہشمند ہے اور وہ بھی چینی برانڈ کا۔ جہاں تک دُوسرے گروہ کا تعلق ہے اس کے رُجحانات میں فاشزم غالب ہے۔ اگرچہ یہ لوگ سوشلزم کا نام لیتے ہیں لیکن ہٹلر بھی نیشنل سوشلزم کا نام لے کر ہی میدان میں آیا تھا۔ اس لیے محض سوشلزم کی اصطلاح کے اشتراک سے ان دونوں گروہوں کو ہم آہنگ نہیں سمجھا جا سکتا۔ !

۲۔ جس گروہ کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اس کا کوئی ایک ہی نعرہ نہیں ہے

بلکہ وقت اور موقع کو دیکھ کر وہ مختلف قسم کے نعرے لگاتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کے لیڈر صاحب کے جو اقوال اخبارات میں آئے ہیں، اُن کو اگر جمع کر کے دیکھا جائے تو اب تک تقریباً ایک درجن مختلف اقوال سامنے آچکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ سوشلزم اور اسلام کے بارے میں اُن کا اصلی اور آخری قول کیا ہے۔ یہ کہنا کہ "اسلام ہمارا دین ہے — سوشلزم ہماری معیشت ہے — اور جمہوریت ہماری سیاست ہے —" اگر فریب نہیں تو جہالت ضرور ہے۔ ایک ہی سانس میں یہ تین باتیں کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام نہ کوئی معاشی نظام دیتا ہے اور نہ سیاست میں ہماری کوئی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ ہمارا دین ہے تو صرف مسجد اور چند مذہبی رُسوم کی حد تک ہے۔ یہ بات کوئی ایسا شخص نہیں کہہ سکتا جس نے کبھی دینِ اسلام کا مطالعہ کیا ہو اور سوچ سمجھ کر اسلام کو اپنا دین قرار دیا ہو — علاوہ بریں سوشلزم ایک باقاعدہ نظامِ فکر کا نام ہے۔ جو عقیدے اور اخلاق سے لے کر اجتماعی زندگی کے تمام تفصیلی پہلوؤں تک اسلام سے متصادم ہے۔ اسی طرح جمہوریت اگر اسلام کے بغیر ہو تو وہ بھی سراسر مغرب کی الحادی جمہوریت ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر سے کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کیوں کہ اسلام کی قید سے آزاد جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ جمہور جس حلال کو چاہیں حرام کر سکیں اور جس حرام کو چاہیں حلال کر سکیں اور کسی خُدا اور رسُولؐ کے احکام کے پابند نہ ہوں۔ لہٰذا اسلام سے الگ کر کے سوشلزم کو اپنی معیشت اور جمہوریت کو اپنی سیاست قرار دینا بیک وقت تین بالکل متضاد اور باہم متصادم مسلکوں کو جمع کرنے کا ہم معنی ہے جس کا ارتکاب اگر کوئی شخص کر سکتا ہے تو یا فریب کی غرض سے کر سکتا ہے یا پھر جہالت کی بنا پر — !

۔ اس کا جواب اُوپر کی شق کے جواب میں آگیا ہے۔

۴۔ میرا اندازہ ہے کہ اس پارٹی کا مسلک بہت سارے فلسفوں کا مجموعہ ہے جس میں کوئی ایک رنگ واضح طور پر نہیں پایا جاتا۔ اس کے طریق کار میں جو رجحانات مجھے نظر آتے ہیں وہ جیساکہ اوپر بیان کر چکا ہوں، فاشزم کے رجحانات ہیں جس طریقے سے فدائیوں کی تنظیم شروع کی گئی ہے اور اس میں شریک ہونے والوں سے جس طرح حلف لیا گیا ہے، اس کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کے طرز کے طوفانی دستے (Storm Troopers) تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس طریقے سے صرف ایک شخص کی آمریت ہی قائم ہو سکتی ہے۔

۵۔ اسلام اور سوشلزم جیساکہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں، دو قطعی متضاد نظریے ہیں۔ اسلام کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ہم ایک خدا کے بندے ہیں۔ اس خدا نے اپنے رسولؐ اور اپنی کتاب کے ذریعے سے ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں جو ہدایات دی ہیں اُن کے برحق ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام انہی ہدایات کی پیروی کرنا ہے۔ ہمارے لیے یہ دُنیا کی زندگی، اصل زندگی نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کا حقیقی مقصد آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اور یہ رضا ہمیں اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہم اس دُنیا میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کی پیروی کریں۔ اس عقیدے پر اسلام ایک پُورا نظامِ اخلاق دیتا ہے اور ایک پُورا نظامِ عبادات دیتا ہے تاکہ ہماری زندگی عملاً اس عقیدے کے ساتھ عمر بھر وابستہ رہے۔ اس کے ساتھ اسلام ہم کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک ہمہ گیر قانون اور ضابطہ دیتا ہے جس کا دائرہ گھر اور خاندان کی زندگی سے لے کر درس گاہ، عدالت، پارلیمنٹ، مارکیٹ اور بین الاقوامی تعلقات، ہر چیز پر وسیع ہے۔ اس کے برعکس سوشلزم کا آغاز ہی اس تصور سے ہوتا ہے کہ ہمیں کسی خدا اور کسی رسول کی رہنمائی کی حاجت نہیں

ہے بلکہ ہم خود اپنی زندگی کے معاملات کو طے کرنے کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق ایک فلسفۂ حیات تصنیف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس بنیادی تصور کی بنا پر سوشلزم اپنا ایک فلسفۂ تاریخ تصنیف کرتا ہے، ایک فلسفۂ معیشت اختیار کرتا ہے، اور اس فلسفۂ معیشت کو نافذ کرنے کے لیے جس تدبیر سے بھی کام لیا جا سکے لینا چاہیے خواہ وہ جھوٹ ہو یا بدعہدی ہو یا قتل و غارت اور خوں ریزی۔

پھر اسلام جو اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے، سوشلزم کا تجویز کردہ اجتماعی نظام اُس کی بالکل ضد ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام ایک طرف فرد کی آزادی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے لیکن اُسے ایسے حدود کا پابند بناتا ہے جس سے وہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہونے کے بجائے مفید بن سکے۔ دوسری طرف وہ اتنی ہی بنیادی اہمیت ایک صالح معاشرہ کے وجود کو دیتا ہے، جس کے اندر انفرادی انسانی فضائل کے نشوونما کا پورا موقع ہو، افراد اور طبقوں اور گروہوں کے درمیان کش مکش اور منافرت کے بجائے باہمی تعاون، ہمدردی اور احسان کی رُوح کارفرما ہو اور پورا معاشرتی نظام برائیوں کو دبانے اور نیکیوں کو فروغ دینے والا ہو۔ سوشلزم اس کے برعکس عیسائیت کے اس ابتدائی تصورِ انسان کو اختیار کرتا ہے کہ آدمی پیدائشی گنہ گار ہے اور وہ سرے سے اتنا قابلِ اعتماد ہی نہیں ہے کہ اُس کو یہ آزادی دی جائے کہ یہ پیدائشی گنہ گار اور ناقابلِ اعتماد انسان کچھ وسائلِ معیشت کا مالک ہو کر اپنی صوابدید کے مطابق کام کرے۔ سوشلزم کے نزدیک وسائلِ معیشت کے معاملے میں انسانی ملکیت اور انسان کے تصرف کی آزادی ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے وہ ایک ایسا اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے جس میں تمام وسائلِ معیشت اجتماعی ملکیت میں لے لیے جائیں اور افراد کو اجتماعی مشین میں کس کر رکھ دیا جائے۔ لیکن یہ ایک عجیب تضاد خیالی ہے کہ جو نظریہ معاشرے کے افراد کو

ناقابلِ اعتماد قرار دے کر تصنیف کیا گیا ہے ، وہ یہ فرض کرلیتا ہے کہ جب اجتماعی مشین کو مرکز میں چند افراد چلائیں گے تو وہ تمام عیوب سے منزّہ اور سُبّوح و قُدّوس انسان ہوں گے۔ ان کے انتظام اور قبضہ و تصرف میں پورے ملک کے وسائلِ معیشت صحیح طور پر استعمال ہوں گے اور دولت کی تقسیم بھی منصفانہ ہوگی۔ اِس تضاد خیالی کے غلط ہونے کو ہر معقول آدمی بادی النظر میں ہی محسوس کرسکتا ہے۔ لیکن پچھلے ۵۰ سال کے تجربے نے عملاً بھی اس کا غلط ہونا ثابت کردیا ہے۔ سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے کے دو عظیم الشان تجربے روس اور چین میں ہوئے ہیں۔ دونوں جگہ فردِ واحد کی شخصیت کو قریب قریب خُدا کے مقام تک پہنچا دیا گیا۔ ایک جگہ یہ مقام اسٹالن کو دیا گیا اور اب ساری دنیا اس کے بدترین نتائج سے واقف ہوچکی ہے۔ دوسری جگہ شخصیت پرستی (Person ality Cult) ماؤ کے معاملے میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اس کا یہ نتیجہ ساری دنیا کے سامنے آچکا ہے کہ یوشاؤچی جیسا شخص بھی دو سال سے لعنت، ملامت اور پھٹکار کا ہدف بنا ہوا ہے لیکن اُسے اپنی پوزیشن صاف کرنے کا آج تک کوئی موقع نصیب نہ ہوسکا۔ اب یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اسلام عقیدے سے لے کر عمل کی تفصیلات تک ہر پہلو میں سوشلزم سے مختلف ہے۔

۶۔ سرمایہ داری کا اصلی مخالف سوشلزم نہیں بلکہ اسلام ہے۔ سوشلزم کو سرمایہ داری سے جو عداوت ہے وہ دراصل اِس معنی میں ہے کہ وہ بہت سے افراد اور اداروں کے ہاتھ میں زمین اور صنعت و تجارت کی ملکیت اور انتظام کو درست نہیں سمجھتا، تمام سرمایہ داری اور زمینداری کو مجتمع کرکے ایک سوشلسٹ اسٹیٹ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ گویا وہ سرمائے کو اور زیادہ مرکوز کرتا ہے اور منتشر طور پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کی جو طاقت معاشرے کے افراد کو

پُوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے قابل نہیں ہے اس کا ازالہ وہ اس طرح کرتا ہے کہ ایک بڑی سرمایہ دار اور زمیندار اسٹیٹ وجود میں لاکر افراد کو پُوری طرح اس کے ہاتھ میں بے بس کردیتا ہے۔ اس نظام میں ایک ہی ادارہ قانونی اور سیاسی اور فوجی طاقت کا مالک بھی ہوتا ہے اور تمام معاشی ذرائع کا مالک بھی! اس سے وہ آمریت ظہور میں آتی ہے جس کے مقابلے میں آج تک کی وہ تمام آمریتیں ہیچ ہیں جو کسی دوسرے نظام نے پیدا کی ہیں۔ اسلام اس کے برعکس اُس سرمایہ داری نظام کا بھی دشمن ہے جو اس وقت مغربی سرمایہ داری کے نام سے معروف ہے۔ اور اُس انتہائی مرتکز سرمایہ داری کا بھی دشمن ہے جسے سوشلزم وجود میں لاتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایک ایسی آزاد معیشت کا قیام ہے جس میں افراد کو شخصی ملکیت کے حقوق دے کر ایک طرف اُن کی آزادی محفوظ کی گئی ہے اور دوسری طرف دولت کمانے اور خرچ کرنے کے طریقوں میں حلال و حرام کی تمیز قائم کرکے افراد کو اس کا پابند کردیا گیا ہے کہ وہ صرف حلال طریقے سے کمائیں اور حلال ہی طریقے سے خرچ کریں۔ پھر وہ اپنی اخلاقی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے افراد کو اس کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ رضاکارانہ طریقے سے ایک دوسرے کی ہمدردی اور دستگیری کریں۔ اور قانونی طریقے سے بھی اُس نے اس کا انتظام کیا ہے کہ دولت کو مخصوص طبقے میں مرتکز نہ ہونے دیا جائے بلکہ وہ پھیل کر معاشرے کے کمزور سے کمزور افراد تک پہنچے۔ اس نے معاشی وسائل پر ہر قسم کی اجارہ داریوں کو ممنوع قرار دیا ہے تاکہ مستقل مفاد یافتہ طبقات وجود میں نہ آسکیں۔ وہ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کو ترقی کے مساوی مواقع دیتا ہے تاکہ ہر شخص اپنی قابلیت سے جتنی ترقی بھی کرسکتا ہو کرے مگر جائز ذرائع سے کرے۔ وہ مصنوعی ذرائع سے کسی قسم کے طبقات پیدا نہیں ہونے دیتا

اور فطری اسباب سے جو طبقات پیدا ہوتے ہیں ان کے درمیان منافرت اور کش مکش کے بجائے تعاون اور ہمدردی کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ اگر اسلام کے اس نظام پر ہمارے ہاں ایمان داری سے عمل کیا جاتا اور یہ منافقت نہ برتی جاتی کہ نام تو اسلام کا لیا جارہا ہے اور کام سراسر اس کے خلاف کیے جارہے ہیں، تو آج یہ حالت نہ ہوتی کہ لوگ سرمایہ داری کے بندھنوں کو توڑنے کے لیے کسی غیر اسلامی نظام کی طرف لپکنے لگتے!

۷۔ آپ کا یہ خیال صحیح ہے۔

۸۔ یہ صورتِ حال جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں دراصل اُس نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے جس نے ہماری نئی نسلوں کو اسلام سے قریب قریب بالکل ناواقف رکھا اور صرف مغربی فلسفوں اور نظریات کا دُودھ پلا پلا کر اُن کی پرورش کی۔ اس لیے جب قدیم نظام جاگیرداری اور جدید نظام سرمایہ داری اور ایک بد دیانت بیوروکریسی کی پیدا کردہ خرابیوں کے بدترین مجموعے سے تنگ آکر اُن کو عدلِ اجتماعی (Social Justice) قائم کرنے والے کسی نظام کی جستجو ہوئی تو اُن کے ذہن اسلام کی طرف رُجوع کرنے کے بجائے بیرونی نظریات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان بیرونی نظریات میں ان کو صرف سوشلزم ہی ایک ایسا نظام نظر آیا جو سرمایہ داری کی بیماری کے علاج کا مدّعی تھا۔ اس لیے انھوں نے بے اختیار اس کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک بہت ہی قلیل تعداد ایسی ہے جو حقیقت میں سوشلزم کی مادّہ پرستی اور دہریت کو قبول کرتی ہے۔ وہ دراصل سوشلزم کے اس دعوے سے دھوکا کھائے ہیں کہ وہی دراصل سرمایہ داری کی بیماری کا علاج ہے۔ اس کی کثیر تعداد کو یہ احساس نہیں ہے کہ جب وہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور محنت کے استحصال کی بیخ کُنی کی خاطر ایک ایسے نظام کی طرف رجوع کریں گے جو نہ صرف اپنا ایک مفصّل فلسفہ اور ہمہ گیر نظامِ زندگی رکھتا ہے بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں عملاً رائج بھی ہے تو بالآخر وہ سوشلزم کے معاشی نظام کے ساتھ ساتھ اُس کی مادّہ پرستی اور دہریت کو بھی ہضم کرتے چلے جائیں گے خواہ اُن کے اندر ایسا کرنے کی خواہش ہو یا نہ ہو۔

۹۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف اسلام ہی دولت کی منصفانہ تقسیم کرتا ہے اور اُسی کے ذریعے سے استحصالِ محنت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وہی ان امتیازات کی تنسیخ کرتا ہے جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔

۱۰۔ آپ کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سرمایہ داری لغوی حیثیت سے تو صرف یہ معنی رکھتی ہے کہ آدمی کسی سرمائے کا مالک ہو، مگر اصطلاحاً اس سے مُراد وہ سرمایہ داری نظام ہے جو اس وقت مغربی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اسلام میں پہلی چیز کا جواز ہے اور دُوسری چیز کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مزید برآں اسلام سرمائے کی صرف اُس ملکیت کو جائز رکھتا ہے جو حلال طریقوں سے حاصل ہوئی ہو۔ جس کے مالک نے اگر وہ بقدرِ نصاب سرمائے کا مالک ہے زکوٰۃ ادا کی ہو اور جس کا مالک سرمائے کے خرچ کے اُن حدود کا پابند ہو جو اسلام نے عاید کر دیے ہیں۔

رہی جاگیرداری، تو اس سے مُراد زمین کا وہ عطیہ ہے جو کسی حکومت کی طرف سے دیا گیا ہو۔ اسلام اس طرح کے صرف اُن عطیوں کو جائز قرار دیتا ہے جو کسی عادل حکومت نے کسی شخص کو معاشرے کی جائز خدمات کے صلے میں یا جائز خدمات کی خاطر ایک حدِ اعتدال کے اندر رہتے ہوئے دیے ہوں، اور یا تو افتادہ زمینوں میں سے دیے ہوں یا سرکاری املاک میں سے۔ ایک شخص کی ملکیت چھین کر دوسرے کو دے دینے کا اسلام میں کوئی جواز نہیں ہے اور نہ اس بات کا کوئی جواز ہے کہ زمین کے جائز مالکوں کے اُوپر کسی شخص کو جاگیردار بنا کر اس طرح مُسلّط کر دیا جائے کہ وہ اس کے کاشت کار بن کر رہ جائیں۔ پھر اسلام اس طرح کے عطیوں کے بارے میں بھی یہ شرط عاید کرتا ہے کہ جسے کوئی زمین عطا کی جائے وہ تین سال کے اندر اندر اس کو استعمال کرے ورنہ عطیہ اُس سے سلب کر لیا جائے گا۔

ان شرائط کو اگر آدمی غور سے دیکھے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ جو جاگیرداریاں ظالمانہ حکومتوں کے دَور میں پیدا ہوئی ہیں وہ سب کی سب اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز نوعیت کی ہیں۔

آپ کے سوال کا یہ حصّہ کہ سوشلزم سے اس کا ٹکراؤ کہاں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سوشلزم سرے سے سرمائے اور زمین کی شخصی ملکیت ہی کا مخالف ہے۔ درآں حالیکہ اسلام جائز حدود کے اندر ان دونوں چیزوں پر شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے۔ جیسا کہ مَیں اوپر بتا چکا ہوں، سوشلزم تو تمام سرمایہ داروں کو ختم کرکے ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں لاتا ہے اور تمام جاگیرداروں اور زمینداروں کو ختم کرکے ایک بڑا جاگیردار اور زمیندار پیدا کر دیتا ہے۔ جن لوگوں کو رُوس میں سوشلزم کی تاریخ کا کچھ علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہاں بڑے بڑے زمینداروں ہی کو نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے مالکوں کو بھی ان کی زمین کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا اور اجتماعی ملکیت (Collectivisation) کا نظام قائم کرنے کے لیے لاکھوں کسانوں اور کاشت کاروں کو تباہ کرکے رکھ دیا گیا۔

۱۱۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی قوم، ملک یا ریاست میں طبقاتی یا اجتماعی خلل جن اسباب سے پیدا ہوتا ہے ان کو رفع کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ملک میں اسلام کا پُورا قانون نافذ کیا جائے اور ہر پہلو میں اصلاحات کرکے نظامِ معاشرہ کو ایک صالح معاشرے میں تبدیل کیا جائے۔ اس غرض کے لیے اگر سابق نظامِ فاسد کی پیدا کردہ خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے بعض خاص تدابیر استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ اُس وقت تک کے لیے استعمال کی جاسکتی ہیں جب تک اُن کی ضرورت رہے، بشرطے کہ وہ اسلام کے اُصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔

اسلامی حکومت شریعت کے اُن احکام کو بھی منسوخ نہیں کرسکتی جو عبادات و اعتقادات کے درجے میں نہیں آتے لیکن ہیں بہرحال اسلامی احکام ہی۔ البتہ بعض خاص حالات میں بعض خاص خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے وہ عارضی طور پر کچھ مباح چیزوں کو ممنوع کرسکتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابتداءً زیارتِ قبور کو منع کردیا اور بعد میں اس کی اجازت دے دی۔ بعد کی اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ زیارتِ قبور فی الاصل مُباح تھی لیکن عارضی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس لیے منع کیا کہ سابق شرک کے جو اثرات معاشرے نے مہیا کر رکھے تھے اُن کو دور کرنے کے لیے یہ عارضی ممانعت ضروری تھی۔ اسی طرح آپؐ نے شراب کی حُرمت کے بعد اُن خاص قسم کے برتنوں کے استعمال کو بھی کچھ مدت کے لیے منع کردیا جن میں پہلے شراب بنائی اور استعمال کی جاتی تھی اور بعد میں ان کے استعمال کی اجازت دے دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت عارضی طور پر مُباحات پر ایسی پابندیاں عاید کرسکتی ہے جو کسی اہم شرعی مصلحت کے لیے ضروری ہوں۔ لیکن اوّل تو اس طرح کی پابندیاں عاید کرنے والی حکومت وہ ہونی چاہیے جو کسی بیرونی فلسفے سے متاثر اور مرعوب نہ ہو بلکہ اسلامی اصولوں پر کام کرتی ہو۔ دوسرے اس طرح کی پابندیوں کو مستقل قانون بنانا درست نہیں ہے۔ اُنھیں صرف اس وقت تک استعمال کرنا چاہیے جب تک اسلامی قوانین کے اجراء و نفاذ سے حالات معمول پر نہ آجائیں۔

۱۲۔ سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی امتیاز سے مُراد اگر مستقل طبقاتی امتیاز ہو جسے قانون اور انتظامی پالیسیوں کے ذریعے سے دوامی تحفظ دیا گیا ہو تو اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ البتہ وہ طبقاتی فرق جو فطری اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اسلام اس کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں کہ یہ فطرت سے جنگ ہے۔

تبدیل کرنا پڑا۔ اس کے بعد اُس نے دولت کی تقسیم کی جو دوسری صورت اختیار کی وہ منصفانہ تقسیم کی تعریف میں سرے سے آتی ہی نہیں۔ بلکہ اُس کے اُوپر اگر کوئی صحیح لفظ منطبق ہوتا ہے تو وہ جابرانہ تقسیم کا لفظ ہے۔ کیوں کہ منصفانہ تقسیم کے مفہوم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ انصاف کرنے والا غیر جانب دار ہو اور جن کے درمیان وہ انصاف کرنے کے لیے بیٹھے اُس کی نگاہ میں وہ سب یکساں ہوں۔ یعنی اُن میں سے کسی کا وہ حامی اور مخالف نہ ہو۔ سوشلزم میں تقسیم کا نظام ایک پارٹی کے ہاتھ میں آتا ہے اور وہ پارٹی درجہ بدرجہ محدود سے محدود تر افراد کے ہاتھ میں نظامِ تقسیم کے اختیارات کو مرکوز کرتی چلی جاتی ہے۔ اس پارٹی کے فلسفے کا آغاز ہی جانب داری کے تصور سے ہوتا ہے، یعنی پرولتاریہ کی حمایت اور اس کے ماسوا تمام دُوسرے افراد اور گروہوں سے شدید نفرت اور ان کے خلاف جنگ کا جذبہ۔ اس صورت میں آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایک پورے معاشرے کے درمیان منصفانہ تقسیم کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اس کے بعد آپ نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ محدود سے محدود تر انسانی گروہ جس کے ہاتھ میں آخر کار نظامِ تقسیم پر عمل درآمد کرنے کے اختیارات مرکوز ہوتے ہیں وہ عملاً اس مقام پر آ جاتا ہے جو بادشاہی نظام میں کسی بادشاہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں کسی سرمایہ دار اور جاگیردارانہ نظام میں کسی جاگیردار کی جباریت سے بدرجہا زیادہ سخت جبار کا مقام ہے۔ کیوں کہ یہاں پوری مملکت کے تمام ذرائع پیداوار اُن کے قبضے میں ہوتے ہیں اور انہی کے ہاتھ میں پوری سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال پوری دنیا میں نہ کبھی کسی سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہوتی ہے نہ کسی بادشاہی نظام میں اور نہ کسی جاگیردارانہ نظام میں۔ اس کے بعد اگر وہ لوگوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی ضروریات فراہم کرنے کی

ذمّہ داری لیتے ہیں تو اُس میں اور اُس جیلر کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا جو قیدیوں کو روٹی، کپڑا، مکان اور علاج فراہم کرنے کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اسلام کا تجویز کردہ نظام اس نظام سے ہر پہلو میں متصادم ہے۔

۱۵۔ شق نمبر ۱۵ میں جو سوال آپ نے کیا ہے اس پر مَیں نے اپنی کتاب "اسلام اور جدید معاشی نظریات" میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس میں مَیں نے یہ بتایا ہے کہ یہ سارے مسائل جو جاگیرداری نظام سے لے کر سوشلزم اور فاشزم تک اور پھر اُن مصالحتوں (Compromises) تک جو سوشلزم اور کیپٹلزم کے درمیان امریکہ، انگلستان اور سکنڈے نیوین ممالک میں کی گئی ہیں، دراصل مغرب کی اُس سوسائٹی میں پیدا ہوئے ہیں جو خُدا کی کسی کتاب اور کسی رسُول کی رہنمائی سے تمدن و اجتماع کے معاملات میں بالکل محروم تھی اور جس نے اپنے تعصب کی بنا پر خدا اور رسول کی اس رہنمائی کی طرف رجوع کرنے سے انکار کیا جو اخلاق و رُوحانیت کے ساتھ ساتھ انسان کی مادی زندگی میں بھی اس کو راہِ راست بتانے کے لیے آئی تھی۔ اس راہِ راست کو پانے سے محروم رہ کر مغرب کی سوسائٹی پے در پے ایک انتہا سے دُوسری انتہا کی طرف لڑھکتی رہی ہے اور کبھی اس نے اعتدال کا راستہ نہیں پایا ہے۔ جاگیرداری نظام جب ظلم کی انتہا پر پہنچا تو اس کے خلاف احتجاج نے سرمایہ داری نظام کی شکل اختیار کی۔ پھر سرمایہ داری نظام خصوصیت کے ساتھ صنعتی انقلاب کے بعد ظلم کی دُوسری انتہا پر پہنچ گیا اور اس نے اس نظام کی پیدا کردہ بیماریوں کے علاج کے لیے سوشلزم اور فاشزم کی شکل اختیار کی۔ پھر اُن کی برائیوں نے اشتراکی ممالک میں جب اپنے آپ کو پُوری طرح عیاں کر دیا اور معلوم ہوگیا کہ ان دونوں نظاموں نے ظلم کا علاج بدتر ظلم سے کیا ہے تو اہلِ مغرب نے

مصالحتوں کی مختلف شکلیں اختیار کرنی شروع کیں لیکن کوئی مصالحت بھی اس وقت تک کامیاب ثابت نہیں ہو رہی ہے اور مختلف ممالک میں مصالحت کی جو شکل بھی اختیار کی گئی ہے وہ معاشرے کی مجموعی خرابیوں میں کمی کرنے کے بجائے اضافہ ہی کرتی چلی جا رہی ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اس کی ساری تفصیل آپ کے سوال کے جواب میں بیان کر سکوں۔ آپ کے ناظرین کو میں مشورہ دُوں گا کہ وہ میری اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ جو بات میں یہاں مختصراً کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ آخر ہم مسلمانوں نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ ہماری حالت بھی اُن قوموں کی طرح ہے جو خُدا اور رسولؐ کی ہدایت سے محروم ہو کر کئی صدیوں سے ایک انتہا سے دُوسری انتہا کی طرف بھٹکتی پھر رہی ہیں؟ ہمارے پاس خُدا کے فضل سے صراطِ مستقیم موجود ہے۔ ہم کیوں وہ ساری تاریخ اپنے ہاں دُہرانے کے لیے تیار ہوں جس سے یہ گمراہ قومیں گزری ہیں اور گزر رہی ہیں؟ اپنی صراطِ مستقیم سے بھٹک کر جن گمراہ کُن نعروں کی طرف ہم متوجہ ہو رہے ہیں اُنہی میں سے ایک نعرہ یہ ہے کہ "زمینیں کاشت کاروں کی ملکیت ہیں"۔ یہ ایسا ہی عجیب نعرہ ہے جیسے کوئی کہے کہ مکان معماروں کی ملکیت ہے اور کھانا باورچیوں کی ملکیت ہے اور کپڑے درزیوں کی ملکیت ہیں۔ آخر کوئی حد تو ہونی چاہیے جہاں ٹھہر کر ہم کچھ سوچیں کہ ہم کیا اُلٹی سیدھی باتیں کرنے پر اُتر آئے ہیں۔ کاشت کار اگر واقعی اپنی زمین کا مالک ہو اور اس میں وہ کاشت کر رہا ہو تو زمین یقیناً اس کی ملکیت ہے۔ لیکن اگر وہ کسی دُوسرے کی زمین بٹائی یا اُجرت پر کے معاہدے پر کاشت کر رہا ہو تو محض کام کرنے کی بنا پر وہ اس کا مالک کیسے ہو جائے گا؟ اور اگر صرف اِس بنیاد پر اُس کو زمین کا مالک قرار دیا جائے تو کیا معقول وجہ ہے کہ معماروں کو اُس مکان کا مالک نہ قرار دیا جائے جو وہ کسی دوسرے

شخص کی خریدی ہوئی زمین پر اُس کے فراہم کردہ روپے اور سامان سے تعمیر کرتے ہیں؟ بظاہر کاشت کار کو یہ نعرہ سُن کر بڑی خوشی ہوگی کہ زمین اُس کی جو اُس پر کاشت کرے، لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہو اور وہ اس نعرے کے معنی پر غور کرے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ کل اگر وہ مرجائے اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہ جائیں، یا وہ خود بوڑھا، بیمار، یا معذور ہوجائے اور اپنی زمین پر کاشت کرنے کے قابل نہ رہے تو اس کا اور اس کی اولاد کا حقِ ملکیت آپ سے آپ ساقط ہوجائے گا اور آگے جو شخص بھی اس زمین پر کاشت کرے گا وہی اس کا مالک ہوجائے گا۔ یہ پوزیشن جس وقت کاشت کار کی سمجھ میں آجائے گی وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر اس سے توبہ کرے گا۔

س ۵: اِسلام کے نزدیک زمینوں کی ملکیت کا تصوّر کیا ہے؟

ﻻ۔ کیا اسلام بڑی بڑی زمینداریوں کو جائز قرار دیتا ہے؟

ب۔ کیا زمین ان کی ملکیت نہیں جو کاشت کریں جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے؟

ج۔ اس امر کا جواز کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کی دھونس، قانون کی دھاندلی اور استحصالِ زر سے حاصل کی ہوئی زمینیں سینکڑوں مزارعوں کی کاشت کے بعد فردِ واحد یا اُس کے خاندان کی ملکیت ہوجاتی ہیں؟ یہ ملکیت کس شرعی یا اخلاقی جواز کی بنا پر جائز ہے؟

ج: اسلام کے نزدیک زمینوں کی ملکیت کے تصوّر کو بھی میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں بیان کردیا ہے جو شائع ہوچکی ہے اور بازار میں موجود ہے۔

ملکیت کی جن صورتوں کو شریعت اسلامی نے حلال قرار دیا ہے اُن میں

سے کسی صورت میں بھی جو زمین کسی کی ملکیت قرار پاتی ہو وہ جائز ملکیت ہے اور جو شریعت کی بیان کردہ صورتوں کے خلاف کسی صورت سے حاصل کی ہوئی ہو وہ ناجائز ملکیت ہے۔ اسلام میں اس تصوّر کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت سرے سے ناجائز ہے۔ جو لوگ اس تصوّر کے حق میں اَلْاَرْضُ لِلّٰہ سے استدلال کرتے ہیں وہ اوّل تو پوری آیت نہیں پڑھتے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"زمین اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بناتا ہے۔" (الاعراف: ۱۲۸)

دُوسرے وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر اَلْاَرْضُ لِلّٰہ کا مطلب وہی لیا جائے جو اُنھوں نے لیا ہے تو اس سے شخصی اور قومی ملکیت دونوں ہی کی ایک ساتھ نفی ہو جاتی ہے۔ کسی منطق سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جو زمین اللہ کی ہے اس کا مالک ایک شخص تو نہیں ہو سکتا مگر قوم اس کی مالک ہو سکتی ہے۔

۹۔ اسلام زمینداری کی بڑائی اور چھوٹائی کے لحاظ سے اس کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ اس لحاظ سے اس کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی ملکیت کس طرح حاصل ہوئی ہے۔ جائز طریقے سے حاصل ہوئی ہو تو اُس کے متعلق اسلام کا فیصلہ اور ہے اور ناجائز طریقے سے حاصل ہوئی ہو تو اُس کا فیصلہ دُوسرا ہے۔ اس کے بعد پھر اسلام اس حیثیت سے زمینداری کے معاملے کو دیکھتا ہے کہ زمیندار خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، وہ اپنی زمینداری کا کام کرتا کس طرح ہے۔ اگر وہ کام اُن طریقوں سے کرتا ہو جو قانونِ شریعت کی رُو سے جائز ہیں تو اُس کی زمینداری قابلِ اعتراض نہیں ہے، اور اگر وہ کام ناروا طریقوں سے کرتا ہو تو وہ سزا کا مستحق ہے اور اس پر مختلف قسم کی پابندیاں عاید کی جا سکتی ہیں جو اُس کے ظلم کے لحاظ سے متعین ہوں گی۔

ب: فقہائے اسلام میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں ہے اور نہ یہ بات کسی حدیث یا قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت ہوتی ہے کہ زمین ان کی ملکیت ہے جو اس پر کاشت کریں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرف اگر کوئی شخص یہ بات منسوب کرتا ہے تو خلافِ واقعہ بات کہتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ نہیں ہے کہ وہ بٹائی پر زمین دینے کو مطلقاً ناجائز قرار دیتے ہوں بلکہ ان کے نزدیک اگر زمین کا مالک صرف زمین ہی دے کر الگ نہ ہو جائے بلکہ تخم، بیل، ہل وغیرہ میں بھی کاشت کار کے ساتھ شریک ہو تو اس صورت میں پیداوار کی بٹائی پر معاملہ کرنا جائز ہے۔ اس کے برعکس امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ بٹائی پر معاملہ کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور وہ شرط نہیں لگاتے جو امام ابوحنیفہؒ نے لگائی ہے۔ مذہب حنفی میں فتویٰ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ ہی کے قول پر ہے۔ رہا امام شافعیؒ کا مسلک تو وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کی زمین پر دوسرے شخص کے کاشت کرنے کی جائز صورتیں دو ہیں جن میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ مالکِ زمین کاشت کار کی خدمات کسی اُجرت پر حاصل کرلے، اس صورت میں کھیتی مالک کی ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کاشت کار ایک مقرر معاوضے پر (جس کو آج کل کی اصطلاح میں ٹھیکے سے تعبیر کرتے ہیں) مالک سے زمین لے لے۔ اس صورت میں کھیتی کاشت کار کی ہوگی۔ اس کی تفصیل "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ج: زمین کی جو ملکیت حکومت کی دھونس یا قانون کی دھاندلی یا کسی اور غیر شرعی طریقے سے حاصل کی گئی ہو وہ سرے سے جائز ملکیت ہی نہیں ہے۔

س ۷۶: بڑے بڑے کارخانے، ملیں اور فیکٹریاں جو موجودہ سرمایہ دار ریاستوں کی طبقہ پروری، قانون پر طبقے کی حکمرانی اور بنکوں کے سُودی نظام کی خواص نوازی

کا نتیجہ ہیں، جائز ہیں؟ ان کی انفرادی ملکیت کو شرعاً درست کہا جا سکتا ہے؟ جب کہ یہ شہادت تاریخی طور پر موجود ہے کہ ان سے مذہب کے استحکام اور مملکت کے عوام (بنی نوع انسان) کو عظیم نقصان پہنچتا رہا اور پہنچ چکا ہے، بلکہ یہی نقصان دین و مذہب سے بغاوت کا ذریعہ بن گیا ہے۔

ج: جدید سرمایہ دارانہ نظام اور ملک کے غلط قوانین اور غلط انتظامی پالیسیوں کی وجہ سے صنعت اور تجارت اور دوسرے وسائل ثروت کا جو ارتکاز ایک محدود طبقے میں ہوا ہے اور محدود سے محدود تر طبقے میں ہوتا جا رہا ہے وہ اسلامی شریعت کی رُو سے بالکل ناجائز ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس ارتکاز کو باقی رکھا جائے یا نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ختم کرنے کی صورت اگر یہ ہو کہ ان تمام چیزوں کو ضبط کر کے قومی ملکیت بنا لیا جائے تو یہ چھوٹی بیماری کا علاج ایک بہت بڑی بیماری سے ہوگا۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ آئندہ کے لیے تو اُن تمام حرام طریقوں کو قانوناً ممنوع کر دیا جائے جن سے دولت کا یہ ارتکاز واقع ہوتا ہے اور پہلے جو ارتکاز واقع ہو چکا ہے اس کو مختلف قوانین کے ذریعے سے باقاعدہ توڑا جائے اور اس مرکز دولت کو بڑے پیمانے پر معاشرے میں تقسیم کرنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے جائیں۔ جو اُصولِ شریعت سے متصادم بھی نہ ہوں اور جن سے مرض کا علاج مرض کے ذریعے سے کرنے کے بجائے مریض (معاشرہ) کی صحت بھی بحال ہو سکے۔

جماعتِ اسلامی نے اپنے شائع شدہ معاشی پروگرام میں اس دوسرے طریقِ علاج کے کچھ اُصول وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ عنقریب ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ موجودہ معاشی نظام پر اُن اصولوں کو کس طرح منطبق کیا جائے جن سے معاشرے میں آزاد معیشت کو برقرار رکھتے ہوئے اِس مرض کا

علاج ممکن ہے۔ اس بات کو مَیں نے حال میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا کہ اسلام کا نشتر ڈاکٹر کا نشتر ہے جو مریض کی صحت درست کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر سرمایہ دار طبقہ اس نشتر کے استعمال کی مزاحمت کرے گا تو پھر اسے ڈاکو کے خنجر سے سابقہ پیش آئے گا اور اب لامحالہ اسے اِن دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہی ہوگا۔

س ۷۷: اسلام میں انفرادی ملکیت کا تصوّر کس حد تک ہے؟

ج: اسلام میں انفرادی ملکیت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے حصُول کے جائز اور ناجائز طریقے بتائے گئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حلال طریقوں سے جو دولت بھی انسان کو حاصل ہو وہ اللّٰہ کا فضل ہے اور اللّٰہ جس پر جتنا چاہے فضل کرے اور حرام طریقوں سے جو مال حاصل کیا جائے اُس کا حصول جُرم ہے اور اس جُرم کی سزا نوعیتِ جرم کے لحاظ سے اسلام میں تجویز کر دی گئی ہے۔ ناجائز ملکیت خواہ چھوٹی سے چھوٹی ہو بہرحال ناجائز ہے اور جائز ملکیت خواہ بڑی سے بڑی ہو بہرحال جائز ہے۔ اس کے بعد اسلام ملکیت پر تصرّف کے طریقوں سے بحث کرتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ملکیت چھوٹی ہو یا بڑی۔ تصرّف کے تمام غلط طریقوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے اور اس کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف سزائیں تجویز کی ہیں۔ رہے صحیح طریقے تو ان میں سے بعض کو اس نے لازم کر دیا ہے جیسے زکوٰۃ۔ اور بعض کے لیے ترغیب دی ہے تاکہ فرد خود اپنی رضاکارانہ نیکی کے ذریعے سے اپنے اخلاقی و روحانی ارتقاء کا بھی سامان کرے اور معاشرے میں بھی کش مکش اور نفرت کے بجائے آپس کی محبّت اور خیر خواہی پیدا ہو۔

س ۷۸: اِس حد سے زائد کی ملکیت پر ریاست قابض ہو سکتی ہے؟

ج: اُوپر نمبر ۷ کے جواب پر غور کرنے سے اس سوال کا جواب خود بخود معلوم ہو سکتا ہے۔

ناجائز املاک یا جائز املاک کے ناجائز تصرف کے بارے میں شریعت میں جو قوانین تجویز کیے گئے ہیں ان میں ضبطیٔ جائداد تک کی گنجائش ہے۔ علاوہ بریں اسلام میں ایک عادل حکومت کو جو شوریٰ کے طریق پر چلائی جاتی ہو اور جو اپنی آمد و صرف کے متعلق معاشرے کے سامنے جواب دہ ہو، افراد پر مختلف قسم کے ٹیکس عاید کرنے کا حق بھی ہے۔ ٹیکس عاید کرنے کی اس پالیسی کے لیے دو اہم رہنما اصول ہمیں قرآن میں ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ دولت دولت مندوں ہی کے درمیان نہ گھومتی رہے۔ دوسرے یہ کہ ٹیکس کا محل وہ دولت ہے جو عفو (زائد از ضرورت) کی تعریف میں آتی ہو۔ ان دو قاعدوں کو ملحوظ رکھ کر منصفانہ طریقوں سے ٹیکس اس طرح عائد کیا جانا چاہیے کہ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہو وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے اتنا ہی زیادہ حصہ ادا کرے۔ مگر اس میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ آدمی کے لیے جائز طریقوں سے حلال دولت کمانے کا محرک (Incentive) بالکل ہی ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ میں نے جہاں تک دین کا مطالعہ کیا ہے مجھے اس تصور کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ملی ہے کہ ملکیت کی بجائے خود ایک حد (بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ جائز نوعیت کی ملکیت ہو یا ناجائز نوعیت کی) مقرر کر دی جائے اور اس سے زائد پر ریاست آپ سے آپ قابض ہو جانے کا حق رکھتی ہو۔

س ۱۹: کیا سیاسی مغالطے اور فکری تصادم کی ایک وجہ یہ نہیں کہ یورپ کی جدید اصطلاحوں اور اسلام کی قدیم اصطلاحوں میں ایک بُعد ہے اور معنوی بُعد صرف اس لیے ہے کہ اسلام اور سوشلزم میں انفرادی ملکیت کا تصوّر دو مختلف زمانوں کا پیدا شدہ ہے؟ نتیجۃً تصوّر کا یہ اختلاف تصادم پر منتج ہو رہا ہے۔ ورنہ جہاں تک اقتصاد و معیشت کا تعلق ہے اسلام کی اجتماعی رُوح خود ایک قسم کی اشتراکیت ہے جس میں خُدا اور رسولؐ کا تصوّر اس کی مضرتوں کا قاطع اور ان کی خوبیوں کا

مدافع ہے۔

ج: جس سیاسی مغالطے اور فکری تصادم کی طرف آپ نے اپنے اس سوال میں اشارہ کیا ہے اس کی اصل وجہ نہ یہ ہے کہ یورپ کی جدید اصطلاحوں اور اسلام کی قدیم اصطلاحوں میں بُعد ہے اور نہ یہ کہ اسلام اور سوشلزم میں انفرادی ملکیت کا تصوّر دو مختلف زمانوں کا پیدا شُدہ ہے دراصل اسلام کا تصوّر کائنات اور تصوّرِ حیات سوشلزم کے تصوّرِ حیات و کائنات سے بالکل مختلف ہے اور تصورات کے اس اختلاف کی بناپر عقیدہ و اخلاق سے لے کر تمدّن و اجتماع کی تفصیلات تک دونوں کا راستہ اور منزل بالکل ایک دوسرے سے الگ ہے۔ رہے سیاسی مغالطے تو وہ اسلام کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ سوشلسٹوں کی طرف سے آرہے ہیں۔ جو فلسفے اور مناہج تو وہ اختیار کر رہے ہیں جو اپنی اصل اور رُوح کے اعتبار سے بالکل اسلام سے مختلف ہیں، مگر طرح طرح کے مغالطے دے کر اس غیر اسلامی چیز کو اسلامی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "جہاں تک اقتصاد و معیشت کا تعلق ہے اسلام کی اجتماعی رُوح خود ایک قسم کی اشتراکیت ہے جس میں خُدا اور رسولؐ کا تصور اس کی مضرتوں کا قاطع اور اس کی خوبیوں کا مدافع ہے۔" یہ بجائے خود اُن مغالطوں میں سے ایک ہے جن کی طرف مَیں نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔ اقتصاد و معیشت کے معاملے میں اسلام کی اجتماعی رُوح یہ ہے کہ ایک طرف فرد کو جائز حدود کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے اور دوسری طرف تعلیم و تربیت کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ بہتر انسان بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اپنے اختیار سے خُدا اور بندوں کے حقوق خود ادا کرے اور قانونی جبر کا استعمال کم سے کم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ کسی قسم کی اشتراکیت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اشتراکیت کا لفظ محض

لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے جو ایک خاص نظام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس نظام کی اجتماعی رُوح اسلام کی اجتماعی رُوح کے بالکل برعکس یہ ہے کہ معاشرے کی بھلائی کا پُورا کام ایک اجتماعی مشین کرے اور فرد پر اس معاملے میں بالکل اعتماد نہ کیا جائے کہ وہ خود اپنی مرضی سے معاشرے کی بھلائی کے لیے رضا کارانہ کام کرے گا، نہ اُس کے ہاتھ میں کوئی اختیار چھوڑا جائے کہ وہ ایسا کر سکے۔ اس نظام میں خُدا اور رسولؐ کا تصوّر خواہ مخواہ داخل کر کے مشرف بہ اسلام کرنے کی حاجت ہی آخر کیا ہے؟ اسلام بجائے خود ایک مکمل نظام ہے۔ جو فرد اور معاشرے کے درمیان بہترین توازن اور عدل و انصاف قائم کرتا ہے۔ افراد کو فرداً فرداً بہتر انسان بناتا ہے تاکہ وہ معاشرے کے صالح اجزاء بن سکیں اور معاشرے کو بہترین صالح معاشرہ بناتا ہے تاکہ فرد اس کے اندر زیادہ سے زیادہ روحانی و اخلاقی ارتقاء حاصل کر سکے۔ اُس کو ایک قسم کی "اشتراکیت" قرار دینا اس کی توہین ہے۔ اشتراکیت میں اگر خُدا اور رُسولؐ کا تصور داخل کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید مارکسزم کا وہ قرآنی ایڈیشن تیار ہو جائے گا جسے آج کل ایک صاحب نے "نظامِ ربوبیت" کا خوش نُما عنوان دیا ہے۔

س ۱۸: آپ کو اسلامی سوشلزم کی اصطلاح میں کون سی قباحت نظر آتی ہے جبکہ آج کے بین الاقوامی معاشرے میں ہم سینکڑوں یُورپی اصطلاحیں قبول کر چکے ہیں اور ان سے متمتع ہو رہے ہیں؟

ج: جدید اصطلاحوں کو استعمال کرنے کے معاملے میں یہ اُصول ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کون سی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کا اصل مفہوم اسلامی نقطہء نظر سے صحیح ہے اور کون سی اصطلاحیں ایسی ہیں جو اسلامی نقطہء نظر سے غلط ہیں۔ صحیح

اصطلاحوں کو ہم بلا تکلف استعمال کر سکتے ہیں اور غلط اصطلاحوں کو استعمال کرنے سے ہم کو قطعی اجتناب کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ بعض اصطلاحیں ایسی بھی ہیں جن کے مفہوم کا ایک حصّہ صحیح ہے اور دوسرا حصّہ غلط۔ ان کو استعمال کرتے ہوئے ہمیں اُن کے ساتھ لازماً لفظِ اسلامی کا اضافہ کرنا چاہیے۔ تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ ہم اس اصطلاح سے اُس کا وہ مفہوم مراد لے رہے ہیں جو اسلام سے مطابقت رکھتا ہے۔ میری اس تشریح سے آپ یہ بات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو کیوں غلط سمجھتے ہیں۔ اور اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کے استعمال کو کیوں صحیح سمجھتے ہیں۔ سوشلزم ایک اصطلاح ہونے کی حیثیت سے ایک خاص نظام کا نام ہے جو عیسائیت اور بُدھ ازم وغیرہ کی طرح عقیدے اور عمل کے لحاظ سے ایک پُورا مذہب ہے۔ اس کے ساتھ "اسلامی" کا لفظ بڑھا کر "اسلامی سوشلزم" کہنا اُسی طرح غلط ہے جس طرح عیسائیت اور بُدھ ازم کے ساتھ لفظ "اسلامی" کا اضافہ کرکے "اسلامی عیسائیت" یا "اسلامی بدھ ازم" کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ بخلاف اس کے جمہوریت کا یہ مفہوم اسلام کے مطابق ہے کہ حکومت لوگوں کی مرضی سے بنے، چلے اور بدلے اور اس کا یہ مفہوم اسلام کے خلاف ہے کہ جمہُور خود حلال و حرام کے مختار ہوں اور کسی خُدا و رسولؐ کے مقرر کردہ حدود کے پابند نہ ہوں۔ اس بنا پر ہم "مغربی جمہوریت" کے مقابلے میں "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح بجا طور پر استعمال کر سکتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہم جمہوریت سے اس کا وہ مفہوم مُراد لے رہے ہیں جو اسلام سے مُطابقت رکھتا ہے۔

س ۱۱: اس اصطلاح کو صرف اس لیے قبول کر لینے میں عیب کیا ہے؟ کیا اس سے سرمایہ دارانہ استحصالات کی نفی کا تصور اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ ذہن میں فی الفور راسخ

نہیں ہو جاتا ہے؟

ج: سوال نمبر۱۰ کے جواب میں مَیں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو قبول کرنے میں کیا عیب ہے۔ سوشلزم محض سرمایہ دارانہ استحصالات کی نفی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مثبت نظام کا نام ہے۔ جو ایک چیز کی نفی کے ساتھ ایک دوسری چیز کا اثبات بھی کرتا ہے۔ اور اس کی اس نفی و اثبات کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جس وقت ہم "اسلامی سوشلزم" کا لفظ بولیں گے تو اس سے فی الفور ذہن میں سرمایہ دارانہ استحصالات کی نفی کے ساتھ ساتھ سوشلزم کے اثبات کا تصوّر بھی راسخ ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ لفظ "اسلامی" کے اضافے سے جو مطلب نکل سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوشلزم کے مختلف مسالک (Schools of thought) ہی میں سے کوئی ایک مسلک ہے یا بالفاظِ دیگر اسلام کا کوئی نیا ایڈیشن ہے جو کچھ چیزیں اسلام کی اور کچھ چیزیں سوشلزم کی لے کر تیار کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو چیزیں سوشلزم سے لے کر اس نئے ایڈیشن میں اسلام کے ساتھ شامل کی گئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟ اگر ان کی نوعیت یہ ہے کہ اسلام میں کوئی نقص تھا جس کو دُور کرنے کے لیے کچھ ایسی چیزیں سوشلزم سے لے کر شامل کی گئی ہیں جو اسلام میں نہ تھیں تو میری رائے میں ایسے مذہب کو ماننے کا کوئی جواز نہیں ہے جس کو ہم ناقص سمجھتے ہوں۔ اس ناقص مذہب کو چھوڑ کر جو لوگ کوئی مرکب مذہب بنانا چاہتے ہیں جس میں خُدا اور رسول ؐ کے تصور کا اضافہ کر کے اشتراکیت کے اُصول اختیار کر لیے گئے ہوں، اُنھیں چاہیے کہ وہ مسلمانوں میں رہ کر عام مسلمانوں کو دھوکا نہ دیں بلکہ بہائیوں کی طرح سیدھے طریقے سے ایک الگ مذہب بنائیں اور اس کی طرف دُنیا کو دعوت دینا چاہیں تو دیں۔ لیکن اگر وہ اس بات کے پابند ہیں کہ جو چیزیں بھی لی

جائیں وہ قرآن وسُنّت سے مطابقت رکھتی ہوں اور اس کے خلاف نہ ہوں تو اسے آخر سوشلزم کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ قرآن وسُنّت کے مطابق ہے وہ تو خود اسلام ہی ہے۔ اسلام آخر کب سے ایسا دیوالیہ ہوا ہے کہ اس کا سکّہ دنیا میں کسی دُوسرے مذہب کا ٹھپّہ لگائے بغیر نہ چل سکتا ہو۔

س ۱۳: آپ سوشلزم کے تصوّر کو خطرناک سمجھتے ہیں یا جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کی عنان ہے؟

ج: مَیں دونوں ہی کو خطرناک سمجھتا ہوں اور یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے زیادہ خطرناک کون ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ سوشلزم چوں کہ خود خطرناک ہے اس لیے اس کو چلانے کا کام اُنہی لوگوں کے ہاتھ میں جاتا ہے جو خطرناک ہوتے ہیں۔ پھر جب خطرناک تصوّر خطرناک ہاتھوں میں جاتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کو خطرناک تر بناتے چلے جاتے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کو خطرناک بنا رہا ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایک مسلک اگر پاکیزہ ہو تو بُرے لوگوں کا کسی مسلک کی طرف توجّہ کرنا اور آگے بڑھ کر اس کو ہاتھ میں لینا خود اس بات کی علامت ہے کہ اس مسلک کے مزاج میں کوئی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے خُدا کے نیک بندے اس سے دُور بھاگتے ہیں اور بُرے بندے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ تقابل کر کے دیکھیں کہ اسلام کو لے کر اُٹھنے والا کس قدر پاکیزہ انسانؐ تھا اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے کس سیرت و کردار کے لوگ رضؓ تھے، اور اس کے برعکس مارکس کس قسم کا انسان تھا اور اس کی دعوت پر لبیک کہہ کر جو لوگ آگے بڑھے اور جنھوں نے آگے چل کر اس کے مسلک کو عملاً رائج کیا وہ کس سیرت و کردار کے انسان ہیں۔ جب تک کسی انسان کی بنیادی انسانی اقدار ماؤف نہ ہو چکی ہوں وہ ان دونوں کو ایک درجے میں

نہیں رکھ سکتا اور وہ شخص تو بدترین اخلاقی مریض ہی ہوگا جو مارکس اور مارکسیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ پر ترجیح دے۔

س ۱۳: آپ موجودہ سرمایہ دار سوسائٹی کے کس حصے، شق، تصوّر اور سانچے سے متفق ہیں؟ متفق ہیں تو کیوں اور کس لیے؟

ج: موجودہ سرمایہ دارانہ سوسائٹی کو تو میں ایک پھوڑا سمجھتا ہوں۔ اس کے کسی حصے، شق، تصوّر یا سانچے سے اتفاق کا کیا سوال؟ اتفاق کے بجائے مجھے تو اس کے علاج کی فکر ہے اور علاج کے لیے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں ڈاکو کے خنجر کے بجائے ڈاکٹر کا نشتر ہی استعمال کرنے کو صحیح اور برحق سمجھتا ہوں۔

س ۱۴: ہم مسلمان اللہ کو کائنات کا مالک وخالق سمجھتے ہیں۔ تمام انسان اس کی مخلوق ہیں اور یہ مخلوق عیال اللہ ہے۔ تو پھر عیال اللہ، جو اشرف المخلوقات بھی ہے، اس کائنات کے ذرائع پیداوار کی اجتماعی مالک کیوں نہیں؟ پھر اس حقیقت کی نفی سے انفرادی ملکیت کا تصوّر یا جواز کیوں کر پیدا کیا جا سکتا ہے؟ جب مسلمانوں کا معاشرہ اعتقادات وعبادات میں محمود وایاز کے فرق کو تسلیم نہیں کرتا تو اقتصادیات ومعاشیات میں جو زندگی بسر کرنے کا ذریعہ ہیں، اختلافات اور فاصلے پیدا کرنا کس رُو سے جائز ہو سکتا ہے؟

ج: ہم مسلمان اللہ کو اس کائنات کا محض خالق ومالک ہی نہیں سمجھتے بلکہ حاکم بھی مانتے ہیں اور حاکم کی حیثیت سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف اُسی کا یہ حق ہے کہ ہمارے لیے وہ اپنی پیدا کردہ اشیاء (جن کے اندر خود ہمارا جسم اور اس کی قوتیں اور قابلیتیں بھی شامل ہیں) کے استعمال کا قانون اور ضابطہ بھی مقرر کرے۔ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ وہ قانون اور ضابطہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہمیں دیا ہے۔ اس قانون کی رُو سے

اگر ہماری زندگی کے لیے اُصول یہ بتایا گیا ہوتا کہ تمام ذرائع پیداوار اجتماعی ملکیت میں ہونے چاہییں اور انفرادی ملکیت میں نہیں ہونے چاہییں تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پابندی کرنا ہمارا فرض ہوتا اور ہمارے رسُولؐ اور اُن کے خُلفائے راشدینؓ نے پُوری معاشی زندگی کو اجتماعی ملکیت میں چلا کر دکھایا ہوتا تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے وہ نمونہ بنے۔ لیکن جو شخص بھی قرآن اور سنّت کو پڑھے گا اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ نہ ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لینے کا کوئی تصوّر وہاں موجود ہے اور نہ عہدِ رسالتؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں ایسا کوئی نظام قائم کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہاں پُوری معاشی زندگی کا نقشہ ایک پابندِ حدود آزاد معیشت کا نقشہ نظر آتا ہے جس میں ذرائع پیداوار کو افراد کی ملکیت میں رکھ کر تمیزِ حلال و حرام، انفاق فی سبیل اللہ، زکوٰۃ، وراثت، وصیّت وغیرہ کے احکام دیے گئے ہیں۔ مزید برآں قُرآن و سُنّت میں عبادات (جن کے اندر زکوٰۃ اور حج بھی شامل ہیں) اخلاق، معاشرت اور سیاست و تمدّن کا جو نظام پیش کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام اجتماعی ملکیت کے بجائے انفرادی ملکیت کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے اور اِس نظام میں فرد کی اخلاقی و روحانی ترقی اس کے بغیر ہو نہیں سکتی کہ وہ اپنی معیشت میں آزاد ہو اور قانونی جبر کے بجائے اپنے دِلی جذبے سے اپنی دولت کو خُدا اور اس کے دین اور والدین اور رشتے داروں اور ہمسایوں اور سائل و محروم اور پُورے معاشرے کے حقوق ادا کرنے میں صرف کرے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک طرف عہدِ رسالت سے لے کر اس دَور تک تمام فقہا، محدّثین اور مفسّرین انفرادی ملکیت ہی کا تصوّر پیش کر رہے ہیں اور دُوسری طرف اجتماعی ملکیت کے نظام کا یہ نیا تصور ملکیت مغرب کے کچھ ایسے لوگوں نے پیش کیا ہے جو

نہ صرف یہ کہ خدا اور رسولؐ کی طرف رہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع نہیں کرتے بلکہ سرے سے خدا اور رسالت کے منکر ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ استحصال کرنے والے طبقوں نے اپنی اغراض کے لیے خدا اور رسالت اور وحی کا افسانہ گھڑا ہے تاکہ غریب عوام کو افیون کھلا کر سُلا دیں اور جو پیداواری نظام ان کی اغراض کے لیے مفید ہے اس کو مذہبی سَند فراہم کریں۔ اب آخر یہ بات کوئی عقل مند کیسے تصوّر کر سکتا ہے کہ قرآن کا اصل منشا ران لوگوں نے سمجھا ہو اور عہدِ رسالت سے لے کر آج تک پُوری اُمّت قرآن کے اس منشا رتک پہنچنے میں ناکام رہی ہو؟

س ۱۵: پاکستان میں ان لوگوں کی تعداد کیا ہو گی جو سوشلزم اور کمیونزم کے لیے مخفی و جلی کوششوں میں سرگرم کار ہیں؟

ج: آپ کے اس سوال کا جواب اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کم از کم جلی گوشوں میں ان لوگوں کی مردم شماری ہو جائے اور مخفی گوشوں میں ان کی تلاش و جستجو کر کے ان کی تعداد معلوم کی جائے۔ رہا اندازہ اور تخمینہ۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اصلی سوشلسٹ اور کمیونسٹ۔ جو سوچ سمجھ کر علمی حیثیت سے مطالعہ کرنے کے بعد اس فلسفے پر ایمان لائے ہوں، ہمارے معاشرے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ زیادہ تر جو لوگ ان کے بُھرّے میں آ کر اشتراکیت کا دم بھرتے ہیں وہ چار قسموں پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ جو فیشن کے طور پر ہر نئے نعرے کے پیچھے دوڑنے والے ہیں۔ دُوسرے وہ جنھوں نے مجمل طور پر بس یہ سمجھ لیا ہے کہ موجودہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کی زیادتیوں سے نجات کا مجرب نسخہ وہ سوشلزم ہے جو معاشی مساوات کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ تیسرے وہ جو دراصل اسلام کی اخلاقی قیود سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ چوتھے مزدوروں اور کسانوں وغیرہ کا وہ عنصر جسے کمیونسٹوں نے یہ سبز باغ دکھایا ہے کہ ان کی رہنمائی توڑ پھوڑ اور گھراؤ جیسے

ہتھکنڈے استعمال کر کے وہی کارخانوں اور زمینوں کا مالک ہوجائے لیکن اس بات سے وہ بے چارا بے خبر ہے کہ یہ سبز باغ آخر کار کالا باغ ثابت ہوگا۔ یہ چاروں طبقے بھی بہ حیثیت مجموعی ہمارے معاشرے میں ایک بہت ہی چھوٹی اقلیت ہیں۔

عام مسلمان خواہ اپنے اعمال میں کیسا ہی بگڑا ہوا ہو، بہرحال وہ ان دینی تعلیمات اور اقدار پر یقین رکھتا ہے جو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ سے ملی ہیں۔ خود مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

س ۱۶۶: کیا یہ واقعہ نہیں کہ ملک کا نشریاتی، اطلاعاتی اور مطبوعاتی نظام بڑی حد تک لادین عناصر بالفاظ دیگر (Fellow Travellers) کے ہاتھ میں رہا ہے اور انھوں نے ہماری نئی پود کے ذہن میں تہذیبی انتشار اور دینی تنفر پیدا کیا ہے؟

ج: مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے اور اس پر میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ ہمارے ملک کا غیر اسلامی تعلیمی نظام بھی اس میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

س ۱۶۷: آپ باور کرتے ہیں کہ کسی کو اس غرض سے غیر ملکی امداد مل رہی ہے؟

ج: میرے پاس یہ معلوم کرنے کے ذرائع نہیں ہیں کہ ان لوگوں کو کوئی غیر ملکی امداد مل رہی ہے یا نہیں۔ میں کسی ذریعہ علم کے بغیر کسی پر کوئی الزام لگانے کا عادی نہیں ہوں۔

س ۱۶۸: اِس الزام کا مصنّف و محرک کون ہے کہ جماعت اسلامی کو امریکہ امداد دے رہا ہے؟ اس کے پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ الزام ہمارے اُوپر ایک مدّت سے لگایا جا رہا ہے اور اس کا مصنّف اور محرک کوئی ایک نہیں ہے بلکہ مختلف گوشوں سے یہ الزام اُن تمام لوگوں نے لگایا ہے جنھیں ہماری وہ کوششیں ناگوار ہیں جو اسلامی نظام قائم کرنے

کے لیے ہم انتیس (۲۹) سال سے کر رہے ہیں۔ وہ ہر جھوٹے سے جھوٹا الزام لگانے کے لیے آزاد ہیں کیوں کہ انھیں اس امر کی کوئی فکر لاحق نہیں ہے کہ کوئی الزام کسی پر لگانے کی بازپُرس بھی کہیں ہونی ہے اور کوئی خُدا بھی ہے جس کے سامنے ان کو کبھی اپنے اقوال واعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ ان کے لیے یہ بالکل حلال ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو نیچا دکھانے کے لیے جو الزام بھی کارگر ہوتا نظر آئے بے تکلف لگا دیں قطع نظر اس سے کہ اس کی کوئی بنیاد ہو یا نہ ہو۔ اب سے چند سال پہلے جب خان حبیب اللہ خان، اُس وقت کے وزیرِ داخلہ نے علانیہ یہ الزام ہم پر لگایا تھا اُس موقع پر مَیں نے ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے چند باتیں کہی تھیں جن کو یہاں دُہرا دینا مَیں کافی سمجھتا ہوں۔ میں نے اُس تقریر میں کہا تھا:

"ایک مُلک کے ذمّے دار وزیر کے لیے یہ نہایت شرمناک بات ہے کہ وہ بغیر کسی ثبوت کے اپنے ملک کی کسی جماعت یا کسی شخص کے بارے میں اس طرح کا الزام لگائے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس اس کا کوئی ذرّہ برابر بھی ثبوت ہے تو وہ لے کر آئے۔ کسی عدالت میں پیش کرے اور اس الزام کو ثابت کرے۔"

یہ بات مَیں نے ۲۴ نومبر ۶۳ء کو ڈھاکہ میں پلٹن میدان کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہی تھی اور یہ تقریر اُسی زمانے میں ڈھاکہ کی جماعت اسلامی نے پمفلٹ کی شکل میں شائع بھی کر دی تھی۔ اس میں یہ چیلنج مَیں نے اس بنا پر دیا تھا کہ ملک میں پولٹیکل پارٹیز ایکٹ موجود تھا اور اب بھی موجود ہے جس کی رُو سے کوئی ایسی پارٹی اس ملک میں از رُوئے قانون کام نہیں کر سکتی جو کسی بیرونی طاقت سے مدد لیتی ہو۔ نیز مَیں نے یہ چیلنج وزیرِ داخلہ کو دیا تھا کیوں کہ ان سے زیادہ کسی کے پاس ایسے ذرائع موجود نہیں ہو سکتے تھے کہ اس الزام کو ثابت کریں اگر اس کی کوئی

حقیقت ہو۔ آگے چل کر اس تقریر میں مَیں نے یہ بھی کہا تھا:

"میری نظر میں یہ الزام نہ صرف شرمناک ہے بلکہ یہ ملک کی آبرو مٹا دینے والی چیز ہے۔ دنیا کی قومیں سوچیں گی کہ پاکستان کے لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے اندر ہر ایک بکاؤ مال ہے، باہر کی جو قوم چاہے ان کے ہاں کی کسی جماعت کو خرید لے یا کسی لیڈر کا سودا کرے۔ کیا یہ ملک کی عزّت کو خاک میں ملا دینے والی بات نہیں ہے کہ آپ ساری دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سارے کے سارے بکاؤ مال ہیں اور غیروں کو یہ اُمید دلاتے ہیں کہ وہ یہاں آکر لوگوں کو خریدتے پھریں؟ میں پُوچھتا ہوں کہ اگر باہر کے لوگ مجھ کو اور جماعت اسلامی کو خرید سکتے ہیں تو جناب نے کیوں نہ خرید کر دکھا دیا؟ اس سولہ سال کی مدّت میں کوئی ایک شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے یا جماعت اسلامی کو خرید سکا ہے۔ بہت سے بکاؤ مال اس ملک میں پڑے ہوئے ہیں جو حکمرانوں کے ہاتھ بکے ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ کون کون بکے ہیں۔ لیکن جماعتِ اسلامی خدا کے فضل آج تک کسی کے ہاتھ نہیں بکی ہے۔ اگر جماعت اسلامی کو باہر کے لوگ خرید سکتے تھے تو سب سے پہلے گھر والے کیوں نہیں خرید کر دکھا دیتے؟ جو کچھ مَیں نے اس تقریر میں کہا تھا وہی آج بھی کہتا ہوں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ جسے نہ خُدا کی شرم ہو نہ خلق کی اُس کی زبان دنیا میں کون بند کر سکتا ہے؟"

س ۱۹: ہمارے ملک کے کچھ لیڈر عدم تشدّد پر یقین نہیں رکھتے اور کھلے بندوں تشدّد کی تلقین کرتے اور خانہ جنگی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ہم ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ کیوں کر؟

ج: ہم ان سے صرف اسی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات دُرست کریں اور اسلام اور غیر اسلام کا فرق واضح طور پر انھیں سمجھائیں۔

س ۲۰: جماعت اسلامی میں اتنی طاقت ہے کہ ان کا مقابلہ کر سکے؟

ج : جماعت اسلامی نے کبھی اپنی طاقت پر بھروسا نہیں کیا۔ اس کا بھروسا ہمیشہ سے اللہ اور اس کے دینِ حق کی طاقت پر ہے۔

س ۲۱۰ : ایسا ممکن ہے کہ اسلام پسند طاقتیں اکٹھی ہوں ؟

ج : یہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ ایسا ہونا چاہیے۔ اگر اس وقت وہ اکٹھے نہ ہوئے تو پھر اور کون سا وقت آئے گا جب وہ اکٹھے ہوں گے۔

س ۲۱۱ : ممکن ہے تو ان کے اتحاد کی صورت کیا ہو گی ؟

ج : اتحاد کی عملی صورتیں بہت سی ہو سکتی ہیں جن کو باہمی مشورے سے اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن شرطِ اوّل یہ ہے کہ جو لوگ بھی یہاں اسلام چاہتے ہیں وہ اخلاص کے ساتھ صرف اسلام اور خالص اسلام کی سربلندی کے لیے متحد ہوں اور اپنے شخصی اور گروہی تعصبات کو خدا اور اس کے دین کی خاطر دل سے نکال دیں۔

س ۲۱۲ : کیا یہ واقعہ نہیں کہ پاکستان میں اسلام دوستوں کی بے پناہ اکثریت ہے لیکن ان میں اتفاق نہیں۔ اتفاق نہ ہونے کا باعث کیا ہے ؟ کیا انھیں کوئی طاقت استعمال کر رہی ہے یا ان کی اپنی نظر فروعات میں اُلجھی ہوئی ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سبب ہے ؟

ج : اتفاق نہ ہونے کے بہت سے اسباب ہیں۔ کچھ لوگوں کی نظر فروعات میں اُلجھی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ طرح طرح کے تعصبات میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ اسلام کے معاملے میں پُوری طرح مخلص نہیں ہیں اور اسلام کے ساتھ غیر اسلام کا جوڑ لگانا مناسب یا ضروری سمجھتے ہیں لیکن صاف صاف اس کو ظاہر کرنے سے بچنا بھی چاہتے ہیں۔ رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا کسی گروہ کو کوئی طاقت استعمال کر رہی ہے تو اس کے بارے میں میرے پاس کوئی ذریعۂ معلومات نہیں ہے اور میں قرآن کے اس ارشاد پر ایمان رکھتا ہوں کہ :

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ.....

س ۲۴: مغربی اور مشرقی پاکستان میں کیمونسٹوں کے اثرات کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ یعنی وہ کون کون سے ادارے ، گوشے اور کمین گاہیں ہیں جہاں سے انھیں نشوو نما پانے کی آب و ہوا میسّر آ رہی ہے ؟

ج : برصغیر ہند و پاکستان میں ظاہر ہے کہ کیمونزم باہر سے آیا ہے ۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ دُنیا میں متعدد ملک ایسے ہیں جن کے اندر کیمونسٹ نظام قائم ہے اور کم از کم دو بڑی طاقتیں ایسی ہیں جو تمام دُنیا میں کیمونزم پھیلانے اور کیمونسٹ انقلاب برپا کرانے کے لیے کوشاں ہیں ۔ اس بات سے بھی کوئی ناواقف نہیں ہے کہ غیر کیمونسٹ ممالک میں جہاں بھی کیمونسٹ بالائے زمین یا زیرِ زمین کام کر رہے ہیں ان کو پارٹی لائن باہر ہی سے ملتی ہے جس کے مُطابق ان کی پالیسیاں بنتی اور بدلتی ہیں ۔ اس کے بعد مَیں آپ کو کیا بتاؤں کہ ہمارے ملک میں کیمونزم کے اثرات کا سرچشمہ کہاں ہے ؟

س ۲۵: آپ کو معلوم ہے کہ کیمونسٹ ہر کہیں اقلیّت میں ہوتے ہیں ۔ اشتراکی انقلاب کے لیے عوام کے اذہان میں تنفّر پیدا کرتے ، ملک میں بدامنی پھیلاتے ، نوجوانوں کو نعروں کی دل فریبی سے مسحور کرتے ، بڑے بڑے تصادمات کی راہ کھولتے ، ملک کی حکومت سے جمہوری عناصر کو مرواتے ، ان پر قاتلانہ حملے کرواتے ، ان کے اداروں کو تاراج کرتے ، جھوٹ بولتے ، جھوٹ پھیلاتے ، جُھوٹ کو سچائی کا لبادہ اوڑھا کر ایک زبردست بحران پیدا کرتے اور تب حکومت پر قابض ہو کر اپنی سیادت کا نقش جماتے ہیں ۔ ان کی جارحانہ اقلیت ہمیشہ اسی رنگ ڈھنگ سے کسی ریاست پر قبضہ کرتی اور اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد مخالفوں کا قتلِ عام کرتی ہے ۔ یہی فضا یہاں پیدا کی جا رہی ہے ۔ پاکستان میں کوئی لیڈرشپ یا کوئی تنظیم اتنی طاقت و رہے جو ان کا مقابلہ کر سکے ؟

ج : پاکستان میں کوئی لیڈر شپ یا کوئی تنظیم ان کے مقابلے کی طاقت رکھتی ہے یا نہیں، اِس کے بارے میں تو مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ پاکستان کے عام مسلمانوں کے دِلوں میں اسلام کے اثرات اتنی گہری جڑوں سے جمے ہوئے ہیں کہ اِن شاء اللہ یہاں کمیونسٹوں کے ہتھکنڈے کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ مَیں نے دنیا کے مختلف مسلمان ممالک کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ تین ملک ایسے ہیں جن میں اسلام کے اثرات کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہیں اور ان کا مقابلہ کمیونسٹ اپنے کسی ہتھکنڈے سے نہ کر سکیں گے۔ ایک پاکستان، دُوسرے تُرکی اور تیسرے سوڈان۔

س ۲۶: اسلام پسند انقلابی طاقتوں کو جو اس ملک میں واقعی اسلام لانا چاہتی ہیں کن طریقوں سے لادین عناصر کی اس کھیپ کا مقابلہ کرنا چاہیے؟

ج : جو طاقتیں یہاں اسلام لانا چاہتی ہیں ان کا مزاج چونکہ اسلامی ہے اور اسلام زور زبردستی یا زیرِ زمین کام کرنے کے بجائے تبلیغ و تلقین کے ذریعے کُھلّم کُھلّا اصلاحِ حق کی کوشش کرنے کا طریقہ بتاتا ہے، اس لیے وہ ہر بے دین تحریک کا مُقابلہ انہی طریقوں سے کریں گی، اور ہمیں یقین ہے کہ آخر کار یہی طریقہ کار کارگر ثابت ہوگا۔ اگر ہم اپنے ملک کے عوام اور خواص کی عام رائے کو اس بات پر مطمئن کر دیں کہ ان کے تمام مسائل کا بہترین حل اسلام میں موجود ہے اور دُوسرے تمام طریقے اِن مسائل کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ اُلجھا دینے والے ہیں تو کوئی طاقت انھیں گمراہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور کسی طاقت کی زبردستی بھی نہ چل سکے گی۔

س ۲۷۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اشتراکیوں کی ذہنی یلغار کے مقابلے میں وہ تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو جائیں جو اسلام کے وسیع تر حلقے میں ہیں اور جن کے سامنے نظریۂ پاکستان

کی اساس ہے ؟

ج : جی ہاں یہ ممکن ہے اور نہ صرف ممکن ہے بلکہ ایسا ہونا چاہیے ۔

س ۲۸ : کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم تعلیمی اداروں ، نشریاتی شعبوں اور اخباری تنظیموں سے کمیونسٹوں کے اخراج پر زور دیں تاکہ ہماری نئی نسل کو وہ ان ذرائع سے گمراہ نہ کرسکیں ؟

ج : جی ہاں یہ ضروری ہے ۔ ان لوگوں کا عمل دخل مذکورہ بالا اداروں میں جس حد تک رہا ہے اس کے بدترین نتائج پچھلے دنوں ہمارے سامنے آچکے ہیں ۔ اس کے بعد بھی اگر اس مرض کے علاج کی فکر نہ کی گئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آگے اور کن نتائج سے ہمیں دو چار ہونا پڑے گا ۔

س ۲۹ : سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی متشددانہ کارروائیوں ، خانہ جنگی کو مواد دینے والی تقریروں اور بیانوں کے سدّباب کا طریق کیا ہے ؟ ان سے کیوں کر نپٹا جائے ؟ واضح رہے کہ کمیونسٹوں کے نزدیک اخلاق اور اس کے ضوابط کوئی معنی نہیں رکھتے ۔ صداقت محض ایک مفروضہ ہے ۔

ج : ہم تشدّد کے مقابلے میں تشدّد اختیار کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے ، کیوں کہ اس سے وہ مقصد آپ سے آپ پُورا ہو جائے گا جو خانہ جنگی کی دعوت دینے والوں کے پیشِ نظر رہا ہے ۔ ہمارے نزدیک اسلام کی حامی طاقتوں کو مدافعت پر اکتفا کرنا چاہیے جس کا انھیں بہرحال حق حاصل ہے ۔ اور ان کی زیادتیوں کا جواب تشدّد سے دینے کے بجائے ملک کی عام رائے کو جمہوری طریقوں سے اسلام کے حق میں ہموار کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے ۔

س ۳۰ : اس ملک میں کارخانے داروں اور جاگیرداروں کی اجتماعی ذہنیت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے ؟

ج : افسوس ہے کہ اُن کی اجتماعی ذہنیت اسلام کی راہ سے منحرف ہے ۔ جن اسباب نے اس ملک میں غیر اسلامی نظریات کے فروغ کی راہ ہموار کی ہے اس میں بہت بڑا حصہ انہی لوگوں کی غلط روش کا ہے ۔

س ۱۳: اُس لیڈر شپ سے جو ملک کے جمہوری محاذ سے پیدا ہوئی آپ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی نظریاتی سرحدوں کو تحفظ دے سکتی ہے ؟

ج : اس ملک کی نظریاتی سرحدوں کو تحفّظ صرف وہی لیڈر شپ دے سکتی ہے جو اخلاص اور صحیح فہم و ادراک کے ساتھ اسلام کے برحق ہونے کا یقین بھی رکھتی ہو اور یہ بھی سمجھتی ہو کہ اسلام اور صرف اسلام ہی پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل سبب ہے ۔ اُسی کی بدولت ایک ہزار میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود اس ملک کے دونوں بازو ایک ملک بنے ہیں ، وہی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اصل حدِ فاصل ہے اور اُسی کی رُوحِ جہاد تھی جس نے اُس عظیم خطرے سے ملک کو بچایا جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پیش آیا تھا ۔

تصحیح

سوال نمبر ۱۲ کا جواب صحیح طور پر شائع نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے عبارت میں اُلجھاؤ پیدا ہو گیا ہے ۔ مکمل عبارت حسبِ ذیل ہے جس میں شائع نہ ہو سکنے والا حصہ خط کشیدہ ہے :

" مَیں دونوں ہی کو خطرناک سمجھتا ہوں اور یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے زیادہ خطرناک کون ہے ، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ سوشلزم چوں کہ خود خطرناک ہے اس لیے اس کو چلانے کا کام انہی لوگوں کے ہاتھ میں جاتا ہے جو خطرناک ہوتے ہیں ۔ پھر جب خطرناک تصور خطرناک

ہاتھوں میں جاتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کو خطرناک تر بناتے چلے جاتے ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کو خطرناک بنا رہا ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایک مسلک اگر پاکیزہ ہو تو بُرے لوگ کبھی اُس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ بُرے لوگوں کا کسی مسلک کی طرف توجہ کرنا اور آگے بڑھ کر اس کو ہاتھ میں لینا خود اس بات کی علامت ہے کہ اس مسلک کے مزاج میں کوئی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے خدا کے نیک بندے اس سے دُور بھاگتے ہیں اور بُرے بندے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ تقابل کر کے دیکھیں کہ اسلام کو لے کر اُٹھنے والا کس قدر پاکیزہ انسان ﷺ تھا اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے کس سیرت و کردار کے لوگ رضؓ تھے اور اس کے برعکس مارکس کس قسم کا انسان تھا اور اس کی دعوت پر جو لوگ لبیک کہہ کر آگے بڑھے اور جنہوں نے آگے چل کر اس کے مسلک کو عملاً رائج کیا وہ کس سیرت و کردار کے انسان ہیں۔ جب تک کسی انسان کی بنیادی انسانی اقدار ماؤف نہ ہو چکی ہوں وہ ان دونوں کو ایک درجے میں نہیں رکھ سکتا۔ اور وہ شخص تو بدترین اخلاقی مریض ہی ہوگا جو مارکس اور مارکسیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ پر ترجیح دے۔"

(ہفت روزہ چٹان لاہور، ۲۱ اپریل ۱۹۴۹ء)

اسلام کا اجتماعی فلسفۂ حیات ہر زمانے کے لیے ہے

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب نے اٹلی کی سرکاری ٹیلی ویژن کمپنی کو دنیا میں اسلام (Islam in the World) کے موضوع پر یہ انٹرویو دیا جو ہفت روزہ "ایشیا" لاہور مورخہ ۱۷؍ اپریل ۱۹۶۹ء کو شائع ہوا۔

برِّصغیر میں اسلام کی آمد

س : برِّصغیر میں اسلام کی آمد پر یہاں کے باشندوں کو کس چیز نے اپیل کیا؟

ج : برِّصغیر میں اسلام پہلی صدی ہی میں آگیا تھا۔ پہلی صدی سے میری مُراد پہلی صدی ہجری ہے۔ اس زمانے میں اسلام کو دو مذہبوں سے سابقہ پیش آیا۔ ایک بُدھ مت دُوسرے ہندو مذہب۔ بُدھ ازم ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو رہبانیت سکھاتا ہے اور ہندو ازم ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو طبقات میں تقسیم کرتا ہے، ایسے مُستقل طبقات میں جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ ہندو ازم شرک و بُت پرستی پر مبنی ہے۔ اسلام جب آیا تو اُس نے یہاں ایک طرف توحید کا عقیدہ پیش کیا۔ دُوسری طرف اس نے طبقاتی تقسیم کو باطل ثابت کیا اور تمام انسانیت کی

وحدت پر زور دیا۔ تیسری طرف اس نے انسان کو یہ بتایا کہ اس کی ترقی کا فطری راستہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت نہیں ہے۔ بلکہ اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے خدا اور اس کے بندوں اور خود اپنے نفس کے حقوق ادا کرنا ہے۔ جو اثرات اسلام نے برِ صغیر کے باشندوں پر ڈالے ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جہاں اسلام کی آمد سے پہلے ایک مسلمان بھی موجود نہ تھا وہاں آج کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے ذہن کو اسلام کی تعلیم توحید نے، وحدت انسانی کے تخیل نے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے پروگرام نے اپیل کیا۔

جدید دَور کے لیے اسلام کا اجتماعی فلسفہ

س: جدید دَور کے لیے اسلام کا اجتماعی فلسفہ حیات کیا ہے؟

ج: اسلام کا اجتماعی فلسفہ حیات ہر زمانے کے لیے ہے۔ وہ جدید دَور کے لیے بھی اسی طرح صحیح اور دُرست ہے جس طرح قدیم دَور کے لیے تھا، اور آئندہ آنے والے ہزاروں سال کے لیے رہے گا۔ اس کا فلسفہ حیات اس تصور پر مبنی ہے کہ انسان کے لیے صحیح رویۂ زندگی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی و اطاعت اور اس قانون کی بندگی و اطاعت اور اس قانون کی پَیروی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ چوں کہ یہ ساری کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور انسان فطری طور پر اس کا بندہ ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں انسان کے لیے صحیح رویّہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ خُدا کی بندگی اور اطاعت کریں اور اس قانون کی پَیروی کریں جو اس کائنات کے بنانے والے نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ یہی طریقِ زندگی ہر زمانے کے لیے ٹھیک، صحیح اور دُرست ہے۔ جب کبھی انسان نے اس سے انحراف کیا، اس کو ایسے پیچیدہ مسائل سے سابقہ

پیش آیا جن کو وہ اپنی عقل سے کبھی صحیح طور پر حل نہ کر سکا۔ موجودہ دَور میں جو تمدن اور تہذیب کا نظام پایا جاتا ہے وہ چوں کہ خُدا کی اطاعت سے منحرف اور اس کے قانون سے بے نیاز ہے اس لیے اس نے بھی بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کے حل کرنے پر انسان قادر نہیں ہو رہا ہے۔

مثلاً، آج خاندانی زندگی کا نظام موجودہ تہذیب ہی کی وجہ سے درہم برہم ہو رہا ہے۔

مثلاً، اسی تہذیب و تمدن کی بدولت رنگ اور نسل کے امتیازات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ دُنیا میں کبھی انسانیت پر اتنا ظلم و ستم نہیں ہوا جتنا اس رنگ و نسل کے امتیاز کی بدولت آج ہو رہا ہے۔

مثلاً، اس تہذیب نے نیشنل ازم کا طوفان برپا کر دیا جس کی بدولت دنیا میں دو عظیم الشان لڑائیاں ہو چکی ہیں اور مزید ہوتی نظر آ رہی ہیں۔

یہ سب کچھ اسی وجہ سے تو ہے کہ انسان نے علوم طبیعی کی طرح اپنی اجتماعی زندگی کے لیے بھی اپنی عقل ہی کو کافی سمجھ لیا ہے اور اپنی زندگی کا نظام اپنی عقل سے تصنیف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس فطری نظام کو اختیار کیا جائے جو انسان کے لیے خُدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے تو یہ مسائل کبھی پیدا نہ ہوں، اور اگر کبھی پیدا ہو بھی جائیں تو ان کو آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

نسل اور رنگ کا مسئلہ

س: نسل اور رنگ کا مسئلہ اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

ج: نسل اور رنگ کے مسئلے کے پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ آدمی محض اپنی جہالت اور تنگ نظری کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ جو شخص کسی خاص نسل یا ملک یا قوم میں پیدا

ہوگیا ہے وہ کسی ایسے شخص کے مقابلے میں زیادہ فضیلت رکھتا ہے جو کسی دوسری نسل یا قوم یا کسی دُوسرے ملک میں پیدا ہوا ہے۔ حالاں کہ آدمی کی پیدائش ایک اتفاقی امر ہے۔ اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسلام ایسے تمام تعصبات کو جاہلیت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام انسان ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور انسان اور انسان کے درمیان فرق کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں بلکہ اس کے اخلاق ہیں۔ اگر ایک انسان اعلیٰ درجے کے اخلاق رکھتا ہے تو خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ افریقہ میں پیدا ہوا ہو یا امریکہ میں یا ایشیا میں بہر حال وہ قابلِ قدر انسان ہے۔ اور اگر ایک انسان اخلاق کے اعتبار سے بُرا آدمی ہے تو خواہ وہ کسی جگہ پیدا ہوا ہو اور اس کا رنگ خواہ کچھ ہی ہو اور اس کا تعلق خواہ کسی نسل سے ہو، وہ ایک بُرا انسان ہے۔ اسی بات کو ہمارے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت اگر ہے تو وہ تقوے کی بنا پر ہے۔ جو شخص خُدا کی صحیح صحیح بندگی کرتا ہے اور خدا کے قانون کی صحیح صحیح پیروی کرتا ہے، خواہ وہ گورا ہو یا کالا بہر حال وہ اس شخص سے افضل ہے جو خُدا ترسی اور نیکی سے خالی ہو۔ اسلام نے اسی بنیاد پر تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹایا ہے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو ایک قرار دیتا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے سب کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ قرآن وہ پہلی کتاب ہے جس نے انسان کے بنیادی حقوق کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے تمام انسانوں کو جو کسی مملکت میں شامل ہوں، ایک جیسے بنیادی حقوق عطا کیے ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست چوں کہ ایک نظریہ اور اُصول (Ideology) پر قائم ہوتی ہے۔ اس لیے اس نظریے کو جو لوگ مانتے ہوں اِسلامی ریاست کو

چلانے کا کام انہی کے سپرد کیا جاتا ہے۔کیوں کہ جو لوگ اسے مانتے اور سمجھتے ہیں وہی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے اسلام تمام ان لوگوں کو یکساں تمدنی حقوق ادا کرتا ہے جو کسی اسلامی ریاست میں رہتے ہوں۔اسی بنیاد پر اسلام نے ایک عالم گیر اُمّت (World Community) بنائی ہے جس میں ساری دنیا کے انسان برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔حج کے موقع پر ہر شخص جاکر دیکھ سکتا ہے کہ ایشیا، افریقہ، امریکہ، یُورپ اور مختلف ملکوں کے لاکھوں مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں پایا جاتا۔ان کو دیکھنے والا ایک ہی نظر میں یہ محسوس کر لیتا ہے کہ یہ سب ایک اُمّت ہیں اور ان کے درمیان کوئی معاشرتی امتیاز نہیں ہے۔اگر اِس اُصول کو تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں رنگ و نسل کی تفریق کی بنا پر آج جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا یک لخت خاتمہ ہو سکتا ہے۔

شراب اور سُود کی حرمت

س : شراب اور سُود کی حُرمت کے کیا وجوہ ہیں؟

ج : سب سے پہلے آپ شراب کے مسئلے پر غور کریں۔علمی بنیاد پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ الکوہل انسان کے جسم کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور عقل کے لیے بھی۔اس وقت دنیا میں الکوہلزم ایک خطرناک مسئلے کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔بکثرت انسان ایسے ہیں جو الکوہلزم کی بدولت عملاً اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کھو چکے ہیں اور معاشرے کے لیے ایک مسئلہ بن چکے ہیں۔اس بات کو بھی مانا جاتا ہے کہ دنیا میں بکثرت حادثات (Accident) اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ آدمی کے خون میں اگر ایک خاص مقدار میں الکوہل موجود ہو اور اس حالت میں وہ گاڑی چلائے

تو اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے اور دُوسرے انسانوں کے لیے بھی خطرہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس پر کوئی اتفاق نہیں ہو سکا ہے کہ وہ خاص مقدار کون سی ہے جس کا پایا جانا ذہنی توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ الکوہل ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو متوازن نہیں رہنے دیتی۔ اسی وجہ سے اسلام نے الکوہل کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا ہے۔ آج تک کوئی شخص یہ طے نہیں کر سکا ہے کہ کتنی مقدار میں الکوہل ہر شخص کے لیے مُضر ہے اور کتنی مقدار میں غیر مُضر۔ یہ نسبت مختلف انسانوں کے معاملے میں مختلف ہوتی ہے اور کوئی ایسا قاعدہ کُلّیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ فلاں خاص مقدار تک الکوہل کا استعمال تمام انسانوں کے لیے یکساں مُضر ہوگا اور اس سے زائد مقدار سب کے لیے ہی مُضر ہوگی۔ اسی لیے اِسلام نے یہ اُصول قرار دیا ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کی کم سے کم مقدار بھی حرام ہے۔ کیوں کہ اس کی کم مقدار کو حلال قرار دینے کے بعد کوئی خط ایسا نہیں کھینچا جا سکتا جہاں جواز کی حد ختم ہو سکے اور عدم جواز کی حد شروع ہو جائے۔ لہٰذا قابلِ عمل صورت یہی ہے کہ اس کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اسلام کے سوا کوئی دُوسرا مذہب یا نظامِ تہذیب ایسا نہیں ہے جس نے انسان کو الکوہلزم سے بچانے میں وہ کامیابی حاصل کی ہو جو اسلام نے حاصل کی ہے۔ امریکہ نے اسی صدی میں اس بات کی کوشش کی تھی کہ امریکی قوم کو شراب کے نقصانات سے بچایا جائے۔ چناں چہ امریکی دستور میں ایک ترمیم کے ذریعے سے شراب کو ممنوع قرار دیا گیا لیکن یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ شراب کا سائنٹفک معیار پر مضر ہونا پہلے ثابت ہو گیا تھا اور بعد میں اس کا غیر مُضر ہونا ثابت ہو گیا، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امریکہ کی حکومت اور اس کا پُورا قانونی نظام اپنا سارا زور لگا کر بھی لوگوں کو شراب چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ یہ دراصل امریکی

تہذیب کے نظام کی کمزوری تھی۔ اس کے برعکس اسلام کا تہذیبی نظام اتنا طاقت ور تھا کہ ایک حکم مسلمانوں کو شراب سے روک دینے کے لیے کافی ہوگیا اور اس حکم میں آج تک اتنی طاقت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اب بھی شراب سے اجتناب کے معاملے میں مسلمانوں کی برابری نہیں کرسکتی۔

جہاں تک سُود کا تعلق ہے وہ تمام آسمانی شریعتوں میں وہ ہمیشہ سے حرام رہا ہے۔ آج بھی بائیبل میں اس کی حُرمت کا حکم موجود ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مَیں آج سے سُود کو حلال قرار دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیت نے بھی اس حکم کو برقرار رکھا جو پہلے سے بائیبل میں سُود کی حرمت کے لیے موجود تھا۔ اگر سُود کسی وقت بھی حلال کیا گیا ہوتا تو اس کا ثبوت موجود ہوتا کہ فلاں پیغمبر نے یا خُدا کی فلاں کتاب نے اس کو حلال قرار دیا ہے۔ لیکن میرے علم میں نہیں ہے کہ کبھی خُدا کی کسی کتاب میں اس کے حلال ہونے کا حکم آیا ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ سُود کیوں حرام ہے؟ اس کے بارے میں یہ اُصولی بات سمجھ لینی چاہیے کہ انسان ان چیزوں کی بُرائی کو تو جان سکتا ہے جو جسمانی حیثیت سے اس کے لیے نقصان دہ ہوں لیکن وہ آج تک کبھی یہ جاننے پر قادر نہیں ہوا ہے کہ کونسی غذائیں اس کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور روحانی حیثیت سے اس کے لیے نقصان دہ ہیں۔ غذاؤں کے اخلاقی اثرات ملننے اور ٹھیک ٹھیک ان کو متعین کرنے کے ذرائع انسان کو حاصل نہیں ہیں۔ اسی لیے یہ کام خُدا نے اپنے ذمّے لیا ہے کہ جو چیزیں انسان کے اخلاق اور اس کی رُوح کے لیے نقصان دہ ہیں ان کی نشان دہی وہ خود کردے اور انھیں حرام قرار دے۔ اب اگر کوئی شخص خُدا پر اعتماد کرتا ہو تو اسے وہ چیزیں چھوڑ دینی چاہئیں جن سے اس نے منع کیا ہے اور جو خُدا پر اعتماد نہ رکھتا ہو وہ جو کچھ چاہے کھاتا رہے۔

ایک اہم اِنٹرویو

یہ اُس انٹرویو کے سوالات اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کے جوابات کا مکمل متن ہے جو ۱۹۶۹ء میں ایک اخباری نمائندے نے مولانا محترم سے لیا اور بعد میں ہفت روزہ "آئین" لاہور کی اشاعت ۲۸ر جولائی ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

س: پاکستان میں اسلام ہی کیوں ناگزیر ہے ؟

ج: پاکستان میں اسلامی نظام اس لیے ناگزیر ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام کے حق ہونے پر اگر ہمارا ایمان ہے تو ہم اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے اسلام کے سوا کسی اور نظام کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ پاکستان تو خاص طور پر بنا ہی اسلام کے لیے ہے۔ اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ یہ ملک وجود میں آتا۔ اب ۲۲ سال کے بعد یہ سوال اُٹھانا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہو یا کوئی غیر اسلامی نظام نافذ ہو، ان لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ غدّاری ہے جنھوں نے اس ملک کے بنانے کے لیے اپنی جانیں، مال اور آبروؤں کو قربان کیا اور ہندوستان کے ان کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ بھی غدّاری ہے جنھوں نے محض اسلام کے نام پر

پاکستان قائم کرنے کی خاطر اس کے قیام کی تحریک میں حصہ لیا۔ اور آج تک وہ اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں اسلام اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اسلامی نظام کے سوا اس ملک کے مختلف اجزا کو جوڑ کر رکھنے اور اسے ایک ملک بنائے رکھنے کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں۔ جس وقت یہاں اسلام کے سوا کوئی اور نظام لانے کی کوشش کی گئی فوراً ہی بنگالی بنگالی ہو کر رہ جائے گا پنجابی پنجابی ہو کر رہ جائے گا، پٹھان اور سندھی اور بلوچ سب عناصر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے اور بالآخران میں سے کسی کی آزادی بھی باقی نہیں رہے گی اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ یہاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ صاف صاف بنگالیت، پٹھانیت، سندھیت اور پنجابیت کے تعصبات اُبھارتے ہیں کیوں کہ ان کا مدعا ان نعروں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور کوئی دوسرا نظام اگر پاکستان میں آسکتا ہے تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی آسکتا ہے۔

س: آپ نے اسلامی نظام کے لیے کیا لائحہ عمل تجویز کیا ہے؟

ج: ہم اس مقصد کے لیے ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک سالہا سال سے چلا رہے ہیں۔ اسلامی نظام چوں کہ ایک ہمہ گیر نظام ہے جو افراد اور معاشرے اور ریاست کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہے، اس لیے اس کو برپا کرنے کی خاطر محض کسی ایک پہلو میں جدّوجہد کرنا کارگر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عوام میں بھی اسلام کا علم پھیلانا ضروری ہے اور تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان کا رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ ہر طبقے کو اس کی فہم اور استعداد کے مطابق اسلام کا نظام سمجھانا ضروری ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اسلام جو ہدایات دیتا ہے اور ہر شعبے کی جس طرح تشکیل کرتا ہے اس کی

وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔ عوام کے اخلاقی بگاڑ کو روکنا اور ان میں اسلامی اخلاق پیدا کرنا بھی اس لائحہ عمل کا ایک اہم حصہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ملک کے اندر ایک ایسا جمہوری نظام موجود ہو جس میں عوام کی رائے کے مطابق نظامِ حکومت بنے۔ جتنی جتنی عام رائے اسلامی نظام کے لیے تیار ہوتی جائے اتنی ہی زیادہ صحیح اسلامی حکومت بنتی چلی جائے گی۔ جماعت اسلامی ان سارے پہلوؤں میں کام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

س: آپ کے نزدیک اسلامی نظام کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں؟

ج: ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان میں صرف اسلامی نظام ہی کی کامیابی کے امکانات ہیں اور کسی نظام کی کامیابی کے امکانات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی مسلمان آبادی کا کم از کم ننانوے فی صد حصہ وہ ہے جو اسلام کے حق ہونے پر یقین رکھتا ہے اور اس سارے بگاڑ کے باوجود جو پچھلی صدیوں میں ہمارے معاشرے کے اندر پیدا ہوا ہے اس کی روایات میں اسلام بہت گہری جڑوں کے ساتھ رچا اور بسا ہوا ہے۔ یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ملک کی آبادی کے اس عظیم حصے کی روایات اور اس کے جذبات اس کے ساتھ ہوں گے۔ کوئی دوسرا نظام لانے کی کوشش کی جائے گی تو ملک کے عوام کی ذہنی اخلاقی اور روحانی تائید اس کے ساتھ نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک قلیل التعداد گروہ کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں اور غیر آئینی تدبیروں سے کام لے کر زبردستی اس نظام کو ملک پر مسلّط کرنا پڑے گا اور مسلط کرنے کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک وہ اپنی قوم کے عقائد اور روایات و جذبات سے لڑتا رہے گا۔ یہ نادانی جس مسلمان ملک میں بھی کی گئی ہے۔ اس کے نہایت خراب نتائج رونما ہوئے ہیں اور کسی قسم کی ترقی کرنے کے بجائے ان ملکوں کی حکومتیں اپنی ہی قوم سے

لڑنے میں اپنی قوتیں ضائع کرتے ہیں۔ چناں چہ دشمنوں سے جب سابقہ پیش آیا تو معلوم ہوگیا کہ انھوں نے اپنے ملک اور اس کی طاقت کو کتنا مضبوط کیا۔

ایک دُوسرے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہاں اسلامی نظام کو برپا کرنے کی راہ میں سخت مشکلات حائل ہیں اور وہ روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ اگر پاکستان بننے کے بعد ہی ان وعدوں کو پُورا کیا جاتا جو پاکستان کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں سے کیے گئے تھے اور جلدی سے جلدی ایک اسلامی دستور بنا کر ملک کے نظامِ تعلیم، نظامِ قانون، نظمِ ونسق اور معاشی نظام میں وہ اصلاحات شروع کردی جاتیں جو اسلامی اُصولوں کے مُطابق کرنی چاہیے تھیں تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ لیکن یہاں پچھلے بیس بائیس سال ہر پہلوے زندگی کے نظام کو انہی خطوط پر چلاتے رہے جن پر انگریز اس کو چلا رہا تھا۔ بلکہ مزید کچھ خرابیاں باہر کے ہر اس ملک سے درآمد کی گئیں جن سے ہمیں کچھ اقتصادی امداد اور کچھ فوجی امداد حاصل ہوئی۔ ساری قوتیں یہاں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو دبانے میں صرف کی گئیں اور ہر اُس گمراہی کو پھیلنے اور پھُولنے کا موقع دیا گیا جو گھر کے اندر سے اُٹھی یا باہر کہیں سے درآمد ہوئی۔ اس چیز نے ہمارے ملک کو اس وقت ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہمارے لیے اپنی اسلامی روایات کی طرف پلٹنا ہی مشکل ہوگیا ہے اور کسی غیر اسلامی نظام کا بھی کامیابی کے ساتھ چلنا ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک شدید تفرقے میں مبتلا ہوگئے ہیں اور یہ تفرقہ بڑھ رہا ہے اور جتنا جتنا یہ بڑھتا جارہا ہے ہمارے قدم تباہی کے راستے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

س: دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے اسلام کیا ضروری اقدامات تجویز کرتا ہے؟ اور کیا ان کے نفاذ کے لیے عوامی تحریک کی ضرورت ہے؟

ج: دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے سب سے پہلا ضروری اقدام اسلامی نقطۂ نظر

سے یہ ہے کہ:

سُود کو بند کیا جائے۔

دولت کے ان تمام ذرائع کو ممنوع کیا جائے جنھیں اسلام نے حرام کیا ہے۔

جو دولت ناجائز طریقوں سے ایک محدود سے محدود طبقے میں مرکوز ہوگئی ہے اس کو اِسلامی احکام اور اُصولوں کے مطابق از سرِ نو پُورے معاشرے میں پھیلانے کا انتظام کیا جائے۔

اس اصلاح کے لیے صرف ایک "عوامی تحریک" کامیاب نہیں ہوسکتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جمہوری طریقے سے ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت وجود میں آئے جو اسلام کے قوانین کو پُوری طاقت کے ساتھ نافذ کرے۔ آئینی طریقِ کار کے بغیر محض کسی عوامی تحریک کے ذریعے سے معاشی نظام کو بدلنے کی جو کوشش بھی کی جائے وہ بآسانی فساد کی راہ اختیار کرسکتی ہے اور یہاں وہ عناصر بھی موجود ہیں جو اس تحریک کو فساد کی راہ پر ڈالنے کے لیے بے چین ہیں۔ اس کے نتیجے میں دولت کی منصفانہ تقسیم تو نہ ہوسکے گی البتہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ جتنی کچھ بے انصافیاں اس وقت پائی جاتی ہیں ان سے زیادہ بے انصافی کا کوئی نظام قائم ہوجائے! اسی لیے ہم ملک میں ایک صحیح جمہوری نظام بحال کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں تاکہ آئینی تدابیر سے معاشی نظام کی اصلاح ہوسکے۔

س: کیا سوشلزم کو اسلام کا معاشی نظام یا اسلام کا جزو قرار دیا جاسکتا ہے؟ نیز اسلامی سوشلزم کو اسلامی مساوات کہنا کس حد تک صحیح ہے؟

ج: سوشلزم کو اسلام کا معاشی نظام یا ایک جزو قرار دینا یا "اسلامی مساوات" کے لیے اسلامی سوشلزم کا لفظ استعمال کرنا یا تو ان لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو نہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ سوشلزم کو، یا پھر یہ ان لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو دراصل

لانا تو چاہتے تھے سوشلزم، لیکن اس پر اسلام کا لیبل لگانا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے مسلمانوں کو اسلام کا نام لیے بغیر فریب میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں کو خود سوچنا چاہیے کہ جو چیز عین اسلام ہو اور قرآن و سنّت کے احکام اور تعلیمات سے ماخوذ ہو، اس کو اسلام کے سوا اور کوئی نام دینے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ اور اگر کوئی چیز باہر سے لائی جائے جو اسلام میں نہیں ہے اور جن کا کوئی ماخذ بھی قرآن و سنّت میں نہیں پایا جاتا تو پھر اسلام کا لیبل لگانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس کو تو پھر اسی نام سے یاد کرنا چاہیے جو دنیا میں اس کا معروف نام ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جو اسلام چاہتا ہو وہ اسلام ہی کا نام لے اور کسی دوسرے ازم کو اس کے ساتھ خلط ملط نہ کرے۔ اور جو کوئی دوسرا ازم چاہتا ہو تو ایک راست باز آدمی کی طرح جو کچھ چاہتا ہے صاف صاف کہے اور خواہ مخواہ کی دھوکے بازیاں نہ کرے۔

س: یہ الزام کس حد تک صحیح ہے کہ آپ صرف سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی محافظت کرتے ہیں؟

ج: مَیں نے ہمیشہ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں پر لعنت بھیجی ہے اور ہمیشہ دونوں کی علانیہ مخالفت کی ہے۔ میری تحریروں میں دونوں پر سخت تنقیدیں موجود ہیں۔ لیکن جو لوگ سوشلزم کے حامی ہیں اُنھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہر اس شخص کو سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کا یا امریکہ یا برطانیہ کا ایجنٹ قرار دیں گے جو یہاں اسلامی نظام چاہتا ہے۔ اسلام کو وہ گالی دے نہیں سکتے۔ ایک آدھ مرتبہ "اسلام مُردہ باد" کا نعرہ لگا کر اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے اسلامی نظام کے حامیوں کو گالی دینے کے لیے کوئی اور تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ انھیں سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کا ایجنٹ یا امریکہ اور برطانیہ کا ایجنٹ قرار دیں۔

س : مُسلم ممالک میں ہرجلہ اشتراکیت کے عَلم بردار اور دینی جماعتوں اوراسلامی رہنماؤں کوامریکہ کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات کس حد تک قرینِ انصاف ہے ؟

ج : اشتراکیوں کی زبان ساری دُنیا میں یکساں ہے ۔ دُنیا میں جہاں بھی اشتراکی بات کرتا ہے ایک ہی طرح کی اصطلاحیں بولتا ہے ، ایک ہی طرح کے محاورات استعمال کرتا ہے اور اپنے مخالفوں کو گالیاں دینے کے لیے بھی اس کی ایک ہی مخصوص زبان ہے ، وہی زبان ہمارے ملک میں بھی یہ گروہ استعمال کر رہا ہے ۔ سرمایہ داروں کا ایجنٹ ، سامراج کا ایجنٹ ، امریکہ کا پٹھو ، اور اسی طرح کی دوسری گالیاں ان لوگوں کا تکیہ کلام ہیں ، اور ان کے ہاں چوں کہ حصولِ مقصد کے لیے ہر تدبیر استعمال کرنا بالکل حلال ہے اسی لیے کسی کو کسی کا ایجنٹ یا پٹھو قرار دینے کے لیے ان کو کسی دلیل یا ثبوت یا شہادت کی حاجت نہیں ۔ جس طریقے سے بھی اپنے مخالف کو بدنام کرنا ممکن ہو اس سے یہ بے تکلّف کام لیتے ہیں ۔ پھر سامراج بھی ان کے ہاں صرف امریکی اور برطانوی ہے ۔ باقی رہا سُرخ سامراج تو اس کا ایجنٹ بننا کوئی گناہ نہیں بلکہ سراسر قابلِ فخر ہے ۔ اسی طرح جاگیردار اور سرمایہ دار صرف وہ ہے جو اشتراکیت کی مخالفت یا اسلامی نظام کی حمایت کرے قطع نظر اس کے کہ وہ ایک چپہ زمین کا مالک ہو یا نہ ہو ۔ اور سرمایہ داری کی اس غریب کو کوئی ہَوا بھی نہ لگی ہو ۔ باقی رہے ہزارہا ایکڑ کے مالک اور کروڑوں روپے کے سرمایہ دار تو اشتراکیت کا کلمہ بلند کرتے ہی وہ نہ جاگیردار رہتے ہیں نہ سرمایہ دار ۔

س : آپ کے مخالفین ، آپ پر انبیائے کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کی توہین کا الزام لگاتے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے ؟

ج : جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ سارا ملک اَن پڑھ اور جاہلوں سے بھرا ہوا ہے اور یہاں کوئی اس قابل نہیں ہے کہ میری تحریروں کو پڑھ کر

ان کا مطلب سمجھ سکے۔ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کہیں ناپید نہیں ہے۔ ہر جگہ لائبریریوں میں مل سکتا ہے اور بازاروں میں موجود ہے۔ ملک پڑھے لکھے لوگوں سے خالی نہیں ہوگیا ہے۔ وہ ان کتابوں کو خود پڑھ کر یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ یہ الزامات کہاں تک صحیح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایسے بے بنیاد الزامات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا اور نہ جواب دینے کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہوں (پھر جو حضرات میرے اوپر توہینِ صحابہؓ کا الزام لگاتے ہیں ان پر خود علماء کے ایک گروہ نے توہینِ خدا تک کے الزامات لگائے ہیں) یہاں میں ایک بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ اخبارات میں ان لوگوں کے بیانات سے جن لوگوں کو غلط فہمی لاحق ہو، میں ان کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ جو الزام بھی مجھ پر لگاتے ہیں ان کا حوالہ معلوم کرلیں اور میری اس تحریر کو سیاق و سباق کے ساتھ خود پڑھ کر دیکھ لیں، جن کا حوالہ وہ دیں۔ حوالے کے معاملے میں بھی بعض حضرات نے یہ چال چلنی شروع کی ہے کہ وہ "ترجمان القرآن" کے پچھلے پرچوں کے حوالے دیتے ہیں، حالاں کہ وہ ساری چیزیں جن کا وہ ذکر کرتے ہیں کتابوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن کتاب کا نام وہ اس لیے نہیں دیتے کہ لوگ اصل کتاب حاصل کرکے پڑھ لیں گے۔ پرانے پرچوں کو کون ڈھونڈتا پھرے گا۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ جن حضرات کو انبیاء کرامؑ اور صحابہؓ کی عزت کی بڑی فکر ہے، انھیں پہلے اگر شرحِ صدر ہوتا تھا تو پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کے ساتھ ہوتا تھا اور اب اگر ان کا دل ملتا ہے تو سوشلسٹوں کے ساتھ ملتا ہے۔ سارے کیڑے ان کو صرف انہی لوگوں میں نظر آتے ہیں جو یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کام کرتے ہیں۔ باقی رہے تقسیم سے پہلے کی کانگرس اور تقسیم کے بعد کے اشتراکی، تو ان کے اندر انھیں پورا اسلام جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ان کے اس نوع کے الزامات کی حقیقت اور وزن کیا ہے؟

علمائے مراکش کے سوالات

رابطۃ العلماء، مراکش کے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی تنظیم ہے۔ اس کے سربراہ مراکش کے نامور عالم دین اور ادیب شہیر استاذ عبداللہ کنون ہیں۔ طنجہ میں اس تنظیم کا مرکز ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ مراکش کے تمام دینی حلقے بلا استثناء اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ "المیثاق" کے نام سے اس کا ایک ہفتہ وار اخبار طنجہ سے نکلتا ہے۔ رابطۃ العلماء کا ایک وفد سکرٹری جنرل شیخ ابن سعید العلوی کی قیادت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب سے ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء کو ملا۔ اس وفد کی طرف سے مولانا محترم کی خدمت میں ایک سوال نامہ پیش کیا گیا۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں جوابات دیے۔ ان کا ترجمہ جناب خلیل حامدی نے کیا جو نومبر ۱۹۶۹ء کے ماہنامہ ترجمان القرآن، میں شائع ہوا۔

س: آپ ہمیں جماعت اسلامی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج: جماعت اسلامی کو قائم ہوئے ۲۸ سال ہو چکے ہیں۔ اس جماعت کا مقصد اسلام کو اس کی پوری شکل اور روح کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو میں قائم کرنا ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو اخلاق اور معاشرت سے، یا تمدن و تہذیب سے یا سیاست اور معیشت سے، یا صلح و جنگ سے۔ ہم دین کو ایک

پُورا نظامِ زندگی سمجھتے ہیں۔ اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کرتے اور اس کے کسی شعبے کو دُوسرے شعبے کی بہ نسبت کم قدر و قیمت کا حامل نہیں مانتے۔ اس دین کو پُوری طرح قائم کرنے کے لیے جماعت اسلامی ہر میدان میں کام کر رہی ہے۔ وہ عقاید اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں ہے۔ سیاسی نظام کی اصلاح کی کوشش بھی کر رہی ہے اور اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لیے تمام ممکن تدابیر عمل میں لا رہی ہے۔

س: کیا پاکستان میں اور بھی اسلامی تحریکیں ہیں؟ اور کیا ان کے درمیان تعاون و یک جہتی ہے؟

ج: دُوسری اسلامی تحریکیں بھی پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ ایک تحریک علماء میں کام کر رہی ہے جس کا نام اتحاد العلماء ہے۔ ایک اور تحریک طلبہ میں کام کر رہی ہے جس کا نام اسلامی جمعیت طلبہ ہے۔ ایک اور تحریک کسانوں میں کام کر رہی ہے جس کا نام کسان بورڈ ہے۔ ایک اور تحریک مزدوروں میں کام کر رہی ہے جس کا نام لیبر آرگنائزیشن ہے۔ جماعت اسلامی کا اب ان سب کے ساتھ بہت گہرا تعاون ہے۔ اس کے علاوہ متعدد سیاسی جماعتیں ملک میں قائم ہیں جو اپنا مقصد جمہوریت اور اسلامی نظام کا قیام قرار دیتی ہیں۔ سیاسی میدان میں جماعت اسلامی اور ان کے درمیان تعاون ہو رہا ہے۔ ملک میں علماء کی بھی متعدد جماعتیں ہیں، جن میں سے صرف ایک اشتراکیت کی حامی ہے اور ہر معاملے میں اشتراکیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ باقی تمام جماعتیں ان کی اس پالیسی کی مخالف ہیں، اور علماء کی عظیم اکثریت اسلامی نظام کے قیام کی خواہاں ہے اور اس کے لیے کوشاں ہے۔

س: جماعتِ اسلامی نے کتنی کتابیں شائع کی ہیں اور کتنے اخبارات و رسائل

جاری کیے ہیں ؟

ج: جماعت اسلامی نے اب تک تقریباً دو سو سے زائد کتابیں شائع کی ہیں جو قریب قریب معاشرے کے ہر عنصر کی ضروریات اور حالات کو پُورا کرتی ہیں۔ کچھ اہلِ علم کے لیے ہیں اور کچھ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے۔ کچھ اہلِ سیاست کے لیے ہیں اور کچھ اہلِ قانون کے لیے۔ کچھ عوام کے لیے ہیں اور کچھ عورتوں اور بچوں کے لیے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کا لٹریچر ۱۹ زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہا ہے جن میں سے تین یورپین زبانیں ہیں، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی۔ کچھ ایشیائی زبانیں ہیں، عربی، فارسی، ترکی، انڈونیشی اور جاپانی۔ کچھ افریقی زبانیں ہیں، سواحلی اور ہاؤسا۔ اور باقی برِصغیر ہند و پاکستان کی زبانیں ہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مختلف لوگ بنگلہ، انگریزی، اُردو اور سندھی میں متعدد ہفتہ وار، ماہوار اور دو ماہہ پرچے شائع کر رہے ہیں۔ ایک خاص پرچہ ماہوار عورتوں کے لیے اور ایک ماہانہ بچوں کے لیے ہے۔

س: کیا جماعت کے اندر عورتوں کی کوئی تنظیم بھی ہے ؟ اس کی سرگرمیوں اور طریق کار کی کیا تفصیل ہے ؟

ج: جماعت کی ایک شاخ مستقل طور پر عورتوں کے لیے ہے جن کے اجتماعات مَردوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ان میں عورتیں ہی قرآن و حدیث کا درس دیتی ہیں اور عورتوں میں اشاعتِ دین کا کام کرتی ہیں۔ مَردوں کے اجتماعات میں اگر عورتیں مدعو کی جائیں تو وہ پردے کے پیچھے بیٹھتی ہیں۔ جماعت سے تعلق رکھنے والی خواتین حجابِ شرعی کی پُوری پابندی کرتی ہیں اور بے پردگی کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان میں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی شامل ہیں

جن میں سے بعض علوم عصریہ میں ایم۔اے ہیں اور بعض ڈاکٹرنیاں بھی ہیں۔ یہ سب مَردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی سے بے پردگی سے قطعی مجتنب ہیں۔ وہ غیروں کے سامنے سر اور مُنہ بھی نہیں کھولتیں جسے عرب ملکوں نے حلال کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں جو عورتیں مغربی تہذیب میں غرق ہو چکی ہیں وہ بھی منی اسکرٹ نہیں پہنتیں اور نہ غسل کے لباس میں علانیہ نہاتی ہیں۔ پُورے پاکستان میں آپ کو ایک مسلمان عورت بھی ایسی نہیں ملے گی جو اسکرٹ استعمال کرتی ہو چہ جائیکہ منی اسکرٹ۔ بے شک انھوں نے سر کھول دیا ہے اور بانہیں بھی برہنہ کر لی ہیں لیکن غنیمت ہے کہ ایران، ترکی اور عرب ممالک کی طرح ابھی تک ان کی پنڈلیاں نہیں کھُلی ہیں۔

س: آپ نے جن اسلامی ملکوں کا دَورہ کیا ہے اُن میں اسلام سے انحراف کس حد تک پایا جاتا ہے اور اُس انحراف کو ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

ج: تمام بلادِ اسلامیہ میں جہاں بھی مَیں گیا ہوں وہاں یا تو اسلام سے کُھلا کُھلا انحراف پایا جاتا ہے یا اگر اسلام کا اعتقاد اور اس سے محبّت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش موجود ہے تو وہ زبان اور عمل کے تناقض کی شکار ہے۔ یہی اصل غفلت ہے۔ اِس حالت کو بدلنے کا طریقہ میرے نزدیک وہی ہے جسے جماعتِ اسلامی نے پاکستان میں اختیار کر رکھا ہے۔

س۔ وہ کون سا بنیادی طریقِ کار ہے جسے مسلم اقوام کو اختیار کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی حکومتوں سے یہ تسلیم کرائیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی، عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی، مصحف بھی ہے اور سیف بھی؟

ج: تمام مسلمان قوموں کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں اور ان کے حکّام پر یہ بات واضح کر دیں (جس طرح بھی مختلف ملکوں کے حالات میں ممکن ہو) کہ جب تک وہ

اسلام کے مطابق کام نہیں کریں گی اُس وقت تک اُن کو کسی پہلو میں بھی قوم کی تائید حاصل نہ ہوسکے گی۔ کوئی حکومت بھی دنیا میں نہ طاقت ور ہوسکتی ہے نہ کام یاب، جب تک اس کی پالیسی قوم کے عقیدے اور ضمیر سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ جو حکومت اپنی قوم کے ضمیر اور عقیدے کے خلاف چلتی ہے اس کی ساری قوتیں اپنے ہی گھر میں اپنی ہی قوم کے خلاف لڑنے میں ضائع ہوجاتی ہیں اور اس کا کوئی قدم ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کی نمایاں ترین مثال اسرائیل کے مقابلے میں عرب ریاستوں کی پے درپے شکستیں ہیں جو ۴۸ء سے وہ مسلسل کھا رہی ہیں، حالاں کہ اسرائیل میں یہودیوں کی تعداد ڈھائی ملین سے زیادہ نہیں ہے اور عرب ۱۱۰ ملین ہیں۔ اگر اس پر بھی مسلمان حکمرانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو یہ مزید تباہیوں کو دعوت دینے کی ہم معنی ہے۔ اللہ ان لوگوں کو اپنی تائید سے محروم کردیتا ہے جو اس کی کتاب رکھتے ہوئے بھی اس سے مُنہ موڑ رہے ہوں۔

س: تعلیمی کانفرنس کی قراردادوں اور فیصلوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج: قراردادیں اور سفارشیں ساری اچھی ہیں۔ مَیں نے خود بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مَیں نے اپنی آخری تقریر میں کہا ہے، اصل چیز تنفیذ ہے اور ان کی تنفیذ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ بلادِ اسلامیہ میں جو لوگ مختلف جامعات کو چلا رہے ہیں ان کے اندر اخلاص اور اسلامی رُوح موجود ہو اور وہ فی الواقع عمل کا ارادہ کریں۔

س: مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کے لیے آپ کون سے بنیادی خطوط تجویز کرتے ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے فیصلے صادر کرے؟

ج: اس بات کو مَیں اپنی اس تقریر میں بیان کرچکا ہوں کہ سانحۂ مسجد اقصیٰ کے عنوان پر میں نے حال میں کی ہے اور جس کا عربی ترجمہ مراکش کے بعض اخبارات میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ اب سے دو تین سال پہلے میں نے ۱۳-۱۴

تجاویز اُس وقت پیش کی تھیں جب صومالی لینڈ کے صدر اور شاہ فیصل کی طرف سے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد کرنے کی تحریک ہوئی تھی۔ مَیں نے اُن تجاویز میں متعدد ایسے مسائل کی نشان دہی کی تھی جو تمام عالمِ اِسلامی کے مشترک مفاد سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں مسلمان حکومتیں مِل کر ہی حل کر سکتی ہیں۔

س: شاہ حسن ثانی کے عام مواقف اور خاص طور پر اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ان کی دعوت کے بارے میں پاکستانی مسلمانوں کے تاثرات کیا ہیں؟

ج: اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کی شکست کے موقع پر جتنے بیانات بھی عالمِ اسلامی کے اکابر کی طرف سے شائع ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ جس بیان کو پاکستانیوں نے پسند کیا وہ مولائی حسن الثانی کا بیان تھا۔ اور اب پُورا پاکستان سربراہوں کی اس کانفرنس کے انعقاد پر شاہ حسن کی تعریف کر رہا ہے اور دُعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی میں برکت عطا فرمائے۔

س: عالمِ اسلامی اور علی الخصوص مراکش میں پائے جانے والے اخلاقی انحطاط اور فسق و فجور کے مظاہر کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

ج: بلادِ عربیہ اور بعض دُوسرے بلادِ اسلامیہ میں عورتوں کی بے پردگی اور بے حیائی کا فتنہ جس حد کو پہنچ گیا ہے اور علانیہ فسق و فجور کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں انھیں دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید مسلمان اُس عذاب کو بھی کافی نہیں سمجھتے جو مغربی استعمار کی شکل میں اُن پر نازل ہوا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اُس نے اِس عذاب سے اُن کو نجات دے دی، وہ کسی مزید اور سخت تر عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ خصوصاً مجھے عربی بولنے والی قوموں پر سخت حیرت ہوتی ہے جن کی زبان میں قرآن

نازل ہوا ہے اور جن کی زبان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ وہ براہِ راست خود دیکھ سکتے ہیں کہ عورتوں کے متعلق اللہ اور رسولؐ نے کیا ہدایات دی ہیں؟ غیر عرب مسلمان تو پھر بھی یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ وہ قرآن وحدیث کی زبان سے ناواقف ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ عرب خُدا کے سامنے اس بے حیائی کے لیے کیا عذر پیش کریں گے جو ان کی موجودہ نسل اختیار کر رہی ہے۔

س : رابطۃ العلماء کے ارکان کے لیے آپ کی نصیحت اور مشورہ کیا ہے؟

ج : رابطۃ العلماء کو میری نصیحت یہ ہے کہ یا تو وہ خود ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اُٹھیں اور اپنے بل بوتے پر اقامتِ دین کی دعوت اہلِ مراکش کو دیں، یا اگر کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ تعاون کریں تو اس شرط کے ساتھ کریں کہ وہ تناقض اور نفاق سے بَری ہو کر سیدھا سیدھا اسلام قائم کرنے کے لیے تیار ہو۔ اُس کی پالیسی بنانے میں علماء کو دخیل ہونا چاہیے۔ علماء کی یہ حیثیت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ فقط سیاسی پارٹیوں کے دُعاگو بن کر رہیں یا اپنے اثر سے مسلمانوں میں اُن کا اعتماد تو قائم کر دیں مگر اُن کی پالیسی بنانے میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علماء علومِ عصریہ سے واقفیت پیدا کریں تاکہ موجودہ نوجوان نسل کو وہ سمجھ سکیں اور ان کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ اگر علماء نے اس معاملے میں غفلت برتی تو صرف پُرانے طرز کے دین دار اُن کے ساتھ رَہ جائیں گے اور نئی نسل کو راہِ راست دکھانے میں وہ ناکام ہو جائیں گے۔ علماء کو یہ استعداد اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے کہ وہ نئی نسل کو اپنی بات سمجھا سکیں اور ان کی ذہنیت کے مُطابق اُن کی تفہیم کر سکیں۔

دعوتِ اسلامی کی رفتارِ کار

روزنامہ العَلَم مراکش کے عربی جرائد میں سب سے زیادہ مقبول اور کثیر الاشاعت پرچہ ہے۔ مراکش کی استقلال پارٹی کی طرف سے نکلتا ہے۔ فاس (مراکش) میں قیام کے دوران اس اخبار کے نمائندے نے مولانا مودودی مدظلّہ العالی سے زَلّاغ ہوٹل میں ایک انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا ترجمہ جناب خلیل حامدی نے کیا ہے اور یہ پہلی مرتبہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

س: آپ دنیا میں اس وقت سب سے نمایاں اور ممتاز اسلامی رہنما اور داعی ہیں، آپ کی رائے میں اس وقت دعوتِ اسلامی کس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

ج: دعوتِ اسلامیہ کو تمام مسلمان ملکوں میں ایک ہی صورتِ حال سے سابقہ درپیش ہے اور وہ یہ ہے کہ استعمار نے اپنے براہِ راست اور بالواسطہ اثرات سے ہر جگہ ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو علمی اور فکری حیثیت سے اسلام سے بہت بعید اور عادات و اخلاق اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے قریب قریب بالکل اجنبی ہو گیا ہے۔ یہی طبقہ استعمار کے زمانے میں یا تو حکومت کے مناصبِ عالیہ پر قابض ہوا یا آزادی کی تحریکوں میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کا رہنما بنا۔ پھر جب استعمار

سے مسلمان ممالک آزاد ہوئے تو اس طبقے کے ہاتھ میں ہر جگہ حکومت کی باگیں منتقل ہوگئیں۔ اب یہ طبقہ ہے تو مسلمان قوموں ہی کے افراد میں سے لیکن اس کے جذبات، خیالات اور عادات سب مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ وہ اگر مستعمرین کے نظامِ سرمایہ داری سے ہٹ کر کوئی چیز سوچ سکتا ہے تو وہ نظام اشتراکی ہے۔ کیوں کہ جو علوم اس نے حاصل کیے اور جو عادات اس نے اختیار کی ہیں ان کے لحاظ سے وہ اِن دو ہی مسلکوں میں سے کسی ایک مسلک کا تصور کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس عام مسلمان اور ان کے مذہبی طبقے فطری طور پر ہر جگہ آزادی کے طالب اس لیے ہوئے تھے کہ اُسی نظامِ اسلامی کو تازہ کریں جس سے استعمار نے انھیں محروم کیا تھا اور آزادی کے بعد وہ قدرتی طور پر اُس چیز کے متوقع تھے کہ ایسا ہو۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا ہے اور اسی کی وجہ سے تمام مسلمان ملکوں میں از سرِ نو ایک نزاع برپا ہوگئی ہے۔ جو استعمار کے خلاف جدّ و جہد کی بہ نسبت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ عام مسلمان ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اسلامی نظام چاہتے ہیں اور اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو یہ نہیں چاہتے۔ اگر فیصلہ بندوق کے بجائے انتخابات میں لوگوں کے ووٹوں سے ہوتا تو ہر جگہ پُرامن طریقے سے اس مسئلے کا فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن قریب قریب ہر جگہ ووٹ کے بجائے مال اور طاقت دونوں کو فیصلہ کُن بنا دیا گیا ہے اور عام باشندے آئے دن کے انقلابات کے تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی صورتِ حال نے عربوں کو اسرائیل کے مقابلے میں بے بس کر دیا ہے۔ اور اسی صورتِ حال نے غیر عرب مسلمان ملکوں کے اندر بھی تمام حکومتوں کو کمزور کر کے رکھ دیا ہے۔ مستقبل کا سارا انحصار اس پر ہے کہ آیا مسلمان ملکوں میں جمہوریت اپنی صحیح شکل میں نافذ ہوتی ہے یا نہیں۔ یعنی دُوسرے الفاظ میں آیا مسلمان ملکوں کے عوام کو اپنی قسمت کے فیصلے کا آزادانہ حق مل جاتا ہے یا نام نہاد انقلابی آمر خود اپنی قوموں کا مستقبل طے کرتے رہتے ہیں۔

پہلی صُورت میں مستقبل انشاء اللہ شاندار ہے اور اگر دوسری صورت جاری رہی تو اِنّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون ۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان ملکوں کا حشر کیا ہوگا ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آخر کار پھر اپنی آزادی کھو دیں ۔

س : اِسلامی تحریک کے لیے اچھے اور کار آمد داعی اور کارکُن تیار کرنے کے لیے کون سے وسائل اختیار کرنا ضروری اور مفید ہے ؟

ج : سب سے زیادہ اہم چیز تو یہ ہے کہ جو لوگ بھی اسلامی دعوت کا کام کریں وہ اس دعوت کی حقیقت و ماہیت کو اچھی طرح جان لیں ۔ دُوسری چیز یہ ہے کہ علم کے بعد پُورے اخلاص کے ساتھ اس دعوت کے اُصول و مبادی پر ایمان لائیں ۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ وہ اُن تمام شرائط کو پُورا کریں جو دنیا کی کسی تحریک کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں ۔ یعنی توحیدِ صفوف ، منظّم کام ، اور حکمت و تدبر کے ساتھ اپنی دعوت کو آگے بڑھانے کے لیے حالات و ظروف کے مطابق مسلسل سعی ۔

س : جماعت اسلامی نے آج تک دعوتِ اسلامی کے بارے میں کتنے مراحل طے کیے ہیں اور ملک اور ملک کے باہر اب تک جماعت نے کیا کیا کام سرانجام دیے ہیں ؟

ج : سب سے پہلے ہم نے اپنے خیالات وسیع پیمانے پر پھیلائے ۔ پھر چند سال کے بعد جب ایک معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی جو اِن خیالات کو صحیح سمجھتے تھے تو ان کی تنظیم و تربیت کا کام کیا گیا ۔ اس کے بعد جیسے جیسے لوگ اس دعوت کے لیے کام کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے گئے ہم نے اپنی مساعی کو چار اہم شعبوں میں صرف کرنا شروع کر دیا ۔ ایک ، تطہیرِ افکار اور تعمیرِ افکار ۔ دُوسرے صالح افراد کی تلاش ، تنظیم اور تربیت ۔ تیسرے ، اصلاحِ معاشرہ ۔ اور چوتھے ، نظامِ حکومت کی اصلاح اور اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کی کوشش ۔ کئی سال گزرنے کے بعد ہم نے دُنیا کی مختلف زبانوں میں اپنے لٹریچر کے تراجم اور اشاعت کا انتظام کیا ۔

اس وقت ترکی، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں اچھی خاصی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے اثرات تمام اُن ملکوں میں پھیل رہے ہیں جہاں یہ زبانیں بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ جہاں تک نظامِ حکومت کی اصلاح کا تعلق ہے، اسلام کو پاکستان کے دستور کی بنیاد تسلیم کرایا جا چکا ہے جس سے اب ہٹنا کسی حکومت کے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ملک میں ایک دفعہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہو جائیں تاکہ عملاً اقتدار اُن لوگوں کی طرف منتقل ہونے کا کم از کم آغاز ہو جائے جو حکومت کے نظام کو اسلامی اُصولوں پر چلانا جانتے بھی ہوں اور چاہتے بھی ہوں۔

س: اسلامی دستور کو بروئے کار لانے کے لیے جماعت اسلامی نے کیا اقدامات کیے ہیں؟

ج: اس سوال کا جواب اُوپر آچکا ہے۔ ہم نے اپنے لٹریچر کے ذریعے سے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت تفصیلی شکل میں کیا ہے اور وہ معاشرے کے تمام معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور دُوسرے بڑے بڑے مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے۔

س: پاکستانی عوام نے مسجدِ اقصیٰ کی آتش زنی پر بلاشبہ اپنے شدید غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فلسطینی مجاہدین کی امداد کے لیے آپ نے مثبت طور پر کیا اقدامات کیے ہیں؟

ج: اس وقت تو پاکستان کے لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ قرار دینے کی جو غلطی اب تک کی جاتی رہی ہے اس کی اصلاح ہو اور اس کو اسلامی مسئلہ قرار دے کر تمام دُنیا کی مسلمان حکومتیں اور سب سے بڑھ کر پاکستان کی حکومت فلسطین کی آزادی کے

لیے جہاد پر تیار ہو جائے ۔ اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو ان شاء اللہ پاکستان کے مسلمان جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے ۔

س : آپ نے برتھ کنٹرول کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے ۔ کیا آپ اسلامی نقطۂ نظر سے ابھی تک برتھ کنٹرول کی پالیسی کے مخالف ہیں؟ کیا آپ اپنی کتاب میں مزید دلائل کا اضافہ کر سکتے ہیں؟

ج : اس مسئلے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں جو میں اپنی کتاب میں بیان کر چکا ہوں ۔ ان میں کسی ترمیم کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی ہے ۔ اس مسئلے کے متعلق مزید مواد جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے ۔ ان شاء اللہ آئندہ ترتیب کے موقعے پر اس کا اضافہ کر دیا جائے گا ۔ کتاب کی اشاعت کے بعد سے بہت سے مزید دلائل و شواہد سامنے آئے ہیں ۔ جو اُس نقطۂ نظر کو زیادہ تقویت پہنچاتے ہیں جو میں نے اِس کتاب میں پیش کیا ہے ۔

س : کثرتِ کار اور مصروفیتوں کے باوجود آپ نہایت عمدہ اور مفید کتابیں تالیف کر رہے ہیں ۔ اسلامی مسائل و افکار کو ترقی دینے کے لیے یہ کتابیں بڑی مددگار ثابت ہو رہی ہیں ۔ کیا آپ ہمیں بتا سکتے کہ آپ کی تازہ ترین تالیف کون سی ہے اور ان دنوں کون سی کتاب زیرِ تصنیف ہے ؟

ج : آپ نے میری کتابوں کی جو افادیت بیان کی ہے اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس کے فضل سے میں اسلام کی کچھ خدمت انجام دینے کے قابل ہوا ۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے ۔ اُردو زبان میں میری آخری تصنیف " خلافت و ملوکیت " ہے ۔ اور آج کل میں اپنی تفسیر تفہیم القرآن کو مکمل کر رہا ہوں ۔ اِن دنوں ۲۸ ویں پارے کی

اسلامی معاشرے میں عورتوں کے حقوق

ستمبر ۱۹۷۰ء میں ہفت روزہ "اخبار خواتین" کراچی کو یہ انٹرویو دیا۔ یہی انٹرویو روزنامہ "کوہستان"، راولپنڈی میں مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء کو اور پھر ہفت روزہ "ایشیا" لاہور میں ۲۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کو شائع ہوا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کراچی کے ہفت روزہ "اخبار خواتین" کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"جماعت اسلامی کی حکومت میں خواتین کو وہی حقوق دیے جائیں گے۔ جو اسلام انھیں دینا چاہتا ہے۔ ہماری جماعت کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق دینے کی بجائے اسے مرد کے تابع بناکر رکھنا چاہتی ہے۔ حالاں کہ ہمارا مقصد یہ نہیں۔ ہم عورتوں کو وہی حیثیت دینے کے خواہش مند ہیں جو اسلام نے انھیں دی ہے۔ اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ انھوں نے (نعوذ باللہ) عورتوں کے ساتھ بے انصافی کی ہے، اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ انصاف مغرب نے کیا ہے تو اسے پہلے اپنے ایمان پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔"

مولانا مودودیؒ نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ:

"اہلِ مغرب نے عورت کو مَرد کی برابری کا جو مقام دیا ہے، عورت سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا، یہ مقام عورت کو مرد بنا کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مَرد وہ سارے کام نہیں کر سکتا جو عورت انجام دیتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مغرب کا مرد چاہتا ہے کہ عورت اپنے وہ فرائض بھی انجام دے، جو فطرت نے اس پر ڈالے ہیں اور جس کو مرد سرے سے انجام دے ہی نہیں سکتا اور عورت ان فرائض کو انجام دینے میں برابر کا حصہ لے۔ جو فطرت نے محض مَردوں کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ گویا مغرب کے مرد عورت پر ڈیڑھ گُنا زیادہ بار ڈال کر خود آدھا بار اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کا نام اُنھوں نے عورتوں کی مساوات رکھا ہے۔"

مولانا مودودیؒ نے کہا کہ:

"عورتوں نے دھوکا کھا کر مَردوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ تو کر دیا لیکن اب لیڈیز فرسٹ کا قصّہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ مَیں نے انگلستان میں دیکھا ہے کہ عورتیں کھڑی رہتی ہیں اور مرد رتّی برابر توجہ نہیں دیتے، جبکہ ہمارے یہاں ابھی تک مَردوں کے کردار میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ اگر کوئی عورت کھڑی ہو تو مرد اُٹھ جائے گا اور عورت کو اپنی جگہ دے دے گا۔ لیکن مغرب میں مرد کہتے ہیں کہ تم میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں۔ تمہیں ہمارے برابر حقوق حاصل ہیں۔ تمہیں پہلے بیٹھنے کا موقع مل جائے تو تم بیٹھ جاؤ، ہمیں موقع ملا تو ہم بیٹھ جائیں گے۔ اب وہاں عورتیں دھکّے کھاتی پھرتی ہیں اور انہیں کوئی پُوچھتا تک نہیں۔ مغربی ممالک میں آج بھی مَرد اور عورت ایک ہی قسم کے جو کام کرتے ہیں اُن کا معاوضہ دونوں کو برابر نہیں ملتا۔ اس پر عورتیں شور مچا رہی ہیں۔"

"آپ کے خیال میں اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کے فرائض کیا ہیں؟" کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے فرمایا:

"اسلام نے عورت کے سپرد وہی فرائض کیے ہیں جو فطرت نے عورت پر

عائد کیے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے عورت پر وہی ذمہ داریاں ڈالی جائیں جو فطرت نے اس پر ڈالی ہیں۔ اس کے بعد اسے مَردوں کے ساتھ بالکل مساوی حیثیت دی ہے۔ ان کے حقوق میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ ان کے لیے وہی عزّت رکھی ہے جو مَرد کو دی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمان عورتوں کو اللہ کا شکر اَدا کرنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئی ہیں جس سے بڑھ کر عورتوں کو عزت کسی دوسرے معاشرے میں نہیں ملتی۔

جائیے امریکہ میں جا کر دیکھیے، عورت کا کیا حال ہے۔ انگلستان میں جا کر دیکھیے عورتوں کا کیا حال ہے۔ وہ وہاں کیسی مُصیبت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ باپ کے اُوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بیٹے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بھائی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ خاندان اور رشتے دار اس کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتے۔ اِدھر وہ جوان ہوئی اُدھر اس کا باپ اس کو رخصت کر دیتا ہے کہ جاؤ خود کما کر کھاؤ۔ اب اس کے بعد اس سے بحث نہیں کہ کس طرح سے کما کر کھاتی ہے اور کس طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ مغرب کی عورت اس وقت اس قدر بے کسی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہی ہے کہ اس پر ترس کھانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

اِس سوال کے جواب میں کہ پردے کی پابندی میں رہ کر عورت جو ہماری آبادی کا نصف حصّہ ہے ملک کی ترقی میں معاون بننے کی بجائے اُلٹی رُکاوٹ کا باعث بنتی ہے، قائدِ تحریک نے کہا:

"میں پوچھتا ہوں کہ ملک کی ترقی میں آخر نئی نسلوں کو پرورش کرنا اور ان کو اچھی تربیت دینا بھی شامل ہے یا نہیں؟ وہ ملک کیسے ترقی کر سکتا ہے جس میں بچّوں کو اوّل روز سے ماں باپ کی محبّت نصیب نہ ہو اور پیدا ہوتے ہی وہ کرائے کے پالنے والوں کے حوالے کر دیے جائیں؟ باپ بھی نوکری پر گیا ہوا ہے اور ماں بھی

ملازمت کر رہی ہے اور بچّوں کو وہ ادارے سنبھال رہے ہیں جن کے ناز بردار بہرحال ماں باپ کی جگہ نہیں لے سکتے ۔ ان بچوں کو ابتدا ہی سے محبت کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اور جن بچوں کو بچپن میں ماں باپ کی محبّت نصیب نہیں ہوئی وہ حقیقت میں انسان بن کر نہیں اٹھتے ۔ اس سے ایک بے درد معاشرہ وجود میں آئے گا ۔ ہم ملک کو تباہی میں نہیں دھکیلنا چاہتے ۔ آج دنیا میں جو ظلم وستم اور درندگی ہو رہی ہے ، اور کم سِنی کے جرائم نے معاشرے کے لیے جو پریشان کن مسئلہ پیدا کر دیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ اب دنیا کی باگیں ان نسلوں کے ہاتھ میں آرہی ہیں جنھوں نے ماں باپ کی محبت نہیں دیکھی ۔ یہ بچّے بڑے ہوتے ہیں تو پھر ماں باپ کو بھی ان سے کوئی محبّت نہیں ہوتی ۔ لہٰذا جہاں خون کے رشتوں تک میں محبّت نہ ہو وہاں انسانی محبّت کا کیا سوال ؟ ایسے انسان تو پھر خود غرضی کے پُتلے اور آدمیت کے احساسات سے خالی ہوں گے ۔

آج کل ملک کی ترقی کا مفہوم صرف معاشی پیداوار کی ترقی سمجھ لیا گیا ہے ۔ اس کے لیے عورتوں اور مَردوں سب کو لاکر معاشی میدان میں کھڑا کر دیا ہے حالانکہ ترقی صرف معاشی پیداوار بڑھانے کا نام نہیں ہے ۔ اگر عورتیں گھروں میں بیٹھ کر نئی نسل کو تربیت دیں ، انھیں انسانی اقدار سے باخبر کریں ۔ ان کے اندر اعلیٰ اخلاق اور خُدا ترسی پیدا کرنے کی کوشش کریں تو یہ بھی ترقی میں ایک اہم ذریعہ ہے ۔ ملک کی ترقی کا صرف یہی ایک ذریعہ نہیں ہے کہ مرد بھی کارخانوں میں کام کریں ۔ ترقی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہے کہ گھروں میں بچّوں کو انسانیت کی تربیت دے کر تیار کیا جائے تاکہ وہ دنیا میں انسانیت کے رہ نما بنیں ، چرندے اور درندے بن کر نہ اُٹھیں ۔"

مولانا مودودیؒ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ :

"جماعتِ اسلامی اگر برسرِ اقتدار آگئی تو اِن شاء اللہ اس ملک کی تعلیم کا نظام بدلے گی۔ اس ملک کی اخلاقی تربیت کرے گی۔ اس ملک کے لوگوں کا مذاق اور پسند اور ناپسند کے معیار بدلنے کی کوشش کرے گی اور اس کے نتیجے میں اِن شاء اللہ پورا ماحول بدلے گا اور اسلامی تہذیب کو مغربی تہذیب پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔"

نظامِ تعلیم کا ذکر ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ :

" ہماری حکومت میں ملک سے مخلوط طریقۂ تعلیم بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے بارے میں اُنھوں نے کہا کہ آج کل جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ عورت اور مَرد دونوں کے لیے ایک ہی ہے، لیکن ہم نصابِ تعلیم میں تبدیلی کریں گے۔ خواتین کے لیے ہوم اکنامکس لازمی قرار دی جائے گی، لیکن ان کے لیے علیحدہ اسکول اور کالج قائم کیے جائیں گے۔ جہاں تک میڈیکل تعلیم کا تعلق ہے ہمارے ہاں اتنی لیڈی ڈاکٹرز موجود ہیں کہ جو لڑکیوں کے علیحدہ میڈیکل کالج میں طالبات کو پڑھا سکیں گی۔ اسلامی اور دینی تعلیم لازمی قرار دی جائے گی۔"

مولانا مودودیؒ نے عائلی قوانین کے بارے میں کہا کہ " وہ بالکل ختم کر دیے جائیں گے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ جو لوگ اسی ملک اور اسی معاشرے میں رہتے ہیں وہ مغربی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر خود اپنے ہی ملک اور اپنے ہی معاشرے سے اس قدر ناواقف ہیں۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے ہمارے ملک میں کتنے لوگ ہیں جنھوں نے چار چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ بلکہ دو بیویاں رکھنے والے بھی آخر کتنے ہیں۔ یہ خواہ مخواہ زبردستی کا پروپیگنڈا ہے جو ہمارے ہاں کثرتِ ازدواج کے بارے میں کیا گیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس میں پیش پیش زیادہ تر وہ خواتین ہیں جو خود اپنے شوہروں کی دوسری بیویاں ہیں۔ پہلی بیویوں کو انھوں نے گاؤں میں بٹھا رکھا ہے

خود صاحب کے ساتھ پھرتی ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ شریعت کے مطابق کام کریں۔ ہمارے دین نے واقعی چار شادیوں کی اجازت دی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ سب بیویوں کے ساتھ انصاف کرو۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔"

آخر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کہا کہ "ہم خواتین کو ان کے اسلامی حقوق بزورِ طاقت دلائیں گے۔"

دارالاسلام پٹھان کوٹ اور اللہ بخش کی شہادت

۱۹۷۱ء میں ہفت روزہ "چٹان" لاہور نے "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے اہم شخصیتوں کے انٹرویوز شائع کیے۔ یہ انٹرویو "چٹان" کے ایڈیٹر نے لیا اور ۸ رمارچ ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا نے اس وقت کے تاثرات بیان فرمائے ہیں جب تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں مولانا مودودیؒ اور ان کے رفقاء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ سے ہجرت کرنا پڑی۔ اور پھر اس حادثے کے بارے میں اپنے احساسات پیش فرمائے ہیں جو ۱۹۶۳ء میں ایوب خاں کی صدارت اور نواب امیر محمد خاں آف کالاباغ کی گورنری کے دور میں جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ لاہور میں سرکاری غنڈوں کے حملے سے رکن جماعت اللہ بخش شہید ہوگئے تھے اور جلسہ گاہ درہم برہم ہوگئی تھی۔

دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں ہم کل ۲۵ آدمی تھے۔ تب ہمارے سفر کا

آغاز تھا اور ہم نے دارالاسلام کو اپنا پہلا مستقر بنایا تھا۔ ہمارے چاروں طرف دُور دُور تک سکھوں اور ہندوؤں کے گاؤں تھے جن میں مسلمان مقابلۃً آٹے میں نمک کے برابر تھے اور جو مسلمان رَہ رہے تھے وہ ہر لحاظ سے کمزور تھے۔ اِلّاماشاء اللہ ان کا کوئی معاشی یا مجلسی مقام نہ تھا۔ کیڑے کہہ لیجیے۔

برعظیم کی تقسیم کے عبوری دنوں میں ملک کی جو صورتِ حالات تھی سب کو معلوم ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں فسادات یا اس کے اثرات موجود نہ ہوں۔ پٹھانکوٹ بھی متاثر تھا اور اس کی فضا میں بھی نیزے اور برچھیاں گھنگھور گھٹاؤں کی طرح تُلی کھڑی تھیں۔ ان برافروختہ حالات میں بھی ہم نے مئی ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ جس میں گرد و پیش کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو مدعو کیا۔ انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آزادی کی جو نعمت انھیں دی ہے وہ اس کا انعام ہے۔ صدیوں بعد ہندوستان کی سرزمین آزاد ہو رہی ہے اس میں فساد برپا کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کرۂ ارضی پر فساد کرنے والوں سے ناخوش ہو کر آزادی کی نعمت چھین لیتا اور زمین کی وُسعتیں فسادیوں کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ میری یہ تقریر "بناؤ اور بگاڑ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔

اس تقریر اور اجتماع کا نتیجہ یہ نکلا کہ فساد کچھ دنوں کے لیے ٹل گیا اور حالات کی جس برہمی کا اندیشہ تھا وہ رُک گئی۔

ہمارے آدمی اردگرد کے دیہات میں جاتے۔ وہاں لوگوں کو سمجھاتے اور جو مسلمان اقلیت میں ہونے کے باعث مال دار ہندوؤں کی اکثریت میں محصور تھے ان کے لیے مددگار ثابت ہوتے اس طرح دیر تک خون خرابہ ٹلا رہا۔ پھر ایک دن ملک کے ہمہ گیر فسادات نے اس علاقے کو بھی مشتعل و مجروح کیا۔ ریل بند، تاریں منقطع، ڈاک موقوف، آگ بھڑکی اور پھیل گئی۔ نتیجۃً وہ مسلمان جو اِن علاقوں

میں اونے پونے زندگی گزار رہے تھے ہمسایوں کی سنگ دلی سے خوف زدہ ہو گئے۔ آوازیں آنے لگیں، " دارالاسلام والو! ہمیں بچاؤ۔" اللہ تعالیٰ کا لُطف و کرم تھا کہ ہمارا آدمی جہاں جاتا وہاں سے آدمی نکال لاتا۔ اور وہ بہ حفاظت دارالاسلام پہنچ جاتے۔ اس طرح دو ڈھائی ہزار آدمی یک جا ہو گئے۔ ادھر ہم پچیس آدمی ان سب کے گارڈ تھے۔ اور وہ سب اس قدر بدحواس تھے کہ انھیں اپنے دست و بازو یا دل و دماغ پر کوئی اعتماد نہ تھا۔ وہ اس حالت میں تھے جیسے شل ہو گئے ہوں۔ ہم نے ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا لیکن ان کے حواس کی ویرانی کا حال یہ تھا کہ وہ کسی مزاحمت یا مدافعت کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ ادھر ہم نے ہر خطرے سے نمٹنے کا تہیّا کر رکھا تھا۔

جب حالات اور زیادہ بگڑے اور یہ بات کُھل گئی کہ گورداس پور کا ضلع ہندوستان میں جا رہا ہے تو ہم نے طے کر لیا کہ جان دے دیں گے لیکن اس طرح مرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے جس طرح عام لوگ مَر رہے ہیں کہ ہنتوں اور عاجزوں پر "سُورماؤں" اور "سادنتوں" کی ٹولیاں یلغار کرتیں اور انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں۔

ہمارے پاس کُل تین بندوقیں تھیں۔ جن میں سے ایک ناکارہ تھی۔ ہم نے خندقیں وغیرہ کھود کے مورچے بنا لیے۔ وہیں بھالے اور نیزے تیار کیے۔ اور اس طرح پچیس ۲۵ آدمی ہر مقابلے کی ٹھان کر تیار ہو گئے۔ خبر ملی کہ آج رات حملہ ہو گا۔ ہم نے مزاحمت کا پُورا سامان کر لیا۔

۲۵ کے اس قافلے میں بعض رفقاء کا پُورا خاندان ساتھ تھا۔ ہم نے تمام عورتوں کو ایک مکان میں اکٹھا کیا اور انھیں بتا دیا کہ ہماری لاشوں سے گزر کر ہی حملہ آور ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھیں مٹّی کا تیل اور بانسوں پر کپڑے

باندھ کر دے دیے کہ دشمن ان پر حملہ آور ہو تو وہ انھیں جلاکر پامردی سے ان کا مقابلہ کریں اور عفت و آبرو کے ساتھ شہید ہو جائیں۔ اس حالت میں دشمن انھیں صرف قتل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ رات بخیریت گزر گئی۔ اگلی صبح بستی کا تھانے دار آیا۔ وہ سکھ تھا۔ ہم نے دارالاسلام کے راستے پر جو ریل کے پل کو کراس کرتا تھا ایک پہرے دار لگا رکھا تھا۔ اس کو ہدایت تھی کہ کوئی غیر اندر نہ آئے۔ یہی ایک راستہ تھا۔ پہرے دار نے تھانے دار کو روک لیا کہ آپ اندر نہیں جا سکتے۔ اس نے کہا مولانا سے پوچھ لو۔ غرض میں نے اُسے بلوالیا۔ لیکن یہ تہیا کر لیا کہ اس نے ہیر پھیر کیا یا اسلحہ واپس لینا چاہا تو اس کو کھڑے کھڑے شوٹ کر دوں گا۔ میں اس وقت بندوق لے کر بیٹھا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خندقوں پر نگاہ کی۔ میری بندوق دیکھتا اور سوچتا رہا۔ نہ اسلحہ کی واپسی کا مطالبہ کیا نہ کچھ اور کہا۔ صرف اتنا کہا۔ "آپ نے مدافعت کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔"

"سو فیصد! ہم کسی پر حملہ کرنے کے نہیں۔ لیکن حملہ آوروں سے دبنے کے بھی نہیں۔ ہم مر جائیں گے بھی تو اس وقت جب دو دو ختم کریں گے۔"

وہ یہ سن کر لوٹ گیا۔ شاید اس جواب ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم پر حملہ سہل نہ رہا۔ بہرحال یہ دن ایسے تھے کہ لحظہ بہ لحظہ کشت و خون کی خبریں آرہی تھیں۔ باؤنڈری کمیشن نے ۱۸؍ اگست ۱۹۴۷ء کو گورداسپور بھارت کے حوالے کر دیا تو دارالاسلام بھی اسی میں چلا گیا۔ اب حالات اتنے خراب تھے کہ ہم دُور دراز تک "غنیم" کے نرغے میں تھے۔ ہر سمت ایک گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ بارہ دن تک یہی حالت رہی۔ ۳۰؍ اگست کو باؤنڈری فورس کا ایک کنوائے آیا تو اس نے ہمیں نکالنے اور لے جانے کا انتظام کیا۔ ہم نے سب سے پہلے عورتوں اور بچوں کو بھجوایا۔ اس کے بعد ۳۰؍ اگست کو ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور پاکستان پہنچے۔

اس زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ فرشتے ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔ کئی

دفعہ خیال آیا کہ درمیان میں کوئی پردہ ہے، ہٹے تو ان فرشتوں کو دیکھ لُوں، جو ہمیں کُشت وخون کے اس طوفان سے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

مولانا نے فرمایا:

ایک ایسا ہی موقع تھا جب صدر ایوب کے عہدِ اقتدار میں جماعت اسلامی کی کانفرنس کو تہس نہس کیا گیا اور ہمارا ایک رفیق اللہ بخش اُس گولی کا نشانہ بن کر شہید ہوگیا جس گولی کو میرے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کانفرنس میں جو سلوک کیا گیا سب کو معلوم ہے۔ اور کل کی بات ہے کہاں کہاں کے غُنڈے نہیں بھجوائے گئے۔ جماعت کے تقریباً دس ہزار ارکان متفقین، معاونین، ہم درد، ہم خیال اور ہم نوا موجود تھے۔ لگ بھگ چالیس ہزار کا مجمع بھی تھا، ایک ہزار خواتین تھیں۔ اللہ بخش کی بیوی اور بیٹی بھی ان خواتین میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب اللہ بخش کی شہادت کا اعلان کیا گیا تو ماں بیٹی نے اس صبر کے ساتھ سُنا کہ دوسری تمام خواتین جن میں بعض اشک بار ہوگئی تھیں، حیران رَہ گئیں۔ اللہ بخش کی بیوی نے نہایت خاموشی کے ساتھ سامان باندھا۔ بیوی اور بیٹی باپ کی لاش لے کر لائل پور چلی گئیں۔ قدرت نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ غنڈوں نے عورتوں پر بوتلیں برسائی تھیں۔ ہم نے اُف تک نہ کی۔ جواب دینا مشکل نہ تھا۔ غنڈے تھے کتنے؟ اعشاریہ ایک فی صد، انھیں ڈھیر بھی کیا جاسکتا تھا۔ سرحد سے کوئی سات آٹھ سَو کارکن آئے تھے۔ وہ اللہ بخش کی شہادت سے سخت برافروختہ ہوئے۔ ان سب کے پاس اسلحہ تھا۔ قاتل بھی ان کے سامنے تھے وہ خفا تھے کہ ان کے ایک بھائی کا اس طرح مارا جانا ان کی توہین ہے۔ . .
لیکن مَیں نے ان کو صبر و شکر اور تحمل و برداشت کی تلقین کی۔ حکومت کو یہ موقع ہی نہ دیا کہ اپنے عزائم میں کامیاب ہو۔ اخبار نویسوں نے پوچھا کہ آپ کچھ کہنا اور کرنا چاہتے ہیں؟ تو مَیں نے کہا:

"اللہ دیکھ رہا ہے اور ہم نے اسی کے ہاں استغاثہ دائر
کردیا ہے ۔ یہاں بھی اللہ کے فرشتوں نے ہمیں ان لوگوں سے
بچایا۔ جو خون خرابہ کرنے کا ٹھیکہ لے کر آئے تھے ۔"

اللہ بخش کا خون کیوں کر رائیگاں جاتا؟ وہ رنگ لایا اور دنیا جانتی ہے کہ نتیجہ کیا نکلا؟ سازش کے مصنّف اور مؤلّف کیوں کر مارے گئے؟ وہ اللہ بخش کے بعد کتنے دنوں جیے؟ پھر ان غنڈوں کا کیا حشر ہوا۔ جو ہمارے خلاف استعمال کیے گئے؟ جس طاقت نے انھیں استعمال کیا تھا اسی کے ہاتھوں مارے گئے۔ خُدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بقول ظفؔر علی خاںؒ ؎

نہ جا اس کے تحمّل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اُس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

———٭———

تفہیم القرآن کی تکمیل پر

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے علمی شاہ کار "تفہیم القرآن" کی تکمیل پر یوم تفہیم القرآن منایا گیا۔ اس سلسلے میں روزنامہ "جسارت" کراچی کے نمائندے جناب رفیق ڈوگر نے مولانا موصوف سے یہ انٹرویو لیا جو مذکورہ اخبار میں یکم جولائی ۱۹۷۲ء کو شائع ہوا۔

ہر روز اتنی زیادہ خبریں ہوتی ہیں کہ اخبارات کو ہمیشہ تنگیٔ داماں کا شکوہ رہا ہے۔ اس کے باوجود اخبار نویس چوبیس گھنٹے خبروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں کسی اچھی خبر کا بل جانا ان کے لیے ملاقات مسیحا و خضر سے کم نہیں ہوتا۔ تفہیم القرآن کے چند روز تک مکمل ہو جانے کی مختصر خبر اخباری زندگی کی وہ خبر ہے جس سے مجھے حقیقی معنوں میں خوشی محسوس ہوئی۔ اس خبر کے چند روز بعد ہی مولانا نے تفہیم القرآن مکمل کر لی۔ اور وہ منزل اختتام پذیر ہوئی جس کے لیے وہ تیس ۳۰ سال چار ماہ پہلے اپنی جوانی کے دَور میں روانہ ہوئے تھے۔ یہ مژدۂ جانفزا اس مہینے یا اس سال ہی کی نہیں اس صدی کی بہت بڑی خوش خبری تھی، جس کو سننے کے لیے لاکھوں افراد کئی سال سے منتظر تھے۔ جب سے مولانا کی طبیعت زیادہ ناساز رہنے لگی تھی، ہزاروں افراد خدا سے دعا کرتے تھے کہ وہ انھیں یہ عظیم کام مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تفہیم القرآن کے مکمل ہونے کے بعد ان کا اس کے متعلق اور زیادہ جاننے کا شوق

میرے پیشِ نظر تھا۔ میں خود تفہیم القرآن کے مصنف سے اپنے ذہن میں گردش کرنے والے بہت سے سوالوں کا جواب سُننا چاہتا تھا۔ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ جتنا چاند پر چہل قدمی کرنے والوں سے کبھی ملاقات ہوجائے تو مجھے جاننے کی خواہش ہوگی۔ کیوں کہ تفہیم القرآن اس عظیم انسان کے اسوۂ حسنہ کی تفسیر ہے جو چودہ سو سال پہلے ایک ہی رات میں زمین و آسمان کے درمیان اُلجھے ہوئے چاند سے بھی لاکھوں کروڑوں میل آگے ساتوں آسمانوں اور خالقِ کائنات کے گھر تک کی سیر کر آیا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ مولانا کی صحت بہت کمزور ہے۔ انھوں نے گزشتہ کئی ماہ سے کسی کو انٹرویو نہیں دیا۔ وہ اس کے قابل نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ایک دوپہر ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ مولانا تفہیم کے پروف پڑھ رہے تھے۔ قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مولانا نے چھ جلدوں میں پھیلی ہوئی اس بے مثال تفسیر کے نہ صرف مسودے اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے بلکہ پروف بھی خود پڑھے۔ اور غلطیاں لگنے کے بعد ان کی پڑتال بھی خود کی ہے۔ میں نے جماعتِ اسلامی پاکستان کے ناظمِ نشر و اشاعت صفدر چوہدری کی زبان سے اپنا مدّعا بیان کرایا۔ مولانا نے چند منٹ سوچا اور پھر اجازت عطا فرمادی اور کہا کہ سوالات لکھ کر صفدر صاحب کے حوالے کردوں۔ جب بھی تھوڑی فرصت ملی مولانا مجھے وقت عنایت فرمادیں گے۔ لیکن اسی دوران صفدر صاحب کے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے گاؤں چلے گئے۔ کئی روز بعد واپس آئے تو میں نے سوالات پر مشتمل ایک لمبی فہرست ان کے حوالے کردی۔ اس میں وہ سب کچھ درج تھا جو میں جاننا چاہتا تھا۔ صفدر صاحب نے فہرست کو دیکھا، سوالات کو پڑھا۔ مولانا کی صحت اور مصروفیات کا جائزہ لیا اور اپنے فرائض کا احساس کرتے ہوئے سوال نامہ لے کر رکھ لیا اور وقت کے متعلق

اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ کئی روز تک انتظار کرتا رہا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہو کر گھر جا چکے ہیں اور میرا سوال نامہ بھی ان کی بیماری کی نذر ہو گیا۔

چوبیس کی شام کو ٹیلی فون کیا تو مولانا نے ۲۵ ؍ جون کو عصر کی نماز کے بعد حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔

دُوسرے روز مَیں نے ایک اور سوال نامہ مرتب کیا اور معینہ وقت پر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے میز پر تفہیم القرآن کے پروف پڑے تھے۔ شاید غلطیوں کی پڑتال کر رہے تھے۔ عمر بھر کی جدوجہد، قید و بند، بڑھاپے کی بیماری اور مشرقی پاکستان کے ناقابلِ برداشت المیہ جس میں ان کے لاکھوں جاں نثار کارکن اپنی جان پر کھیل گئے۔ صبر و شکر کے مجسمے اور عظیم مجاہد پر اپنے اثرات دکھائے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ چائے کی پیالی اٹھاتے ہیں تو زیادہ عرصے سہار نہیں سکتے۔ ہاتھوں میں رعشہ آنے لگا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شاید ان کے مشن کی صداقت کا اثر ہے کہ انھیں اپنے ہاتھوں کی کمزوری کا کبھی احساس نہیں ہوا، اور انھوں نے کبھی کسی سے ہاتھ مضبوط کرنے کو نہیں کہا۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔

سوال نامے پر نظر ڈالی جو وقت کی کمی کے پیشِ نظر بہت مختصر کر دیا گیا تھا۔ کیوں کہ پَون گھنٹے بعد ڈاکٹر ان کا معائنہ کرنے آرہے تھے۔ اور جواب شروع کر دیا۔ درمیان میں ملاقاتی بھی آتے رہے جن سے حال احوال بھی پُوچھتے رہے اور بات چیت بھی کی، لیکن جہاں سے جواب چھوڑتے پھر وہیں سے شروع کر دیتے۔ جیسے ٹیپ ریکارڈ بند کر دینے سے دوبارہ شروع کرنے پر اسی جگہ سے شروع ہوتا ہے۔

پہلا سوال تھا کہ قرآن سے ربط اور لگاؤ پیدا کرنے میں کن عوامل کا دخل ہے اور اس لگاؤ کی نشوونما کیسے ہوئی؟

سوال مرتب کرتے وقت میرے پیشِ نظر یہ تھا کہ مولانا اِس ضمن میں اپنے آبائی علمی ورثے اور بزرگوں کی قرآنی خدمت کے حوالے سے جواب دیں گے۔ کیوں کہ بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں۔ لیکن انھوں نے ان میں سے کسی کا ذکر کیے بغیر فرمایا:

"میں نے جب ہوش سنبھالا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ مذہب تو کچھ نہیں کہ میں مسلمان کے گھر پیدا ہوا اس لیے مسلمان، ہندو، ہندو کے گھر میں پیدا ہوا اس لیے ہندو۔ اگر آدمی کسی چیز کو مانے تو تحقیق کر کے مانے نہیں تو نہ مانے۔ اس احساس کی بنا پر ایک وقت مُجھ پر ایسا گزرا کہ خُدا، آخرت، رسالت، وحی ہر چیز میں شک پڑ گیا اور جس کی بچپن میں عادت ڈالی گئی تھی وہ بھی اس وجہ سے چھوٹ گئی کہ وہ بھی محض ایک تقلیدی عمل معلوم ہوئی۔ اس کے بعد میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا۔ مختلف فلسفوں کا مطالعہ کیا اور قرآن مجید، سیرتِ پاک اور احادیث کا مطالعہ شروع کیا۔ اس مطالعے میں میرے پیشِ نظر بے لاگ تحقیق اور تنقید تھی اور آخر کار اسی مطالعے کی بدولت میں نے یہ تسلیم کیا کہ دینِ حق صرف اسلام ہے۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ محمدؐ اللہ کے رسُول اور آخرت یقینی ہے۔ اسی بناء پر ایک دفعہ ایک تقریر میں، جو شاید شائع بھی ہو چکی ہے، میں نے کہا تھا کہ دراصل میں ایک نو مسلم ہوں۔"

دُوسرا سوال تھا آپ نے تفہیم القرآن لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

مولانا نے فرمایا:

"۱۹۲۶ء میں جب میں نے "الجہاد فی الاسلام" لکھنی شروع کی تھی تو اس کے مطالعے کے دوران میں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام دراصل ایک تحریک ہے اور اس تحریک کا مقصد اللہ کے دین کو اللہ کی زمین پر عملاً قائم کرنا ہے اس وقت سے میں برسوں اس مسئلے پر غور کرتا رہا کہ اس تحریک کو کس طرح از سرِ نو تازہ کیا جائے کیوں کہ اس وقت تو مسلمان صرف ایک نسلی قومیت بن کر رہ گئے ہیں اور ان کے اندر یہ احساس

سرے سے موجود نہیں کہ ہم کسی تحریک کے کارکن ہیں۔ اسی غور و فکر کا ایک نتیجہ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا قیام تھا اور دُوسرا نتیجہ یہ تھا کہ مَیں نے یہ محسوس کیا کہ خواہ اپنی تحریر و تقریر سے کتنی ہی اسلام کی تشریح و تفصیل بیان کروں لیکن لوگ اس وقت تک اس دین کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے جب تک قرآن کے ذریعے سے اس کو لوگوں کے ذہن میں اُتارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسی احساس کی بنا پر جماعت اسلامی کے قیام کے چھ ماہ بعد فروری ۱۹۴۲ء میں مَیں نے تفہیم القرآن لکھنا شروع کی۔"

مَیں نے پوچھا: آپ نے تفہیم القرآن کی تصنیف کے دوران کن کن علمی ذخائر، مصنفّین اور علوم کا مطالعہ فرمایا؟

تو مولانا نے فرمایا:

"تفہیم میرے عمر بھر کے مطالعے کا نچوڑ ہے۔ میں نے پچھلے پچپن (۵۵) سال کے دوران فلسفہ، تاریخ، سائنس، اجتماعی علوم اور دینی علوم کا جتنا مطالعہ کیا ہے اس سب سے اس تفسیر کے لکھنے میں کام لیا گیا۔ اس کے علاوہ کسی خاص مقام پر پہنچ کر اگر میں کسی آیت یا قرآن کے کسی بیان کو سمجھ نہیں سکا ہوں تو لکھنے کا سلسلہ روک کر اُس وقت تک تحقیق و مطالعہ کرتا رہا جب تک اطمینان نہیں ہو گیا کہ میں نے قرآن کا صحیح مدّعا سمجھ لیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میرا فہم کسی معاملے میں ناقص ہو، کیوں کہ میں ایک انسان ہوں اور انسان کا فہم کامل نہیں ہو سکتا لیکن اس کتاب میں مَیں نے وہی کچھ لکھا ہے جس پر اپنی حد تک مطمئن ہوں۔"

تفہیم القرآن کی تکمیل کے دَوران ہی میں مولانا نے بہت سی تصانیف کیں لیکن ساتھ ساتھ تفہیم بھی باقاعدگی سے ترجمان القرآن میں شائع ہوتی رہی۔ ان گوناگوں مصروفیات کے پیشِ نظر میں نے چوتھا سوال یہ پُوچھا کہ اس کام کے لیے آپ کے

پیشِ نظر کوئی باقاعدہ پروگرام تھا؟ اور اس کے لیے تقسیمِ اوقات کی گئی تھی؟

فرمایا:

"کوئی باقاعدہ پروگرام اور تقسیم اوقات ممکن نہ تھی۔ اس کتاب کے آغاز ہی سے میری زندگی کے طوفانی دَور کا آغاز ہوا۔ ایک جماعت کو منظم کرنا، اسے تربیت دینا، اس کی تحریک کو چلانا اور تحریک کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنا بجائے خود ایک بہت بڑی محنت کا کام تھا اور ہمہ وقتی مصروفیت چاہتا تھا انہی حالات میں جس طرح سے بھی ممکن ہوا مَیں وقت بچاکر تفہیم القرآن لکھنے کا کام کرتا رہا۔ ابتداءً اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ کام اتنا وقت لے لے گا لیکن میری کوشش یہ رہی کہ کسی پہلو سے اس کتاب کو تشنہ نہ رہنے دیا جائے۔ اس لیے اسے مکمل کرنے میں تیس سال چار ماہ لگ گئے۔"

مَیں نے پانچویں سوال میں لکھا تھا۔ تفہیم القرآن مکمل کرنے کے دَوران اس کے مقدمہ میں درج قرآن فہمی کے اُصولوں کے علاوہ کوئی مزید اُصول آپ پر منکشف ہوئے ہیں؟

مولانا نے فرمایا:

"تفہیم القرآن کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے جو اُصول مَیں نے بیان کیے ہیں وہ صرف ایک عام ناظر کی ضروریات کو محسوس کر کے اس کے مطابق مختصراً لکھے ہوئے ہیں ورنہ اگر اُصولِ تفسیر پر بحث کی جاتی تو وہ خود ایک مستقل کتاب بن جاتی۔ تفسیر کے جن اُصولوں کی مَیں پیروی کرتا ہوں ان کو مَیں نے تفہیم میں مختلف آیات کی تفسیر کرتے ہوئے کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ درج کر دیا ہے۔"

نزولِ قرآن کے زمانے اور موجودہ زمانے کی مختلف ضروریات کے پیشِ نظر چھٹا سوال یہ تھا کہ قرآن میں اس زمانے اور سوسائٹی کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے

جس میں یہ نازل ہوا۔ موجودہ زمانے کی ضروریات قرآن سے کس طرح پوری ہوسکتی ہیں؟

مولانا نے فرمایا:

"جس چیز کی بنا پر قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننا پڑتا ہے وہ تو یہی ہے کہ ایک خاص ملک اور معاشرے میں اسلامی تحریک برپا کرنے کے لیے اس میں احکام اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں ایسی جامعیت ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں اور ہر زمانے میں وہ یکساں قابلِ عمل ہیں۔ اور اگر آدمی ان کو سمجھ لے تو ہر زمانے کے حالات پر ان کو منطبق کرسکتا ہے۔ یہ علم اور یہ بیان اللہ کے کلام کے سوا اور دُنیا کے کسی کلام میں ملنا ممکن نہیں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے مجھے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا قائل کیا ہے۔ مَیں نے بڑے بڑے مدعیانِ علم اور بڑی بڑی مشہور شخصیتوں کے کلام پڑھے ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو صدی دو صدی سے زیادہ گزار سکا ہو اپنے وقت کے بڑے عاقلانہ کلام سمجھے جاتے تھے، لیکن تھوڑا وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے اندر جہل اور نادانی کا کتنا دخل تھا اور علم کتنا پایا جاتا تھا۔ ازلی و ابدی کلام جو کسی زمانے میں بھی پُرانا نہ ہوسکے صرف خدا کا کلام ہے۔"

نئے دَور میں قرآن کی تعلیم کا وہ انداز مناسب نہیں ہوسکتا جو پُرانے زمانے میں رائج تھا۔ اسی لیے ساتواں سوال یہ رکھا گیا تھا کہ موجودہ دَور میں قرآن کی تعلیم کن اُصولوں پر ہونی چاہیے؟

اس سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

"موجودہ دَور میں صرف قرآن کی تعلیم نہیں بلکہ پُورے نظامِ تعلیم کو نئے سرے سے ڈھالنا ضروری ہے۔ قرآن کی تعلیم لازمی طور پر یہ چاہتی ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں عربی زبان کم ازکم لازمی زبان ضرور ہو۔ اور عربی وہ پڑھائی جائے جو قرآن کے

سمجھنے میں مددگار بنے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ تمام علوم وفنون جو تعلیم کے مختلف درجوں میں پڑھائے جائیں ان کو قرآن کے نقطۂ نظر کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اس طرح ہر علم قرآن کو سمجھنے میں اور قرآن ہر علم کو سمجھنے میں مددگار ہوگا اور طالب علموں کا ذہن خالص اسلامی ذہن بن سکے گا۔"

اس سوال کے جواب میں کہ کیا تفہیم الحدیث لکھنے کا بھی ارادہ ہے؟ مولانا نے فرمایا:

"سوال نمبر دو کے جواب میں جیسا کہ میں نے کہا ہے اسلام کو ایک تحریک کی حیثیت سے برپا کرنے کے لیے مَیں نے یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ لوگوں کو دین براہِ راست قرآن کے ذریعے سے سمجھایا جائے، اسی طرح یہ بھی احساس تھا کہ اس تحریک کو جس رہنما نے برپا کیا تھا اسؐ کی زندگی اور اسؐ کی سنت کو سمجھنا بھی اس مقصد کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی بنا پر میں ابتدا میں یہ چاہتا تھا کہ پہلے تفہیم القرآن اس کے بعد ایک کتاب سیرت پر اور اس کے بعد ایک کتاب سُنّتِ رسولؐ پر لکھوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب میری صحت جواب دے گئی ہے اور میرے بس میں یہ نہیں ہے کہ مَیں بقیہ دو کتابیں مرتب کرسکوں۔ تاہم تفہیم القرآن میں ایک بڑی حد تک مَیں نے سیرتِ پاک اور سنّت رسولؐ کے متعلق ضروری مواد جمع کر دیا ہے۔"

وقت کی کمی کے پیشِ نظر آخری سوال تھا کہ آپ قرآن کی کون کون سی سورتیں اکثر پڑھتے ہیں؟

مولانا نے فرمایا:

"میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہدایت کے مطابق سُورۂ کافرون، سُورۂ اخلاص، سُورۂ فلق اور سُورۂ ناس پابندی کے ساتھ پڑھا کرتا ہوں۔ باقی قرآن مجید کی کسی خاص سُورہ کو دُوسری سُورتوں پر ترجیح دینا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے کیوں کہ یہاں ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

کا معاملہ ہے۔"

نماز مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ مَیں مولانا کے کمرے سے باہر آیا تو وہ بہت کچھ باقی تھا جو مَیں جاننا چاہتا تھا۔ بعض ساتھیوں نے دوسرے روز ایک زبردستی کی نشست کا مشورہ دیا مگر میرے لیے ایسا ممکن نہیں تھا۔

———— ٭ ————

۳۱ سال کی چند اہم یادیں

یہ انٹرویو روزنامہ "وفاق" لاہور کے مدیر نے قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب سے لیا۔ یہی انٹرویو بعد میں ہفت روزہ "ایشیا" لاہور کی ۱۲ نومبر ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شامل تھا۔

"میں نے تو آپ کو صرف ملاقات کا وقت دیا تھا آپ نے اپنے اخبار میں انٹرویو کا اعلان کر دیا ہے۔ اور اب اس کے لیے آپ لوگ تیار ہو کر آدھمکے ہیں۔" یہ الفاظ ابھی مولانا کی زبان سے نکل ہی رہے تھے کہ ہم نے صفائی پیش کیے بغیر اپنے ترکش کا پہلا تیر چھوڑ دیا۔ اور مولانا سے عرض کیا:

"مولانا آپ کا جماعت اسلامی کی امارت سے سبک دوشی کا فیصلہ تحریکِ اسلامی کی تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہ ہو کہ جماعت سے وابستہ اور تحریک سے متاثر اور آپ کی فکر سے دل چسپی رکھنے والے لاکھوں کروڑوں افراد جو اندرون ملک اور بیرون ملک موجود ہیں اس مرحلے پر بہت سے سوالوں کا جواب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ جو چھوٹے بڑے سوالات اس واقعے کے بعد ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے، آپ سے ان پر گفتگو کی جا سکے اور آپ کے جوابات شائع کیے جا سکیں۔ تو اس ضمن میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا آپ

مجلسِ شوریٰ اور مجلسِ عاملہ کی رُکنیت سے بھی دست بردار تو نہیں ہو جائیں گے؟"
مولانا مودودی: بہتر تو یہی ہے۔ اب مَیں مجلسِ عاملہ اور مجلسِ شوریٰ کے اجلاسوں میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہا۔ میرے اوپر جو ہارٹ اٹیک ہوا تھا وہ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں شرکت کے سبب ہی ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا اگر آپ خودکشی کرنا نہیں چاہتے تو یہ کام چھوڑ دیجیے۔ دو سال ہو گئے، جب پچھلے سال جنوری میں جوڑوں کا درد شروع ہوا اس کے بعد اب تک میں غالباً دو مرتبہ مجلسِ عاملہ اور ایک مرتبہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہوا ہوں۔ ہمیشہ آدمی کو وہ ذمّے داری لینی چاہیے جسے وہ کما حقہٗ پُورا کر سکے۔ جسے کما حقہٗ پورا نہیں کر سکتا، محض لوگوں کی دل جوئی کے لیے یا اپنی انانیت کی خاطر نہ لے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بالکل اس قابل نہیں رہا ہوں۔ ان لوگوں سے پُوچھیے، جب چودھری رحمت الٰہی یا میاں صاحب کسی معاملے میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ جہاں ذرا سوچنے کی ضرورت پڑی میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔ آخر مَیں نے کہا مجھے اپنی قوتِ فیصلہ پر بھروسا نہیں رہا۔ میں زیادہ سوچ نہیں سکتا اور میری قوتِ فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ آپ اپنا کام سنبھالیے۔ پھر میں نے اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اس کے بعد دل کا دَورہ پڑا۔ وقتاً فوقتاً دل میں بے چینی رہنے لگی۔ ڈاکٹر عالم گیر کو بُلا کر دکھایا۔ اُنھوں نے کہا آپ کوئی ایسا کام نہ کیجیے جس سے سانس چڑھے اور دل کی حرکت تیز ہو۔ تاہم میرا مرنا جینا اِسی کام کے لیے ہے۔"

سوال: مولانا! کیا علالت کے علاوہ کسی اور سبب یا کسی مصلحت کو بھی امارت سے سبک دوشی کے فیصلے میں دخل ہے؟

مولانا مودودی: کوئی مصلحت نہیں، کچھ نہیں۔ جس کام میں آدمی نے اپنی عُمر کھپا دی ہو

اسے کسی مصلحت کے لیے کیوں کر چھوڑا جا سکتا ہے؟ رفقاء برابر اصرار کر رہے تھے کہ مَیں یہ ذمہ داری سنبھالے رکھوں۔ میں نے کہا ایک شکل تو یہ ہو سکتی ہے کہ اچانک آپ کو اس صورت سے سابقہ پیش آئے کہ نئے امیر کا انتخاب کرنا پڑے۔ ہارٹ اٹیک کا تو کچھ پتا نہیں کہ کب ...... بہتر ہے کہ جب تک مَیں موجود ہوں آپ انتخاب کر لیجیے۔ کم سے کم میرا جو تھوڑا بہت تجربہ ہے اس کے مطابق میں رائے دیتا رہوں گا۔ اگر کسی پیچیدگی کو حل کرنے میں مدد کی ضرورت ہوگی تو مَیں حاضر ہوں۔ میرے سامنے یہ کام ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ مصلحت کیا ہوگی۔ یہ صرف ایک جماعت کا نہیں تحریک چلانے کا معاملہ ہے اور جتنی کچھ ہمت مُجھ میں تھی میں نے کام کیا۔ اب باہر سے دعوت نامے آتے ہیں۔ پچھلے دنوں لیبیا سے پیغام آیا۔ کچھ دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی، مگر میں نے انکار کر دیا۔ مَیں نہیں جا سکتا ــــ یہ تحریک صرف پاکستان میں نہیں ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ۱۹۶۹ء سے میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاسوں میں بھی شریک نہ ہو سکا۔

سوال: مولانا! آپ اپنے اس مرحلے پر اپنی ۳۱ سالہ جدوجہد سے مطمئن ہیں؟

مولانا مودودی: بات یہ ہے کہ جو آدمی اس کام کو سمجھتا ہو وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کسی بڑی سے بڑی کامیابی پر بھی۔ اللہ تعالیٰ ہی قبول کرنے والا اور فیصلہ کرنے والا ہے۔ مَیں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میری کوششوں کو قبول فرمائے۔ جو آدمی اس کام سے مطمئن ہو جائے وہ اس تحریک کا آدمی نہیں ہے۔

سوال: مولانا! اس عرصے میں آپ نے بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ آپ کے نزدیک ان میں سے اہم ترین کامیابی کون سی ہے؟

مولانا مودودی: مَیں اپنی کسی Achievement کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اور یہ دنیا کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے۔ اور اصل کامیابی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

سوال: اپنی تصنیفات میں سے تفہیمُ القرآن کے بعد آپ کو کون سی تصنیف سب سے زیادہ پسند ہے؟

مولانا مودودی: یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ پُوچھے کہ تمہیں اپنے بچوں میں سے کون سا بچّہ زیادہ پسند ہے۔ مَیں نے ہر کتاب کو اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے۔ اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ البتہ تفہیم القرآن کے بارے میں مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے قبول کرلے تو یہ میری مغفرت کا ذریعہ اور میری آخرت کا سرمایہ ہوگی۔

چند تلخ یادیں

سوال: ۳۱ سالہ جدّوجہد میں قومی، سیاسی، ملکی یا بین الاقوامی سطح کا کوئی تلخ ترین واقعہ؟

مولانا مودودی: بات یہ ہے کہ یہ دوَر شروع ہوئے تقریباً ۱۹۳۷ء سے ۳۵ سال گزر گئے۔ یہ سارا زمانہ تلخیوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سی تلخی شدید ہے۔ یہ سارا زمانہ! ایک سے ایک بُرا وقت آتا چلا گیا۔ جہاں تک رنجیدہ ہونے کا تعلق ہے، جو شخص احساس رکھتا ہو اگر وہ اپنی قوم کو تباہی کی طرف جاتے دیکھے تو اس کا غم گین ہونا فطری بات ہے۔ حالات تو ایسے تھے جن میں آدمی کو غم گین ہونا ہی چاہیے، مگر یہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے مایُوسی کبھی نہیں ہوئی، اب بھی نہیں ہے۔

سوال : مَیں نے دو تین مواقع پر آپ کو دل گرفتہ اور غم زدہ محسوس کیا ۔ مثلاً جب ٹکسالی گیٹ میں جماعت کے سالانہ جلسے پر غنڈوں نے حملہ کیا ۔ اس وقت جب ڈھاکہ میں آپ کے جلسۂ عام کو تاراج کیا گیا ۔ پھر انتخابات کے نتائج سامنے آنے پر ۔ مگر مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ نے اس کے باوجود تفہیم القرآن لکھنے کا کام جاری رکھا ہے ؟

مولانا مودودی : جی ہاں ! مَیں نے ان حالات میں بھی تفہیم القرآن لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا ۔ کسی چیز سے تاثر لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے خیالات کی concentration اور فکر کی صلاحیت متاثر ہو ۔ ڈھاکہ میں جو حادثہ ہوا اس وقت مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مشرقی پاکستان اب نہیں بچتا ، اس لیے نہیں کہ ہمارے جلسے پر حملہ ہوا بلکہ اس لیے کہ حملہ آوروں کی پشت پر انتظامیہ کا ہاتھ تھا ۔ جہاں علاحدگی پسندی ایک تحریک کی صورت میں موجود ہو اور اسے انتظامیہ کی پشت پناہی بھی میسّر ہو تو نتیجہ ظاہر ہے جب کہ اُوپر کی اتھارٹیز بے بس ہوں یا ملوّث ۔ میں سمجھ گیا کہ اب مشرقی پاکستان کا بچنا مشکل ہے ۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ، کروڑ مسلمان تباہی کی طرف جا رہے ہوں تو میں خوش دل نہیں ہو سکتا تھا ۔

سوال : اور ۱۹۶۳ء میں ؟

مولانا مودودی : جی ! اس کانفرنس میں غنڈے بھیجے گئے ۔ مجھے تمام باتوں کا علم ہوگیا تھا کہ غنڈوں کو کس نے بھیجا اور ساری منصوبہ بندی کہاں ہوئی ، سب انتظام کرلیا گیا تھا کہ اِدھر جماعت کی طرف سے ذرا سی مزاحمت ہو اور اُدھر اسے خلافِ قانون قرار دے کر اس پر حملہ کردیا جائے ۔ جن صاحب نے یہ انتظام کیا انھوں نے یہ کہہ کر سارا بندوبست کیا تھا کہ ہم ان کا وہ حشر کریں گے جو مصر

میں اخوان المسلمین کا ہوا۔ مَیں ہر وقت محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے اور تباہی کے درمیان ایک لمحے کا فاصلہ ہے۔ آٹھ ہزار افراد جمع تھے۔ ایک ہزار عورتیں بھی تھیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر تحریک کے ایک آدمی نے اپنا صبر Loose کر دیا تو یہ تنظیم کا خاتمہ ہوگا۔ لاؤڈ سپیکر کا انتظام بھی نہیں تھا کہ میں کنٹرول کرسکوں۔ یہ محض اللہ کا فضل و کرم تھا یا جماعت کی تربیت، ورنہ ہم تباہی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پھر اس بے چارے کارکن کو شہید کیا گیا۔ اس کی شہادت کی خبر عورتوں کے کیمپ میں پہنچی، جہاں ایک ہزار عورتیں موجود تھیں۔ مرحوم کی بیوی اور بیٹی بھی ان میں شامل تھیں۔ مگر اللہ کی بندی ــ بیٹی اور ماں دونوں میں سے کسی نے ایک سسکی تک نہیں لی۔ اگر وہ رو پڑتیں تو ایک ہزار عورتوں کا سارا مجمع رو پڑتا۔ عورتیں ایسے موقع پر صبر نہیں کرسکتیں۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا، اس ظلم اور صبر پر اللہ ضرور بدلہ لے گا، اور اس نے لیا۔ جس ملک کی حکومت شریفوں پر غنڈے چڑھا کر لائے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اب بھی وہی غنڈہ گردی ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔ ڈیرہ غازی خاں میں کیا ہوا۔ اگر ایسے ہی انتخابات کرانا ہیں تو بہتر ہے کہ انتخابات کا قصہ ہی ختم کر دیا جائے۔ جب انتخابات کی نوبت آئے، ایک فہرست شائع کر دی جائے کہ ان لوگوں کو نامزد کیا گیا ہے۔

سوال: مولانا! اور اخوان کا سانحہ؟

مولانا مودودی: ہاں! مَیں اس وقت میانوالی جیل تھا، جب عبدالقادر عودہ مرحوم کو پھانسی دی گئی ــ بڑا ہی شدید صدمہ تھا۔

سوال: ماچھی گوٹھ میں ۱۹۵۶ء کے اجتماع میں بھی مَیں نے آپ کو غم زدہ محسوس کیا؟

مولانا مودودی: جی ہاں! مجھے اس بات کا رنج تھا کہ جن لوگوں سے یہ توقع تھی کہ وہ اس کام کو لے کر آگے بڑھیں گے وہ ایسی باتوں پر اڑے رہے اور ایسی باتوں پر اعتراض کرتے رہے جن کا مَیں نے معقول طریقے سے جواب دے دیا تھا۔ اگر وہ آج موجود ہوتے تو جماعت کی بڑی تقویت کا سبب بن سکتے تھے۔ الگ ہونے کے بعد انھوں نے کیا خدمت انجام دی؟ مَیں نے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ بنی بنائی عمارت کو توڑنا ایسا مشکل نہیں بنانا بہت مشکل ہے۔ مجھے اس بات کا بہت رنج تھا، لیکن آپ دیکھیے مَیں نے اس رنج کے باوجود ان حضرات کے خلاف کبھی کچھ کہا نہ لکھا، باوجود ان چوٹوں کے جو مسلسل مجھ پر کی جارہی تھیں۔

سوال: مولانا! ایک نجی گفتگو میں آپ نے کہا تھا۔ مَیں نے سب کی طرف سے اپنا دِل صاف کرلیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ بات ریکارڈ پر آجائے؟

مولانا مودودی: جی ہاں! میں نے سب کی طرف سے اپنا دل صاف کرلیا ہے، مَیں نے تو ہر دشمن کو معاف کردیا ہے۔ مَیں تو خدا سے بخشش چاہتا ہوں۔ مَیں نے کہیں لکھا بھی ہے کہ میرا دل سب کے لیے صاف ہے۔

خوش گوار یاد

سوال: یہ تو تلخ یادیں تھیں، ان ۳۱ سالوں کی کوئی سب سے خُوش گوار یاد؟

مولانا مودودی: خوش گوار ترین یاد ۱۹۶۳ء کی ہے جب مَیں نے دیکھا کہ جماعت نے اس طرح ڈسپلن کا ثبوت دیا ہے اور اس طرح بچ کر نکل گئی ہے۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ مجھے کتنی فرحت محسُوس ہوئی۔ مَیں پریشان تھا کہ اگر ایک بھی آدمی مشتعل ہوگیا تو نامعلوم کیا نتیجہ ہوگا۔ اس ہنگامے کے بعد آٹھ نو سو پٹھان

جو بندوقوں اور پستولوں سے مسلح تھے میرے پاس آئے انھوں نے کہا کہ ہم اپنی قوم کو کیا جواب دیں گے کہ تمہارا بھائی مارا گیا اور تم خاموشی سے واپس آگئے۔ یہ سب سراسر اللہ کا فضل تھا۔ یہ کالا باغ کے مُنہ پر ایک تھپّڑ تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جو آدمی اسے رپورٹ دینے کے لیے گیا اس نے سب سے پہلا سوال میرے بارے میں پُوچھا کہ اس نے کیا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں تخت کے نیچے چھپ گیا ہوں گا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں اسٹیج پر کھڑا رہا تو خُدا جانے کیا سوچتا ہوگا۔

مَیں اپنے مقصدِ زندگی سے ریٹائر نہیں ہوا

سوال: مولانا! جب ضرورت ہوگی، آپ جماعت کی قیادت کو مشورہ تو دیتے رہیں گے؟

مولانا مودودی: جی ہاں! ہارٹ اٹیک کی حالت میں بھی جب مَیں یہاں پڑا ہُوا تھا یہ لوگ مسائل لے کر آتے تھے۔ جس وقت مَیں لندن کلینک میں آپریشن کے بعد لیٹا ہوا تھا اس وقت لوگ طرح طرح کے مسائل Discuss کرنے کے لیے چلے آتے تھے۔ اس حالت میں میرے لیے بات کرنا بھی مشکل تھا اس بے دردی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ میری عادت نہیں کہ میں کسی کو ملنے سے انکار کردوں۔

سوال: مولانا! جماعت کی امارت سے علاحدگی کے ساتھ آپ سیاست سے تو کنارہ کش نہیں ہو رہے؟

مولانا مودودی: مَیں زندگی سے ریٹائر نہیں ہوا۔ مَیں اپنے مقصدِ زندگی سے ریٹائر نہیں ہوا۔ لیکن میں اس بات کو گناہ سمجھتا ہوں کہ آدمی وہ ذمہ داری اُٹھائے جسے وہ کما حقہٗ نبھا نہ سکتا ہو۔

سوال: کوئی اور واقعہ جو عام لوگوں کی دل چسپی کا موجب ہو، مثلاً شاہی قلعے میں آپ کے پُرانے پھوڑے کا علاج؟

مولانا مودودی: دو دل چسپ تجربے مجھے اپنی جیل کی زندگی میں ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے لائل پور کی ایک جیل میں نظر بند کیا گیا ایک روز اچانک پتھری پیشاب کی جگہ پر آکر رُک گئی اور ۱۶، ۱۸ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ مَیں نے اللہ سے دُعا کی کہ میں ان ظالموں سے علاج کی درخواست کرنا نہیں چاہتا، تُو اسے نکال دے یا ہٹا دے۔ وہ ہٹ گئی۔ یہی وہ پتھری ہے جو بیس سال بعد برآمد ہوئی۔ ۲۰ سال تک اس نے مجھے تنگ نہیں کیا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ تم اتنی بڑی پتھری مثانے میں لے کر کیسے چلتے پھرتے رہے ۲۰ سال تک۔ اِس طرح جن دنوں میری پنڈلیوں پر زخم آئے اور یہ زخم اگزیما کی صورت اختیار کر گئے۔ سب علاج کرالیے۔ ڈاکٹری، طبِ یونانی، جونکیں بھی لگوائیں جب مَیں گرفتار ہوا تو پاجامے کے پائنچے زخموں سے اُوپر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے لاہور کے قلعے میں رکھا گیا۔ مَیں نے اللہ سے دعا کی کہ مَیں ان ظالموں سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا تُو خود ہی اس کا علاج کر دے۔ چنانچہ یہ زخم رفتہ رفتہ سُوکھتے چلے گئے اور ان کا نشان تک ختم ہو گیا۔ کوئی خاص وقت ہوتا ہے جب دُعا اللہ کے ہاں تیر کی طرح پہنچتی ہے۔

یہ کام میری ذات پر موقوف نہیں ہے

سوال: کیا آپ مطمئن ہیں کہ آپ کی سبکدوشی کے بعد آپ کے جانشین جماعت کو اسی راستے پر گام زن رکھ سکیں گے جس پر آپ نے اب تک چلایا

مولانا مودودی: جماعت ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی جماعت کا نظام الگ ہوگیا۔ وہاں کے الگ امیر منتخب کیے گئے اور انھوں نے وہاں کے معاملات کو خود سنبھالا۔ اب بھی وہاں کی جماعت کسی طرح یہاں سے کم نہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں صرف چار آدمی تھے، جب ہندوستان تقسیم ہوا۔ اب وہاں کی جماعت سب سے زیادہ بااثر ہے۔ یہ کام میری ذات پر موقوف نہیں۔ جماعت کے لوگ جس کو بھی منتخب کریں گے ان شاء اللہ وہ انھیں ساتھ لے کر چلے گا۔ بلکہ شاید کچھ کمزوری اس لیے بھی ہو کہ میری موجودگی میں وہ بہرحال میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہندوستان میں چوں کہ اس کا سوال ہی نہیں۔ اس لیے وہ لوگ پورے اعتماد سے کام کر رہے ہیں۔ اب وہاں نئے امیر کا انتخاب ہوا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

سوال: مولانا! اہم قومی اور ملکی مسائل پر آپ اخباری بیانات کی صورت میں قوم کی رہنمائی تو کرتے رہیں گے نا؟

مولانا مودودی: کبھی کبھی، بہت ہی خاص مواقع پر۔ جب کوئی بیان جاری کیا جائے تو لوگ یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ بیان دینے والا میدان میں نکل کر کام کرے — اور میں اب پس منظر میں چلا جانا چاہتا ہوں۔

سوال: سبک دوشی کے اس لمحے آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟

مولانا مودودی: اب تو جو بوجھ اُترے گا وہ Formally ہوگا۔ جب میں نے قائم مقام امیر کو نامزد کیا تو میں اطمینان سے لیٹ گیا تھا کہ اب میں اپنا سکون بڑھا سکوں گا، ورنہ اس حالت میں کام کرتے ہوئے تو میرے دماغ پر چوٹیں لگتی تھیں۔

سوال : مولانا ! وفاق کے ذریعے کوئی پیغام ؟

مولانا مودودی : میں ساری عمر پیغام دیتا رہا ہوں اور پھر ایک پیغام کا تقاضا ہے۔ میرا پیغام یہی ہے کہ " ملک پر بہت بُرا وقت آیا ہوا ہے۔ اگر اب بھی لوگوں نے خدا کی طرف رجوع نہ کیا اور اپنے اعمال و اخلاق دُرست نہ کیے تو اس ملک کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۰۳ — ۱۹۷۹ء) بیسویں صدی عیسوی کے معروف اسلامی قائد، رفیع الشان مفکر اور بلند پایہ مصنف تھے — انھوں نے تمام بندگانِ خدا تک اسلام کا سیدھا اور سچا پیغام پہنچانے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی اور اپنے اس نصب العین کو منظم انداز میں انجام دینے کے لیے ایک تحریک — جماعت اسلامی — کی بنا ڈالی جو ۱۹۴۱ء سے پوری یکسوئی اور دردمندی کے ساتھ اقامتِ دین کی راہ پر گامزن ہے۔ غلبۂ اسلام کی سعی و کوشش میں ان پر طرح طرح کے مصائب آئے، کئی بار جیل جانا پڑا، ۱۹۵۳ء میں "ختمِ نبوت" کے تعلق سے ایک کتابچہ لکھنے کی پاداش میں ان کے لیے پھانسی کی سزا بھی تجویز ہوئی — لیکن کبھی بھی ان کے پائے استقامت میں تزلزل نہیں پیدا ہوا، پھانسی کی سزا بعد میں عمر قید میں تبدیل کردی گئی۔ مولاناؒ نے تحریک اقامتِ دین کی دعوت کو عام کرنے کے لیے سَو سے زائد کتابیں لکھیں، جن میں تفہیم القرآن (جلد اوّل تا جلد ششم)، خطبات، الجہاد فی الاسلام، رسالۂ دینیات، تفہیمات (۵ جلدوں میں)، تنقیحات، سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم (دو جلدوں میں)، رسائل و مسائل (۵ جلدوں میں)، خلافت و ملوکیت، شہادتِ حق، دینِ حق، سلامتی کا راستہ، اسلام کا نظامِ حیات، پردہ، حقوق الزوجین وغیرہ اہم تصنیفات سمجھی جاتی ہیں۔ اور کم و بیش چالیس زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔

اسلام کو دل نشین، مدلّل اور جامع انداز میں پیش کرنے کا جو ملکہ اور خداداد [illegible] مولانا مودودیؒ صاحب کو حاصل تھی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ کتنے ہی بگڑے ہوئے [illegible] بوڑھے، جوان، بچے، مرد و عورت، سب ہی ان تحریروں سے متاثر ہو کر اپنے سینوں [illegible] سے منور کر چکے ہیں۔ اور کتنے ہی دہریت و الحاد کے علمبردار اسلام کے نقیب بنے ہیں [illegible]

ISBN 81-7292-092-0